Shivaji University, Kolhapur

.

رموزِادب

RUMOOZ-E-ADAB

اُردو(اختیاری)

URDU (OPTIONAL)

بی۔اے۔سال اوّل

B.A.FIRST YEAR

میقات اول

SEMESTER FIRST

Edited By

Dr. Sabiha Sameeroddin Sayyad

(H.o.D Urdu Night College, Ichalkaranji)

مرتب

ڈاکٹر صبیحہ سمیرالدین سیّد

(صدر شعبۂ اردو نائٹ کالج، اچل کرنجی)

w.e.f. 2018-2019

مقاصدِ نصاب

۱) B.A. اردو زبان کے ذریعے کسی بھی فیلڈ میں Translation کر کے Job حاصل کرنا۔

۲) ایک کامیاب ترجمہ نگار تیار کرنا۔

۳) مثالی اور کامیاب ترجمہ نگاروں کا علم حاصل کرنا۔

۴) ہندوستانی اور بین الاقوامی ادب کا مطالعہ اور ترجمہ کرنا۔

۵) نظم نگاری۔ مرثیہ ، مثنوی ، غزل وغیرہ کے اصناف کا مطالعہ کر کے شاعری کو سمجھنا۔

۶) نظم نگاری کا تعارف کرانا اور نظم کی مختلف اقسام سے واقفیت حاصل کرانا۔

۷) اخبار ، ٹی۔وی۔ ریڈیو ،انٹرنیٹ کے ذریعے عوام تک اردو زبان کو فروغ دینا اور زرائے معاش کے مواقع فراہم کرانا۔

۸) عملی زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرانا۔

۹) ڈرامہ، ناول، افسانہ، داستان کے ذریعے طلبہ میں Acting، انسانی زندگی کے حقیقی کردار کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرانا۔

۱۰) طویل نظم کے ذریعے سے دنیا میں جنگ اور امن وامان کے مسائل کو جاننا۔

وائس چانسلر

شیواجی یونیورسٹی، کولہاپور

KOLHAPUR\Shivaji_Univesity_Logo g.jpg not found.

فہرست

اکائی		صفحہ نمبر
اکائی۔۱	افسانہ ''کفن'' (منشی پریم چند)	05
اکائی۔۲	افسانہ ''آخری کوشش'' (حیات اللہ انصاری)	17
اکائی۔۳	آنندی (غلام عباس)	49
اکائی۔۴	افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' (سعادت حسن منٹو)	79
اکائی۔۵	افسانہ ''نظارہ درمیاں ہے'' (قرۃ العین حیدر)	92
اکائی۔۶	افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' (عصمت چغتائی)	111
اکائی۔۷	افسانہ ''اپنے دُکھ مجھے دے دو'' (راجندر سنگھ بیدی)	135
اکائی۔۸	افسانہ ''کالو بھنگی'' (کرشن چندر)	169

اکائی 1۔افسانہ ''کفن''

منشی پریم چند

اکائی کے اجزاء:

1.1 مقاصد

1.2 تمہید

1.3 مصنف کا تعارف

1.4 افسانہ ''کفن''

1.5 خلاصہ

1.6 فرہنگ

1.7 مشقی سوالات

1.8 مزید مطالعہ کے لیے کتب

1.1 مقصد

اردو کے افسانہ نگاروں کا تعارف کرانا ہے۔اس اکائی کی تکمیل کے بعد آپ کو درج ذیل نکات سے واقفیت حاصل ہو جائے گی۔

☆ پریم چند کون تھا اور ان کے علاوہ دیگر افسانہ نگاروں اور اردو افسانے کی تاریخ میں ان کے مقام و مرتبہ کیا ہے۔

☆ افسانہ کفن میں کس واقعے کو پیش کیا گیا ہے۔

☆ سماج میں طبقاتی نظام کی خرابیاں کس طرح انسانوں کو بے بس لاچار، بے حس اور سفاک بنا دیتی ہیں۔

1.2 تمہید

آیئے اب ہم پریم چند کے افسانے اور دیگر افسانے اور دیگر افسانوں کا مطالعہ کریں گے۔ جسے اردو افسانے کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

اردو میں افسانہ نگاری کی روایت بڑی متنوع اور نگارنگ رہی ہے۔ انسانی زندگی کے گونا گوں تجربات، مشاہدات اور مسائل کو مختلف افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔

1.3 منشی پریم چند (تعارف)

پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ وہ ۳۰/ جولائی/ ۱۸۸۰ء کو بنارس سے چھ کلو میٹر دور ایک گاؤں لمہی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عجائب لال محکمۂ ڈاک میں منشی تھے۔ ان کی والدہ آنندی کا تعلق بنارس کے ایک تعلیم یافتہ اور مہذب گھرانے سے تھا۔ پریم چند نے اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم لمہی کے ایک مکتب میں مولوی صاحب سے حاصل کی۔ ۸ سال کی عمر میں ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ پندرہ سال کی عمر میں ان کی شادی کر دی گئی۔ میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ایک اسکول میں اٹھارہ روپئے کی عارضی ملازمت مل گئی۔

پریم چند کو ابتداء ہی سے مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سوتیلی ماں کا سلوک ان کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ پریم چند کی بیوی ایسی ملی جو ان کو قطعی پسند نہیں تھی۔ ہمیشہ سوتیلی ماں سے جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ ایسے میں ان کے والد کا بھی انتقال ہو گیا۔ گھر کی ذمہ داری ان کے سر پر آ پڑی اس کے باوجود انہوں نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ وہ ایم۔ اے کر کے وکیل بننا چاہتے تھے۔ لیکن گھر کی ذمہ داریوں کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ جاری منقطع کرنا پڑا۔ ٹیوشن لے کر اپنا اور گھر والوں کا پیٹ پالتے تھے۔ ملازمت کی کوششوں میں کامیابی ملی۔ بہرائچ کے پرائمری اسکول میں ٹیچر بن گئے۔ انہیں ٹریننگ کالج بھیجا گیا جہاں وہ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۴ء تک رہے۔ ان کا تقرر کانپور میں ایک ٹیچر کی حیثیت سے ہوا۔ کانپور کا قیام ان کی ادبی زندگی میں ایک اہم موڑ رکھتا ہے۔ ان کی ملاقات ''زمانہ'' نامی ماہوار رسالے کے ایڈیٹر دیا نرائن نگم سے ہوئی۔ وہ ''زمانہ'' میں پابندی کے ساتھ افسانے اور مضامین لکھنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں نئی

بیداری اور آزادی حاصل کرنے کی لگن پیدا ہو رہی تھی ،جن سے پریم چند بھی متاثر ہوئے اور جب وطن کے موضوع پر انہوں نے کئی افسانے لکھے۔''سوز وطن'' کے نام سے انہیں مجموعہ کی شکل میں کر دیا۔انگریز حکومت ایسے جذبات کو سختی سے کچلنا چاہتی تھی۔اسی وجہ سے ۱۹۰۸ء میں اس پر نہ صرف پابندی لگادی بلکہ اسے ضبط کر کے پریم چند کے سامنے اس کی ساری کاپیاں جلادیں۔

۱۹۲۱ء میں انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دیا اور جدوجہد آزادی میں شامل ہو گئے۔اس طرح اپنی عمر کے آخری حصے تک قلم کے سپاہی کی طرح زندگی گذاری۔بعد میں انہوں نے اپنا ایک پریس قائم کیا اور وہاں سے ''ہنس'' نام کا ایک رسالہ ہندی میں جاری کیا اور اس کے ساتھ ایک ہفتہ وار اخبار ''جاگرن'' شائع کرنے لگے۔پریم چند کی صحت عرصے سے خراب رہنے لگی اور آخر کار ۸/ اکتوبر/ ۱۹۳۶ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

1.4 افسانہ ''کفن''

(۱)

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردزہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔جاڑوں کی رات تھی ،فضا سناٹے میں غرق ،سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا ''معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔سارا دن تڑپتے ہو گیا۔جا دیکھ تو آ۔''

مادھو دردناک لہجے میں بولا ''مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔دیکھ کر کیا آؤں؟''

''تو بڑا بے درد ہے بے سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اسی کے ساتھ اتنی بے وپھائی ؟''

''تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔''

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔اس لیے انہیں کوئی رکھتا ہی نہیں تھا۔گھر میں مٹھی بھر اناج ہو تو

ان کے لیے کام کرنے کی قسم تھی ۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا اور جب تک وہ پیسے رہتے دونوں اِدھر ادھر مارے مارے پھرتے ۔ جب فاقے کی نوبت آ جاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے ۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی ۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لئے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکل کے لئے ضبطِ نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی ۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی ۔ عجیب زندگی تھی ان لوگوں کی ۔ گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں ۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے، دنیا کے فکروں سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے ۔ گالیاں بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں ۔ مسکین اتنے کہ وصول کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلوا کھاڑے لاتے اور بھون بھون کر کھاتے، یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور راتوں کو چوستے ۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ بلکہ اس کا نام اور بھی روشن تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے۔ جو کسی کے کھیت سے کھود کر لائے تھے ۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا۔ مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی ۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی ۔ پسائی کر کے گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا بھی انتظار کر لیتی ۔ اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی ۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے ۔ وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ سے مر رہی تھی ۔ اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں رہتے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں ۔ گھیسو نے آلو نکال کر چھلتے ہوئے کہا ”جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی چڑیل کا پھساد ہو گا۔ اور کیا یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے کس کے گھر سے آئے۔“

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا، بولا ” مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔“

”ڈر کس بات کا ہے میں تو یہاں ہوں ہی ۔“

''تو تم ہی جا کر دیکھونا۔''

''میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں۔اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں۔کبھی اس کا منھ نہیں دیکھا؛ آج اس کا اگھرا ہوا بدن دیکھوں اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہوگی مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔''

''میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔سونٹھ، گڑ، تیل کچھ تو نہیں ہے گھر میں۔''

''سب کچھ آئے گا۔بھگوان بچہ دیں تو۔۔۔۔۔۔جو لوگ ابھی پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے۔میرے نولڑکے ہوئے، گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔''

جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے، کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرواز جماعت میں شامل ہو گیا۔ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین وادب کی پابندی بھی کرتا۔اس لئے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں کچھ ٹھنڈا ہو جانے دیں۔کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا تھا لیکن دانوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور تالو اور حلق کو جلا دیتا تھا۔اور اس انگارے کو منھ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھا۔اس لئے دونوں جلدی جلدی نگل جاتے۔حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی۔جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔اس عورت میں اسے

جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی۔اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔بولا''وہ بھوج نہیں بھولتا۔تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں۔سب کو چھوڑ بڑے سب نے پوڑے کھائیں اور اصلی گھی کی سپٹنی ، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ۔ایک رسے دار تر کاری، دہی،چٹنی،مٹھائی،اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔کوئی روک نہیں تھی۔جو چیز چاہو مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ۔لوگوں نے تو ایسا کھایا،ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی کچوریاں ڈالے دیتے ہیں۔منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہئے۔تپل کو ہاتھ سے روکے ہوئے تھے مگر وہ ہیں دیئے جاتے ہیں۔اور جب سب نے منہ دھولیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔مگر مجھے پان لینے کی کہاں سدن تھی،کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔چٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔''

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا کہ''اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کِھلا تا۔''

''اب کوئی کیا کھلائے گا وہ جمانا دوسرا تھا۔اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے۔سادی بیاہ میں مت کھرچ کرو۔کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے۔ہاں کھرچ میں کچھ گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔''

گِھسوا نے زمین پر سر رکھ کر، آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔''سرکاری بڑی بپت میں ہوں ؛مادھو کی گھر والی رات گجر گئی؛ دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔دوا دارو جو کچھ ہوسکا سب کیا۔مگر وہ ہمیں دگا دے گئی۔اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا۔مالک۔ تباہ ہوگئے؛ گھر اجڑ گیا۔آپ کا گلام ہوں۔اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا۔ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا وہ سب دوا دارو میں اٹھ گیا۔سرکار ہی کی دَیا ہوگی تو اس کی مٹی اٹھے گی۔آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں؟''

زمیندار صاحب رحمدل آدمی تھے۔مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔جی میں تو آیا کہہ دیں۔

''چل دور ہو یہاں سے لاش گھر میں رکھ سڑا، یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آ کر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا بدمعاش۔'' مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقعہ نہیں تھا۔ طوعاوکرہا دو روپے نکال کر پھینک دیئے۔ مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منھ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں؛ گو یہ سر کا ربوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپیہ دئے تو گاؤں کے بنئے مہاجنوں کو انکار کی جرات کیوں کر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام سے ڈھنڈھورا پٹیتا جاتا تھا۔ کسی نے دو آنے دئے۔ کسی نے چار آنے۔ ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہوگئی۔ کسی نے غلہ دیا اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے ادھر لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش آ کر دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

(۳)

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا۔''لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے کیوں مادھو''

مادھو بولا۔''ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کپھن چاہیئے۔''

''تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں۔''

''ہاں اور کیا۔ لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی رات کو کپھن کون دیکھتا ہے۔''

کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہیے۔''

''کپھن لاس کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔''

''اور کیا رکھا ہے۔ یہی پانچ روپیہ ملتے تو کچھ دوادارو کرتے۔''

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آپہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ اور ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب کی لی۔ کچھ گزک، اور دونوں برآمدے میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آ گئے۔

گھیسو بولا۔''کپھن لگنانے سے کیا ملتا۔آ کھر جل ہی تو جاتا۔کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔''

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔

''دُنیا کا دستور ہے۔یہیں لوگ بامنوں کو ہجاروں کیوں دے دیتے ہے۔کون دیکھتا ہے پرلوگ ملتا ہے کہ نہیں۔''

''بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں۔ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے؟

''لیکن لوگوں کو جواب کیا دو گے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کہ کپھن کہاں ہے؟''

گھیسو ہنسا۔''کہہ دیں گے کہ روپیہ کمر سے کھسک گئے۔بہت ڈھونڈا ملے نہیں۔''

مادھو بھی ہنسا۔اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا:۔

''بڑی اچھی تھی بچاری۔مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔''

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہوگئی۔گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں۔گوشت اور سالن۔اور چٹ پٹ کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔پورے ڈیڑھ روپیہ خرچ ہو گئے۔صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے تھے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوڑیاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کا فکر۔ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔''ہمارا آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پن نہ ہوگا۔''

مادھو نے فرق عقیدت جھکا کر تصدق کی۔''جرور سے جرور ہوگا۔'' بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو۔اسے بیکھنٹھ لے جانا۔ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔''

''ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔

''کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی۔''

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پُر ملامت انداز سے دیکھا۔

''جو وہاں ہم لوگ سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟''

''کہیں گے تمہارا سر۔''

''پوچھے گی تو جرور۔''

''تو کیسے جانتا ہے کہ اسے کفن نہ ملے گا۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کفن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔''

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا ''کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیئے۔''

گھیسو تیز ہو گیا۔ ''میں کہتا ہوں اسے کپھن ملے گا تو مانتا کیوں نہیں۔''

''کون دے گا بتاتے کیوں نہیں۔''

''وہی لوگ دیں گے جنہوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپیہ ہمارے ہاتھ آئیں گے اور اگر کسی طرح آجائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے۔ اور تیسری بار ملے گا۔''

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا۔ اور ستاروں کی چمک تیز ہوئی تھی۔ مے خانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا کوئی لہکتا تھا۔ کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا۔ کوئی اپنے دوست کے منھ سے ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا، ہوا میں نشہ، کتنے تو چلو میں الو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آئے تھے صرف خود فراموش کا مزا لینے کے لئے۔ شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی۔ اور کچھ دیر کے لئے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں زندہ درگور۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزا لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا۔ جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور ''دینے'' کے غرور، ولولہ اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا۔ ''لے جا۔کھوب کھااوراسیر باد دے جس کی کمائی ہے وہ تو مرگئی۔مگر تیرا اسیر باد اسے جرور پہنچ جائے گا۔روئیں روئیں سے اسیر باد دے بڑی گاڑی کمائی کے پیسے ہیں۔''

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بیکھنڈ میں جائے گی دادا۔۔۔بیکھنڈ کی رانی بنے گی۔''

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔ ''ہاں بیٹا بیکھنڈ میں جائے گی۔کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں۔مرتے وقت ہماری جندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کرگئی۔وہ نہ بیکھنڈ میں جائے گی۔تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں۔اوراپنے پاپ کو دھونے کے لئے گنگا میں جاتے ہیں۔اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔''

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بدلا۔تلون نشے کی خاصیت ہے۔یاس اور غم کا دورہ ہوا۔

مادھو بولا:۔

''مگر دادا بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔مری بھی تو کتنا دُکھ جھیل کر۔''

وہ آنکھو پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا ''کیوں روتا ہے بیٹا۔کھس ہو کے وہ مایا جال سے مکت ہوگئی۔جنجال سے چھوٹ گئی۔بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔''

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔

ٹھگنی کیوں نیناں جھمکاوے ٹھگنی

سارا میخانہ محوتماشا تھا اور یہ دونوں میکش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔پھر دونوں ناچنے لگے۔اچھلے بھی۔کودے بھی، گرے بھی، مٹکے بھی، بھاؤ بھی تائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

1.6 افسانہ کفن کا خلاصہ

افسانہ ''کفن'' پریم چند کا ایک مایہ ناز شاہکار افسانہ ہے۔جس میں دیہات کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ چماروں کا ایک کنبہ تھا جو بدنام بھی تھا ساٹھ سالہ گیسو اپنے بیٹے مادھو اور بہو بدھیا کے ساتھ رہتا

تھا۔مسلسل بھوک ،استحصال اور سماجی برائی ،جبر کی صورت میں انسان سے کسی طرح بنیادی انسانی اوصاف چھین لیتا ہے، بدھیا بچے کو ختم تو نہ دے سکی تڑپ تڑپ کر اپنی جان دے دیتی ہے۔جبلہ بچہ مادر شکم میں مرجاتا ہے گھیسو اور مادھو جو انتہائی کام چور اور آلسی (کام چور) ہوتے ہیں۔بدھیا کے کراہنے اور تڑپنے پر توجہ نہیں دیتے اور کھیت سے آلو لا کر اسے بھون کر کھاتے رہتے ہیں۔لیکن بدھیا جو دم توڑ رہی ہے۔اس کے پاس نہیں جاتے کہ اگر ایک گیا تو دوسرا ان آلوؤں کو کھا جائے گا۔جو وہ کھیت سے کھود کر لائے تھے اس طرح بدھیا کے مرنے کے بعد گاؤں کے مہاجن اور دیہاتوں سے کفن کے پیسے اکٹھا کرتے ہیں۔لیکن یہ پانچ روپئے بھی شراب و کباب میں خرچ کردیتے ہیں اور پھر مختلف ناولوں (بیان حلیہ شرعی) سے اپنے ضمیر کی آواز دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔پریم چند نے سماج کے ناسور کو کریدا ہے جیسے ’’کیسا برا رواج ہے کہ جیتے جی توڑ کر محنت کرتے ہیں اور اس کا فائدہ دوسرے اٹھاتے ہیں۔وہ بے چارے اپنی ساوی لوحی کے باوجود ہمیشہ نقصان میں رہتے ہیں اس طرح پریم چند کی شاہکار کہانیاں وہی ہیں جو گاؤں کے ماحول اور زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ پریم چند نے اپنے تجربات و مشاہدات کا استعمال کیا ہے۔بوڑھی عورتوں کے ذریعے وہ گاؤں، دیہات کی پوری تہذیب اور روایت کو جس دل دہلانے والے منظر پریم چند کے افسانوں میں ملتے ہیں۔غریب طبقہ اپنی بے حسی کی انتہا پر پہنچ کر ’’کفن‘‘ میں گھیسو اور مادھو کا روپ لے لینا۔ جہاں پریم چند کا فکر وفن اپنے عروج پر پہنچ کر انسانی نفسیات کا شاہکار پیش کرتا ہے۔افسانہ ’’کفن‘‘ میں پلاٹ، کردار نگاری فطری، مکالموں اور دیگر فنی خوبیوں کی بنا پر ایک اہم ترین مقام حاصل کر لینا ہے۔

1.7 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
لیل ونہار	رات اور دن	حمیت	غیرت
فکشن	افسانوی ادب	دردزہ	دورانِ تولید ہونے والا درد
معابد	عبادت خانے	مہمیز کرنا	گھوڑے کو ایڑ لگانا۔
تمدن	کلچر	تخیل	تصور، قیاس، خیال

ضعف	کمزوری	آتما	روح
بالواسطہ	کسی ذریعے سے	بلاواسطہ	براہِ راست

1.8 مشقی سوالات

(۱) گھیسو اور مادھو کون تھے؟

(۲) جھونپڑے کے باہر اندر کی کیفیت کو اپنے انداز میں تحریر کیجیے۔

(۳) گھیسو اور مادھو کی غربت کے تعلق سے آپ کیا جانتے ہیں۔

(۴) مادھو کی شادی کے بعد اس کی زندگی میں کیا تبدیلی آئی؟

(۵) گھیسو کے کہنے کے باوجود بدھیا کو دیکھنے کے لئے کوٹھری کے اندر کیوں نہیں گیا؟

(۶) صبح جب مادھو کوٹھری کے اندر گیا تو اس نے کیا دیکھا؟

1.9 مزید مطالعہ کے لئے کتب

ا۔ پروفیسر قمر رئیس	پریم چند کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ
۲۔ مدن گوپال	قلم کا مزدور
۳۔ پروفیسر جعفر رضا	پریم چند فن اور تعمیر فن
۴۔ ڈاکٹر واجد قریشی	پریم چند کے افسانوں میں حقیقت کی تلاش

اکائی 2۔ افسانہ ”آخری کوشش“

حیات اللہ انصاری

اکائی کے اجزاء:

2.1 مقاصد

2.2 تمہید

2.3 مصنف کا تعارف

2.4 حیات اللہ انصاری کی افسانہ نگاری

2.5 افسانہ ”آخری کوشش“

2.6 خلاصہ ”آخری کوشش“

2.7 فرہنگ

2.8 مشقی سوالات

2.9 مزید مطالعہ کے لئے کتب

2.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلباء سے درج ذیل مقاصد کی توقع کی جاتی ہے۔

☆ طلباء افسانہ نگار کا تعارف کروائیں۔

☆ افسانہ ”آخری کوشش“ کا خاکہ پیش کریں۔

☆ مجموعی طور پر مختصر افسانے کا عمومی جائزہ لیں۔

2.2 تمہید

اس اکائی میں اردو کے بلند پایہ افسانہ نگار ”حیات اللہ انصاری“ کا تعارف پیش کیا جائیگا۔ افسانہ ”اخری کوشش“ کا خاکہ پیش کر کے اس افسانے کا عمومی جائزہ لیا جائیگا۔

2.3 مصنف (حیات اللہ انصاری) کا تعارف:

'حیات اللہ انصاری' کا شمار بیسویں صدی کے ممتاز اور بلند پایہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ۱۱رمئی ۱۹۱۱ء کو لکھنؤ کے مشہور خانوادہ 'فرنگی محل' میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم فرنگی محل کی مشہور درس گاہ 'مدرسہ نظامیہ' میں حاصل ہوئی۔ اور عالمیت کی سند حاصل کرنے کے بعد اسی مدرسہ میں ملازمت اختیار کی۔ کچھ عرصہ تک درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد مزید تعلیم کیلئے علی گڑھ یونیورسٹی کا رُخ کیا اور گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔

اپنی زندگی میں آئے اُتار چڑھاؤ اور تلخ حقائق کو بہت قریب سے دیکھنے کے بعد اُنہوں نے اپنا قلم اُٹھایا اور ۱۹۲۷ء میں پہلا افسانہ 'بڑھا سودخور' لکھا۔ اور حیات اللہ کے اس قلم نے ادب کے میدان میں ایسی دھوم مچائی جس کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ اس افسانے کے ساتھ ہی انہوں نے افسانہ نگاری کو اپنا ذریعہ معاش بنالیا۔

آپ کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۹۷۰ء میں ساہتیہ اکادمی نے آپ کو اعزاز سے نوازا۔ ۱۹۹۷ء میں اقبال سمان سے نوازے گئے۔ ۱۸رفروری ۱۹۹۹ء کو علم و ادب کا یہ روشن چراغ بجھ گیا۔

2.4 حیات اللہ کی افسانہ نگاری

حیات اللہ انصاری کو بیسویں صدی کا سب سے بڑا لکھاڑ صحافی اور ناول نگار بھی کہا جاسکتا ہے۔ ممتاز ناقد خلیل الرحمٰن اعظمی کے بموجب ''حیات اللہ انصاری'' کو صفِ اول کا افسانہ نگار ثابت کرنے کیلئے ''آخری کوشش'' ہی کافی ہے۔ اور ممتاز ناقد ڈاکٹر صادق کے بموجب ''آخری کوشش'' میں حیات اللہ انصاری کا فن حقیقت نگاری کی بلندیوں پر پہونچ گیا ہے جہاں تک پریم چند کی رسائی نہیں ہوسکی۔ 'کفن' اردو کا مکمل اور شاہکار افسانہ کہلانے کے باوجود حقیقت نگاری کے معاملے میں 'آخری کوشش' سے بہت پیچھے ہے۔

حیات اللہ انصاری نے اپنے افسانوں میں غربت، مجبوری، بے بسی، بے کسی، دُکھ درد اور تڑپ کو موضوع بنا کر ان تمام مسائل کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا ان کے افسانے سماج میں شرافت کا لبادہ اوڑھے

طبقے پر بھرپور طمانچہ ہیں۔ حیات اللہ انصاری نے اپنے افسانوں میں سرکاری افسروں، شرفاء، مذہبی رہنما سمیت تمام لوگوں کے مکروہ چہروں سے نقاب کھینچ کر ان کے اصلی چہرے کو سماج کے سامنے پیش کیا ہے۔

حیات اللہ انصاری اُردو زبان کے سچے عاشق تھے اور اُردو ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ ایک طرف انہوں نے اپنے قلم سے عوام کے مسائل پوری شدت سے اُٹھائے تو دوسری طرف آزادی کے بعد ملک میں اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کیلئے نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات۔ ''قلمی جہاد'' سے لے کر ''عملی جہاد'' تک آپ نے ہر طریقے سے کوشش کرتے ہوئے اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کیلئے ۲۰ لاکھ محبان اردو کی دستخط کا محضر نامہ صدر جمہوریہ ہند کو پیش بھی کر دیا۔

اپنے فکر و فن اور عملی کاوشوں سے انہوں نے اردو ادب میں جو گراں قدر خدمات انجام دیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ بین الاقوامی فلم میلہ میں انعام پانے والی پہلی ہندوستانی فلم ''نیچا نگر'' کی کہانی بھی آپ ہی نے لکھی۔ آپ کے ناول ''لہو کے پھول'' ٹی وی سیریئل بھی بنایا جا چکا ہے۔ دو افسانوی مجموعے اور تین ناول منظر عام پر آ کر ادبی دنیا میں دھوم مچا چکے ہیں

2.5 افسانہ ''آخری کوشش''

ٹکٹ بابو نے گیٹ پر گھسیٹے کو روک کر کہا:

''ٹکٹ!''

گھسیٹے نے گھگھیا کر بابو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ماں کی گالی دے کر اسے پھاٹک کے باہر ڈھکیل دیا۔ ایسے بھک منگوں کے ساتھ جب وہ بلا ٹکٹ سفر کریں اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے؟

گھسیٹے نے اسٹیشن سے باہر نکل کر اطمینان کی سانس لی کہ خدا خدا کر کے سفر ختم ہو گیا۔ راستہ بھر ٹکٹ بابوؤں کی گالیاں سُنیں، ٹھوکریں سہیں۔ بیسویں بار ریل سے اتارا گیا۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن پیدل بھی چلنا پڑا، ایک دن کے سفر میں بائیس دن لگے مگر ان باتوں سے کیا؟ کسی نہ کسی طرح اپنے وطن تو پہنچ گئے۔۔۔ وطن! پچیس برس کے بعد وطن، ہاں پچیس ہی برس تو ہوئے جب میں کلکتہ پہنچا تو کالی مِل کھلی تھی اور اب لوگ کہتے ہیں کہ اس کو کھُلے پچیس برس سے زیادہ ہو گئے۔ آ گئے وطن، ہاں اب فاصلہ ہی کیا ہے۔ اگر

یاد غلطی نہیں کرتی ہے،تو وہ کوس کا کچّا راستہ اور۔۔۔۔۔دو گھنٹہ کی بات۔

اپنا گھر! اپنے لوگ! وہ نعمتیں جن کا پچیس سال سے مزا نہیں چکھا۔کلکتہ میں گھر کے نام کو سڑک تھی یاد کانوں کے تکتے یا پھر شہر سے میلوں دور ٹھیکہ دار کی جھونپڑیاں جس کی زمین پر اتنے آدمی ہوتے تھے کہ کروٹ لینے بھر کی جگہ نہ ملتی تھی۔ رہے اپنے لوگ سو وہاں اپنا کون تھا؟ سب غرض کے بندے، بے ایمان، حرام زادے،ایک وہ سالا تھا بھوندو اور دوسرا تھا بھورا اور وہ ڈائن بھنگوی جو خونچے کی ساری آمدنی کھا گئی، وہ ملوں کے مزدور۔۔ بھائی ہیں بھائی ہیں،مگر مزدوری کا موقع آیا کہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑ گئی۔ جہاں جاؤ کوئی دوسرا مزدور سفارش لئے موجود۔۔ یہاں سفارش کرنے والا کون تھا؟۔۔۔ جب جیلر نے آکر مجھے حکم سنایا ہے کہ 'تیری معیاد ختم' تو آنکھوں سے نہ جانے کیوں آنسو نکل آئے۔بس ایک دم سے گھر کی یاد آ گئی۔گھر! کیا چیز ہے؟

گھسیٹے کو یقین تھا کہ پچیس سال کی تھکی ماندی آتما کو گھر پہنچتے ہی سکھ مل جائے گا'اور گھر اب قریب تھا۔

اسٹیشن سے کچھ دور آکر گھسیٹے بھونچکا سا رہ گیا۔ یہاں کی دنیا ہی اب اور تھی۔کھیتوں اور باغوں کی جگہ ایک شکر مل کھڑی دھواں اُڑا رہی تھی۔جس کی عمارتیں یہاں سے وہاں تک نظر آتی تھیں۔پکی سڑک تھی اور اس کے برابر مل تک ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ سڑک خوب آباد تھی۔مزدورں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے غول آ جا رہے تھے۔اتنی دیر میں کئی موٹریں فرّاٹے بھرتی نکل گئی تھیں۔ایک مال گاڑی چھک چھک کرتی جا رہی تھی۔غرض کہ جغرافیہ اتنا بدل گیا تھا کہ راستہ پہچاننا بس سے باہر تھا لیکن پھر بھی گھسیٹے کا دل اس بات پر راضی نہ ہوا کہ میں اپنے اسٹیشن پر اتر کر اپنے ہی قصبہ کا راستہ پوچھو۔ یہ آپ ہی ایک طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دور آکر جب شکر مل کی حدیں ختم ہونے لگیں،اور اوکھ کے کھیتوں اور باغوں کا سلسلہ آ گیا۔تب اس کے دل نے دھڑک کر کہا میرا راستہ ٹھیک ہے۔

ڈیڑھ کوس چلنے کے بعد اپنے قصبے کے تاڑ دکھائی دینے لگے۔ذرا اور چل کر شاہی زمانے کی ٹوٹی ہوئی مسجد ملی جسکا ایک مینار تو ناچتی ہوئی بیلوں سے منڈھا اور جنگل کبوتروں سے آباد تھا اور دوسرا تقریباً مسلم

زمین پر لیٹا کائی کی مخملیں چادر اوڑھے تھا۔اس پر نظر پڑ نا تھی کہ بچپن کی بہت سی چھوٹی چھوٹی یادیں جو کب کی بھول چکی تھیں۔پچیس برسوں کے بھاری بوجھ کے نیچے اکدم پھڑ پھڑا کر تڑپ کر نکل آئیں اور کم سن دیہاتی چھوکریوں کی طرح سامنے اچکنے کودنے لگیں۔وہ زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا جب اس مسجد کے گرد پانی بھر جاتا اور گاؤں بھر کے لونڈے ننگے اس میں نہاتے تھے۔اس وقت بھی یہ کھڑا مینار یوں ہی کھڑا تھا اور لیٹا مینار یوں ہی لیٹا تھا۔

آگے چل کر برگد کا درخت ملا۔یہ وہ جگہ تھی جہاں ہیرا، بقاتی، بلاقی، تینو، نیولا، سورج، بلا اور وہ کنوا سالا کیا نام تھا اس کا اور کون کون ساری کی ساری ٹولی جمع ہوتی تھی اور دن دن بھر سیار مار ڈنڈا اڑا کرتا تھا۔وہ گڑھیا کے اس پار امرد کا ایک باغ تھا۔اس پر کبھی کبھی لونڈا ڈاکہ پڑا کرتا تھا۔لونڈے گھس گئے اور چپکے چپکے کچے پکے امرود نوچ نوچ کر جیبوں میں بھرنے لگے۔اور رکھوالا ماں بہن کی سناتا دوڑا اور ادھر آنا فانا میں سب ہوا ہو گئے۔ایک بار ایسا ہوا کہ لونڈے امرود کھسوٹ رہے تھے کہ ادھر رسے ایک فقیرنی آنکلی جو منمنا منمنا کر گا رہی تھی کچھ لونڈوں کو سوجھی شرارت۔وہ چڑیل چڑیل چلا کر بھاگے۔پھر کیا تھا۔سب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔بلاقی رہ گیا۔ارے ڈر کے مارے اس کی حلکو گھگھی بندھی ہے اور جو لگا ہے فقیرنی کے سامنے ہاتھ جوڑنے۔۔۔۔۔گھسیٹے یہ یاد کر کے بے اختیار ہنس پڑا۔

سورج دن بھر کا سفر طے کر کے افق کے قریب پہنچ چکا تھا۔دھوپ میں ملائمت آ گئی تھی اور ہوا میں خوش گوار خنکی۔راستے کے ایک طرف پتاور کے ہرے بھرے جھنڈ تھے۔جن کے بیچ بیچ سے بوڑھی سرکیاں سروں کو نکالے جوانوں کی طرح کھڑی ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔دوسری طرف آسمان کے کنارے تک کھیتوں اور امرود کے باغوں کے سلسلہ چلا گیا تھا۔بسیرا لینے والی میناؤں اور کوؤں کا شور کھیتوں سے واپس آنے والے بیلوں کی گھنٹیاں، ہلواہوں کی ہٹ ہٹ باغوں کے رکھوالوں کی ہو ہو،اس سب سے ہوا اسی طرح بسی ہوئی تھی، جیسے پتاوروں کی بھینی بھینی میٹھی میٹھی خوشبو سے معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا ایک بہت بڑا گھر ہے جس کے رہنے والے یعنی کھیت، درخت، ہوا، آنے والی صدائیں اور خوشبو سب قریبی رشتہ دار ہیں اور خوشی خوشی مل جل کر رہتے ہیں۔

کسانوں کا ایک جتھا کھیتوں سے واپس آتا ہوا ملا۔ آگے آگے ایک لڑکی پھٹی اوڑھنی سر سے لپیٹے گاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہلوں کو کندھے، پر رکھے، بیلوں کو ہنکاتے چھ سات مرد تھے۔ اس لوگوں نے پھٹے حال گھسیٹے کی طرف توجہ نہ کی۔ مگر جیسے ہی گھسیٹے کی ان میں سے ایک شخص سے نگاہ ملی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا جیسے کوئی دور دراز سفر سے آنے والا اپنے عزیزوں کو دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔

ادھر سورج افق کے دامن میں چھپا اور ادھر قصبہ آ گیا۔ اس کا نشان ایک اکل کھرا تاڑ تھا جس سے کچھ دور ہٹ کر آم کے دو چار بوڑھے درخت شام کا دھندلکا اوڑھے کسی یاد میں کھوئے کھڑے تھے۔ اس مقام سے ایک بہت رومان بھری یاد انگڑائی لے کر اٹھی اور گھسیٹے کے پاؤں تھام لئے۔ وہ بلا ارادہ کھڑا ہو گیا۔ وہ سامنے کی جھاڑی اور گڑھیا یہیں دلاری سے چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ وہ بھرے جسم کی جہنا ایسی دلاری جس کے نہ روٹھنے کا ٹھیک پتہ چلتا تھا اور نہ منّنے کا۔ وہاں بیٹھ کر وہ دلاری کا انتظام کرتا تھا، تو دل میں کیا کیا نقشے بنتے تھے۔ شہر جاؤں گا اور ہیرالال کی طرح ایک دم سے ایک گوئی بیل لے کر کھیتی شروع کروں گا۔ اسی وقت دلاری میری کتنی خوشامدیں کرے گی۔ میں تو کم سے کم دو مہینے تک اس سے بات بھی نہ کروں گا۔ بس اس جگہ ٹہلنے آ جایا کروں گا۔ وہ آ جایا کروں گا۔ وہ ائے گی ضرور، اور وہاں درخت کی جڑ پر بیٹھ، گڑھیا میں ڈھیلے پھینکے گی، گنگنائے گی،۔ میری طرف کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر ہنسے گی۔۔۔۔۔ بڑی چڑیل تھی نہ جانے اب کہاں ہے؟

گھسیٹے درختوں کے اندر گھس کر سڑھیا اب تک ہے؟ ہاں ہے تو اور وہ سامنے جمنی کا درخت بھی ہے جس کی جڑ پر وہ بیٹھی تھی۔ کیا زمانہ تھا!

گھسیٹے درختوں سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور قصبے کے اندر چلا۔ مگر اب اس کی چال دھیمی تھی۔ وہ ان یادوں میں ایسا ڈوب گیا تھا کہ آنکھیں دیکھنا اور کان سننا بھول گئے تھے۔ ایکا ایکی ایک موڑ پر چونک پڑا جیسے کوئی بسری بات اک دم یاد آ گئی ہو۔ یہی جگہ تو ہے۔ ہاں یہیں ابا نے دو چانٹے مار کر میرے گلے سے شبن میاں کی قمیص کا بٹن نوچ لیا تھا۔ ادھر شبن میاں گھر کے اندر آئے اور ادھر ڈانٹ لگائی۔ ’’گھسیٹے! گھسیٹے!۔۔۔۔۔ کدھر مر گیا؟‘‘ ٹانگیں پھیلا کر دونوں بوٹ میرے منہ کی طرف بڑھا دیے۔ ان کو

اتارو پھر جرابیں اتارو، پھر انگلیوں کو تولئے سے پونچھو، پھر جوتی لا کر پاؤں کے نیچے دھرو۔۔۔۔۔شبّن میاں کی چیزیں دیکھ دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ ان میں سے دوایک ہمارے پاس بھی ہوتیں! ہمارے پاس کیا تھا؟ ایک پھٹا کرتہ پاجاما پہنے رہتے تھے۔ جب وہ بالکل چیتھڑے ہو جاتا تو خاں صاحبن پھر کسی کا پرانا دھرنا جوڑا دے دیتیں، ''پھر پھاڑ لایا۔''؟اس کے بدن پر تو کاٹنے ہیں۔''یہ کہاں سے کھونچا لگایا؟''۔۔۔کمینے کو کبھی تمیز نہ آئے گی۔''ایک بار شبن میاں کے کمرے میں جو گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ قمیص کے کف کے دو بٹن پلنگ پڑے چم چم کر رہے ہیں۔اس وقت کچھ ایسے پیارے معلوم ہوئے کہ میں نے چپکے سے ایک مٹھی میں دبا لیا۔تھوڑی دیر میں شبّن میں چلانے لگے۔''ایک بٹن کیا ہوا؟ کون لے گیا؟'' میں نے جی میں کہا۔میں لایا ہوں۔کہو کیا کہتے ہو؟ بٹن تو نہ دوں گا چاہے کچھ کرو۔ بلکہ اب تو تمہارے گھر کا کام بھی نہ کروں گا۔سب کی آنکھ بچا کر باہر چلا آیا۔میری قمیص میں آستین کہاں تھی؟ میں نے وہ بٹن گلے میں اس طرح لگایا کہ بٹن اور زنجیر دونوں چیزیں باہر چم چم کریں اور پھر دن بھر بھوکا پیاسا کھیتوں کھیتوں گھومتا رہا۔ جب رات آ گئی تب فکر ہوئی کہ اب کہاں جاؤں گا۔میں ادھر ادھر دبکتا پھرتا تھا کہ ابّا نے جو میری کھوج میں لگے تھے، دیکھ لیا۔''تو شبّن میاں کا سونے کا بٹن لے آیا۔۔۔۔سونے کا بٹن۔'' دو تھپّڑ پڑے تھے کہ میں بھاگا۔سونے کا بٹن۔کلکتہ میں چار پیسے ملتا ہے جتنے چاہو اتنے لے لو۔

چھپّروں اور نیچی نیچی کچّی دیواروں پر شام کے سانولی رنگت چھا گئی۔فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔جس سے دل کو عجب سکون ملتا تھا۔گھروں مین چولھے جل گئے تھے جن کا دھواں اور سرخی چھپروں سے نکل نکل کر بلا کسی گھبراہٹ کے اوپر چڑھ رہے تھے۔پکارنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو اپنے ساتھ دن بھر کی تکان کو لئے بھاگی جا رہی تھیں۔دوارے پر لڑکے لڑکیاں اونچا نیچا کھیل رہے تھے اور بے حد شور مچا رہے تھے جیسے بسیرا لیتے وقت جنگلی مینائیں۔۔۔ایک گھوڑا دن بھر دوڑ دھوپ کر کے ابھی ابھی تھان پر آیا تھا اور خوشی سے ہنہنا رہا تھا۔

آخر مسجد آ گئی۔اسی کی بغل سے گھسیٹے کا راستہ جاتا تھا۔پہلی تاریخوں کا ہلال مسجد کے ایک مینار سے لگا ہوا چمک رہا تھا۔اسے دیکھ کر گھسیٹے کو ایک بار رات یاد آ گئی۔جو باجے گاجے لئے مشعلوں جلائے ایک کمزور سی

ناؤپر، چڑھی گنگا کی خونی لہروں کا پار کر کے کنارے آ اُتری تھی۔

بغیا بھی آ گئی۔اس کے پار آبادی سے ذرا نکل کر گھر تھا۔گھسیٹے کا دل امید وبیم سے زور زور سے دھڑ کنے لگا اور ساتھ ساتھ خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔آنکھوں کے سامنے گھر کی تصویر پھر گئی۔بڑا سا صاف ستھرا لیپا پوتا چھپر۔دو بڑی بڑی اناج کی کھٹیاں۔رات کو نہ معلوم کب سے اٹھ کر اماں کا گھرڑ گھرڑ چکی پیسنا اور اس پر گانا۔''موری چھا گل نہ بولے۔''دن کو کام کاج کر کے گھر آؤ اور لا کھ چلاّؤ۔'''''امّاں روٹی دے، امّاں روٹی دے۔''اور چلاتے چلاتے تھک جاؤ۔رودھو کر اماں اسی طرح پیسے چلی جاتی ہیں۔جب اس کا جی چاہتا تب اٹھ کر چولھا جلاتی جمیا اور شبراتن !افوہ! دونوں کو اماں کتنا مارتی تھی اور تھیں وہ بھی دونوں بڑی حرامزادی۔کبھی جو کام کرتیں۔۔۔۔ادھر ابا کلہاڑی کندھے پر رکھ بکریاں ہانکتا گھر میں گھستا اور ادھر چلانے لگتا۔ادھر اماں پر غصّہ آیا اور جو نئے پکڑ کر دھوئیں دھوئیں۔۔۔۔واہ ری امّاں جہاں کسی کا جی خراب ہوا اس کے جی کو لگ گئی۔پھر تو یہ ہے۔ارے آتر ا سر داب دوں''۔۔۔۔ادھر آ بخر گجرا تاروں۔۔۔۔چاندنی میں بیٹھ کر نہ کھا۔'' دونوں وقت ملتے نہ چلاّ۔ہر وقت ٹٹکا اتار رہی ہے۔آنے جانے والوں سے پوچھ پوچھ دوا پلا رہی ہے۔۔۔۔کھانے کی کتنی شوقین تھی۔کچّے پکّے۔گلے سڑے، کھٹے میٹھے جیسے ہی آم مل جائیں بڑے مزے سے بیٹھ کر سب کھا جاتی تھی۔کچّے پکّے امرود، جھربیریاں،کیتھے اور کیا کیا سب شوق سے کھاتی مگر بچّوں کا کھانا اسے برا نہیں لگتا تھا۔وہ قصہ جو ہوا تھا کہ اماں کو کہیں سے گڑ کی بھیلی مل گئی۔اس نے طاق میں رکھ دی۔میں ادھر سے آؤں چرا کر ایک ٹکڑا منھ میں رکھ لوں۔شام کو ابا نے جو دیکھا تو ذرا سا گڑ تھا۔وہ لگے ڈکارنے۔''کون کھا گیا؟'' اماں سمجھ گئیں۔۔۔سہولت سے بولیں۔''چوہا کھا گیا ہوگا''۔۔۔۔۔''تو کھا گئی ہے تو کیا چوہے بلی گڑ کھاتے ہیں؟''اماں نے کہا''کیوں؟'' کیا ان میں جان نہیں ہے؟''میں نے جی میں کہا کہ دیکھو جب شہر سے کما کر لوٹوں گا تو گڑ کی ایک پاری بھی لاؤں گا۔تب تو یہی ابا چٹخارے ماریں گے۔''واہ کیا مجا ہے۔''جمیا اور شبراتن آنکھیں پھیلا پھیلا کر تکیں گی۔منھ سے پانی چھوٹے گا۔

گھر میں اب کون ہوگا؟ ابّا امّاں بھلا کیا زندہ ہوں گے؟ستّر اسّی برس کون جیتا ہے۔جمیا اور شبراتن کہیں بیاہ دی گئی ہوں گی۔ہاں فقیرا نوجوان ہوگا۔بھورے کے تو بیوی بچّے ہوں گے اور بکریاں؟ افّوہ کلّو کے

ناگنیں ہوں گی۔کلّو زندہ ہوتو پہچانے گی؟ جب بھوکی ہوتی تھی تو میری طرف دیکھ دیکھ کر کیسا میں میں کرتی۔

(۲)

سامنے گھر ہے کہ نہیں؟ بغیا سے باہر آتے ہی گھسیٹے کے دل نے دھڑک کر بڑی بے تابی سے پوچھا ۔۔۔۔وہ جگہ تھی وہ۔۔۔ہاں۔۔۔۔۔وہاں کچھ ہے تو ضرور۔

شروع تاریخوں کی اوس کی ماری بیمار چاندنی میں اندھیرے اجالے کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ایک دیوار تھی جس کا آدھا حصہ تو نیلے کی طرح ڈھیر جو کھڑا تھا۔اس پر ایک ٹوٹا پھوٹا چھپر تھا جس کا پھونس دھواں کھائے ہوئے مکڑی کے جالے کی طرح ہر طرف جھول رہا تھا۔چھپّر کے سامنے کی طرف چوحدّی کی جگہ جھانکڑوں، تاڑ کے پتوں اور کسی سوکھی بیل کا ملا جُلا ایک اڑم تھا جن کے پتلے پتلے ٹیڑھے میڑھے سائے کیچوؤں اور کھنکھجوروں کی طرح زمین پر بجا رہے تھے۔گھر اپنے سنّاٹے میں قبرستان تھا۔اندر نہ چولھا جل رہا تھا نہ چراغ۔گھر کی ایک ایک چیز پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ہم خود ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہیں۔۔۔۔۔تم کو کیا کھلائیں گے؟'' یہی گھر تھا جہاں مسافر کی تھکی ماندی آتما کو چین کی تلاش تھی۔گھسیٹے کی امیدوں کا چمن جسے وہ بائیس روز سے پچیس برسوں کے کچلے ارمانوں کے خون سے سینچ رہا تھا، اکبارگی مُرجھا گیا۔اس کا دل بار بار رشک دلاتا کہ یہ گھر خالی ہوگا۔وہ لوگ کہیں اور اُٹھ گئے ہوں گے، اور بار بار بکریں کے موت کی کراہند اور نادان کی سڑاہند جو بوجھل ہوا اس دبی ہوئی گھر کے گرد مقید تھیں، ان بالو کے گھروندوں کو ڈھا دیتیں۔گھسیٹے تک جہاں تہاں کھڑا رہا۔اس میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا یا کسی کو آواز دیتا۔

دور کہیں پر ایک پلّا رو رہا تھا۔رفتہ رفتہ اس کی آواز سے ایک طرح کی ڈھارس بندھی اور یہ کھکھارا، جواب نہ ملنے پر پھر کھکھارا، بار بار کھکھارنے پر کوئی دبے پاؤں باہر آیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا:

''اندر چلی آونا۔''

اس دھوکے سے گھسیٹے کی ہمت اور سکڑ گئی۔اب کی وہ سہارا لینے کو سچ مچ کھکھارا، پھر کہنے لگا:

''کون فقیرا؟''

''ہاں!''

فقیرا زرا چڑ کر بولا۔ ''تم کون ہو؟''

''ذرا ادھر آؤ۔''

فقیرا نکل کر قریب آیا اور بولا۔ ''تم کون ہو؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''زرا سنو تو بھائی، تم فقیرا ہو نا؟''

''ہاں۔۔۔۔۔کہہ تو دیا۔''

''تم یہیں رہتے ہو۔''

گھسیٹے کی آواز میں کچھ اتنا پیار تھا کہ فقیرا کا غصہ تو غائب ہو گیا، مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شخص کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ دوسری طرف گھسیٹے کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے کو کیسے پہچنوائے۔ اسے خیال تک نہ آیا تھا کہ اپنے گھر پہنچ کر یہ کام بھی کرنا ہوگا ۔ آخر دل کڑا کر کے بولا: ''میں بائیس روز کا سفر کر کے آ رہا ہوں۔۔۔۔تمہارے پاس۔''

اب بھی فقیرا کچھ نہیں سمجھا مگر بلا ارادہ اس کی زبان سے نکل گیا: ''تو اندر آؤ''۔

اندر آ کر گھسیٹے کی ہمت بندی اور ساتھ ہی راحت پانے کی امید بھی بلا وجہ ہریانے لگی۔ فقیرا نے دیا سلائی کھینچ کر چراغ جلایا۔ چھپّر کے نیچے سات بکریاں اور بکریوں کے بچّے بندھے تھے۔ انہیں سے شاید گھرانے کی روٹی چلتی تھی۔ زرا ادھر ہٹ کر زمین پر ایک چھیرھا ٹاٹ بچھا تھا جس پر ایک میلی سی چیز جو شاید کبھی رضائی ہو مگر چیتھڑا ہو کر گمنام ہو گئی تھی، اوڑھنے کے لئے پڑی تھی۔ گھسیٹے نے ٹاٹ پر بیٹھ کر کپکپاتے چراغ کی دھندلی روشنی میں فقیرا کو غور سے دیکھا۔ دُبلا پلا، آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں اور بے نور چہرے کی کھال جوتے کے چمڑے کی طرح کھُردری اور اس پر دونوں طرف دو لمبی لمبی جھریاں، جیسے کچی دیوار پر برکھا کے پانی کی لکیریں۔ بال کھچڑی جن میں سفیدی زیادہ۔ یہ تھا گھسیٹے کا جوان بھائی فقیرا! مصیبت زدہ گھسیٹے دیکھنے میں اس سے زیادہ جوان تھا۔

گھسیٹے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ''بھیا تم تو جوانی ہی میں بڑھائے گئے۔''

فقیرا ٹھنڈی سانس بھر کر بولا:

''جوانی تو کھلائی پلائی سے ٹھہرتی ہے۔''

''سچ ہے بھیا۔۔۔بھورا، جمیا اور شبراتن کہاں ہیں؟''

اب فقیرا اٹھٹکا۔''پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمک کون ہو۔۔۔گھسیٹے تو نہیں ہو۔''

''ہاں گھسیٹے ہوں اور کون۔ بائیس دن ٹھوکریں کھا کر آ رہا ہوں۔''

بھیا کہہ کر فقیرا اس سے لپٹ گیا۔ گھسیٹے نے بھی بھینچ کر اسے لپٹا لیا اور جیسے کوئی سوتا پھوٹ جائے ،اس کے آنسو ڈھل ڈھل بہنے لگے۔ فقیرا بھی رو دیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں روتے رہے۔ پھر فقیرا نے اپنے آنسو پونچھے اور گھسیٹے کو ڈھارس دلائی کہ ''اب نہ رو یہ تو خوشی کی بات ہے کہ تم گھر آ گئے۔۔۔۔اماں کو دیکھو گے؟'' گھسیٹے کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''اماں!۔۔۔۔۔ہے کیا؟''

''ہاں۔''

چھپّر کے ایک کونے میں چیتھڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ فقیرا اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا:''وہ پڑی ہے۔''

گھسیٹے محبت اور اشتیاق کے جوش میں ادھر بھاگا۔

یہاں چیتھڑوں کے انبار میں دفن ایک انسانی پنجر پڑا تھا جس پر مرجھائی ہوئی بدرنگ گندی کھال ڈھیلے کپڑوں کی طرح جھول رہی تھی۔ سر کے بال بیمار بکری کے دم کے نیچے کے بالوں کی طرح میل کچیل میں لتھڑ کو نمدے کی طرح جم گئے تھے۔ آنکھیں دھول میں سوندی کوڑیوں کی طرح بے رنگ اپنے ویران حلقو میں ڈگر ڈگر کر رہی تھیں۔ ان کے کوے کیچڑ اور آنسوؤں میں لت پت تھے۔ گال کی جگہ ایک پتلی سی کھالی رہ گئی تھی دانتوں کو غائب ہونے سے کئی تہوں میں ہو کر جبڑوں کے نیچے آ گئی تھی۔ گال کے اوپر کی ہڈیوں پر کچھ پھولا پن سا تھا، بدیا ورم! جیسے روتے روتے ورم آ گیا ہو۔ گردن اتنی سوکھی تھی کہ ایک ایک رگ نظر آ رہی تھی۔ ننگے سینے پر چھاتیاں لٹک رہی تھیں جیسے بھنچی ہوئی الٹی بنڈی کی خالی جیبیں۔ چہرے کی ایک ایک جھرّی سخت گھناؤنی مصیبتوں کی مہر تھی جسے دیکھ کر بے اختیار ڈھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا تھا۔

فقیرا چراغ لے کر آیا۔ روشنی دیکھتے ہی بڑھیا کچھ بکنے لگی اور داہنے ہاتھ کی انگلیون سے جھوٹ موٹ

کا نوالہ بنا کر اپنے منہ کی طرف بار بار لے جانے لگی۔ جیسے گونگا کھانے کو مانگے۔ بڑھیا نہ معلوم کیا کہہ رہی تھی مگر سننے میں صرف یہ آیا تھا۔ باب۔۔باب۔۔۔باب۔۔۔باب۔۔باب۔۔۔باب۔''

اس کی آواز ایسے ویرانی کے مارے گاؤں کی یاد تازہ کرتی تھی، جہاں کے رہنے والے آگ سے جل نہیں بھرتا۔ منہ سے نکل نکل پڑتا ہے، پھر بھی مانگے جاتی ہے۔''

آخر گھسیٹے بڑی کوشش سے بولا۔''اماں۔''

آواز بتا رہی تھی کہ اس کا دل اندر ہی اندر کرہ رہا تھا۔

فقیرا نے کہا۔''نہ وہ سنتی ہے نہ سمجھتی ہے۔ بس کھانے کی بات سمجھتی ہے۔''

بڑھیا کا پوپلا منہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا، باب کی آواز نکل رہی تھی، اور انگلیوں کا بنا ہوا نوالہ بار بار منہ کی طرف جا رہا تھا مگر اس حرکتوں پر بھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ پنجر زندہ ہے۔

یہ وہی چوڑی چکلی تندرست اماں تھی جو منہ اندھیرے سے دو پہر تک مسلسل چکی پیسا کرتی تھی! جسے دن رات یہی دھن سوار ہتی تھی کہ کسی طرح گھر کی حالت سنبھل جائے۔ اس نے کیسا کیسا اپنا جی مارا۔ زرا زرا سی چیز کے لئے کیسا کیسا ترستی رہی۔

گھسیٹے کے ماں کے لئے ترس بھرا پیار ابل پڑا جو ہاتھ پھیلا پھیلا کر یہ دعا مانگنے لگا کہ اے خدا اس کی مشکل آسان کر اور اب تو اسے ناپاک دنیا سے اٹھا لے۔ اگر اس وقت گھسیٹے کی آنکھیں رو دیتیں تو اسے سکون مل جاتا، مگر افسوس آنسوؤں جیسی نعمت کوسوں دور تھی۔

فقرا کے لئے اس نظارے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس نے کہا۔۔۔۔۔''بھیا! تم زرا ہاتھ منہ دھولو۔ میں کھانے پینے کا کچھ سیتا کروں۔''

فقیرا بھاگتا ہوا بغیا کے اس پار جوگیوں کے گھر سے آدھ سیر جوار کا آٹا ادھار مانگ لایا اور پھر چولھا جلا کر روٹیاں پکانے بیٹھ گیا۔ گھسیٹے بھی چولھے کے پاس آ بیٹھا اور بولا:''اتنا آٹا؟ کیا تم نے ابھی نہیں کھایا۔؟''

''نہیں، آج آٹا ختم ہو گیا تھا تو میں نے کہا کے ایک رات یوں ہی سہی۔''

''اب کھیتی نہیں ہوتی۔؟''

''وہ کب کی بند ہوگئی۔ ابا کے مرنے کے بعد بھورے کو جیل ہوگئی۔ میں اکیلا رہ گیا۔ دو برس تک ترکاریاں بوئیں مگر وہ بکیں بکاتیں نہیں۔ لگان تک نہیں ادا ہوا۔''

''بھورے کا ہے میں پکڑا گیا؟''

''سونی چند کی ایک بکری بیچ لی تھی۔ پھر جب جیل سے چھوٹ کر یہاں آیا تو اس کی بیوی دوسرے کے گھر بیٹھ چکی تھی۔ یہ فوجداری کرنے پر تیار ہوگیا۔ مگر اس کی طرف سے کوئی کاہے کو کھڑا ہوتا؟ دو مہینے سب کو گالیاں دیتا رہا۔ پھر ایک رات کہنے لگا۔ ''فقیرا! مجھ سے تو اب تیری طرح نہ بھوکوں مرا جائے گا اور نہ اس کا گاؤں میں رہا جائے گا۔ بلا سے جیل ہو جائے چار دن عیس تو کر لیں گے۔۔۔۔۔ دوسرے دن منہ اندھیرے کہیں نکل گیا۔۔۔۔۔ بانکے کہتا تھا کہ اب پھر جیل پہنچ گیا ہے۔''

''جمیا اور شبراتن کہاں ہیں؟''

جمیا حرام زادی کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ شبراتن کا دس کوس پر تکیہ والوں میں بیاہ ہوگیا ہے۔ ایک باغ ہے کسی طرح گذر بسر ہو جاتی ہے۔ مگر کبھی ماں کو نہیں پوچھتی۔''

زرا دیر خاموشی رہی۔ پھر فقیرا روٹی کے کناروں کو انگاروں پر سینکتے ہوئے بولا: ''تمہارے جانے کے بعد بھیا وہ آفتیں آئیں۔ سب گھر مٹ گیا۔ وہ بھی کیا جمانا تھا ابا کہا کرتے تھے کہ ''یہ سب پلّے پیٹ بھرے میں پیٹ بھرے۔'' سچ کہتے تھے۔ اس زمانے میں تو کوئی رات ایسی نہیں گذری، جب چولھا نہ جلا ہو۔''

گھسیٹے لمبی سی ٹھنڈی سانس بھر کر چت ہوگیا اور لپکتے کوئلوں کی طرف تکنے لگا جیسے ان میں پرانے دنوں کو ڈھونڈ رہا ہو۔

فقیرا نے اس سنّاٹے کو توڑا۔ ''کہاں کہاں رہے گھسیٹے؟''

ہم کلکتہ جا کر ایسے پھنسے کہ خط پتّر کو بھی چار پیسے نہ بچے۔ گھر یاد کر کر کے کتنی بار رونا آیا۔ بڑی کٹھن گذری وہاں، لموں کی خاک چھانی، امید واری میں کام کیا، بھوت گھر میں روئی ڈھوئی، ہفتوں قبض رہتا رتھا، چار سال رکشا چلائی، پھر خونچہ لگایا۔ ارے فقیرا بڑا کٹھن ہے کلکتہ میں رہنا۔ جس کے دو چار جاننے والے ہوں اور جس کے پاس لینے دینے کو زرا پیسہ ہو اس کے لئے تو وہاں سب کچھ ہے لیکن ایسے دلسیوں کو تو کوئی

پوچھتا ہی نہیں۔ وہاں تو روئے رلائی نہیں نہیں آتی تھی۔ مرنے کی دعا نگا کرتے تھے۔

فقیرا نے لال لال روٹی کپڑے پر رکھ دی اور دونوں ٹکڑے توڑ توڑ کر کھانے لگے۔

فقیرا بولا: ''بھیا ذرا چپکے چپکے کھاؤ، اماں سن لے گی تو چلّا چلّا کر رات بھر سونے دے گی۔''

گھسیٹے نے شک اور حیرت سے فقیرا کی طرف دیکھا۔ ''تم تو کہتے ہو وہ بالکل نہیں سنتی۔''

''ہاں، مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ کھانا کھانے کی آواز سن لیتی ہے اور کھانے کی بو بھی پا لیتی ہے، اور پھر باب، باب کرنے لگتی ہے۔

گھسیٹے بجھتے انگاروں کی طرح تکنے لگا۔ اس کا حلق اتنا سوکھ گیا کہ منھ کا نوالا بلا پانی کے گھونٹ کے نہ اتار سکا۔

(۳)

گھسیٹے گھر کے دوارے ہونٹوں پر بکری کا مسکا ملے، دھوپ میں ننگے بدن بیٹھا، اپنے میلے کرتے کے چلوے چن رہا تھا۔ کئی روز سے ہاتھوں، پیروں اور ہونٹوں کو چٹخا دینے والی سرد ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے جن میں سیکڑوں میل کا گرد وغبار بھرا تھا جو ناک اور حلق میں گھس رہا تھا۔ کھیتوں کے پودے اور درخت ہوا کی چوٹ کھا کر جھک جاتے تھے اور بے کسی سے اپنے پتّے بھر پھڑاتے تھے جیسے ہوا سے فریاد کر رہے ہوں کہ اب تو للہ جان چھوڑ دے۔ کھیتوں میں کسان اپنی چادروں کو بدن پر سمیٹے، ہاتھ پاؤں سکیڑے کندھوں کو آگے جھکائے سو سو کر رہے تھے۔ ہر جگہ اتنی اجاڑ اجاڑ تھی اور ہر چیز اتنی دکھ بھری کہ بے اختیار جی گھبرا گھبرا کر کہتا تھا کہ چلو کہیں بھاگ چلیں۔

گھسیٹے دھوپ میں بیٹھا کانپ رہا تھا اور کلکتہ کو یاد کر رہا تھا۔ آنے کے دوسرے ہی دن وہ ٹوٹے پھوٹے ویران چھپّر بکریوں کے موت کی کھراہند اور اپنی ماں کی باب، باب سے گھبرا گیا تھا۔ دن بھر بھوک بہلانا اور بکریاں چرانا اور رات کو برّے کی روکھی سوکھی روٹی اور کبھی کبھی تو رات کو بھی فاقہ۔ پھر یہاں کی سردی! افوہ! بدن ہے کہ کٹا جاتا ہے۔ اوڑھنے کو کھویا پہننے کو دو آدمیوں کے بیچ میں ایک، سب سے بڑے کوفت یہ کہ جوانی کے پچیس سال کلکتہ میں گنوانے کے بعد گھسیٹے کو یہاں کی کسی چیز سے اب لطف نہ آتا تھا۔ چوپال کی باتیں

روکھی پھیکی۔گاؤں کی عورتوں میں شرم اور کھچاؤ۔پھر جس سفید پوش کو دیکھو تھانے دار کی طرح اکڑ دکھاتا ہے اور فقیرا؟ وہ تو بات بات میں باپ بنتا ہے۔سب مصیبتوں سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ پیسہ کمانے کا کوئی راستہ نہیں،دمڑی دمڑی کے لئے فقیرا کی محتاجی۔ ہر بات میں اس کا دست نگر رہنا۔

گھسیٹے چلوے مار رہا تھا اور کلکتہ سے آنے پر پچھتا رہا تھا۔وہ دکانوں کے تختوں پر رات کاٹنا،وہ سڑکوں پر جوڑوں میں برف کی سلی اور گرمیوں میں دہکتا ہوا توا ہوئی تھیں،خچّر کی طرح رکشا لے کر دوڑنا۔وہ کبھی کبھی تین تین فاقے کر لینا۔گھر کی اس زندگی سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔وہ کلکتہ کی ایک پیسہ والی سنگل چای۔وہ دھیلے والا پان کی پچیس بیڑیاں! یہ وہ نعمتیں تھیں جن کے لئے وہ یہاں ترس گیا تھا۔

گھسیٹے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دور تک پھیلے ہوئے مٹر کے کھیتوں کے طرف دیکھا۔میری زندگی بھی کیا زندگی رہی ہے۔پندرہ سولہ برس کے سن تک باپ کے ججمانوں کی مار کھائی۔کھانے پینے کو ترستے رہے،پھر ہمت کر کے کمانے کھانے کے لئے شہر بھاگے،وہاں مہینوں ٹھوکریں کھائیں۔کہا چلو کلکتہ چلو ،وہاں پہنچتے ہی اچھی سی نوکری مل جائے گی اور سب پاپ کٹ جائے گا،کلکتہ کے پچیس برس! افوہ! کوئی کوشش ”نہیں رکھی،رکشا تک چلائی،سیٹھ جی نے کہا کہ گاڑی لینا ہے تو،جمانتی لاؤ۔میں کسے لاتا؟ جو وہاں کے رہنے والے تھے ایک دوسرے کو جانتے تھے،گھرانے گھرانے رہتے تھے،جمانتی لے آتے تھے۔چھمن بولا۔ دو آنے روز دو تو کلوٹا مہاجن جمانتی ہو جائے گا۔دو آنے روز اسے دئے،پھر بھی سالے سیٹھ نے ٹوٹی پھوٹی گاڑی دی۔اسے دور ہی سے دیکھ کر لوگ دور ہٹ جاتے تھے۔جب سیٹھ سے خوشامد کرو کہ ایک اچھی گاڑی دے دو تو وہ اکڑ کر کہتا تھا کچھ روپیہ جمع کراؤ نا۔روپیہ بچتا تو کیسے بچتا؟ آمدنی بھر تو کلوٹا کھا جاتا تھا۔چار سال دوڑے مگر رہے وہی موچی کے موچی۔بخار جو آیا تو کسی طرح گیا ہی نہیں۔اسپتال میں پڑے پڑے مہینوں بیت گئی،اچھے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا۔اب خبردار رکشا نہ چلانا اور نہ زیادہ محنت کا کام کرنا۔پھر دو روپیہ قرض ادھار کر کے پان سگریٹ،دیا سلائی کا خونچہ لگایا۔اب جو آتا کہتا سیزر لاؤ،نیبی کٹ لاؤ،یہ لاؤ وہ لاؤ،یہاں کیا تھا؟ کہتے ”نہیں ہے صاحب،نہیں ہے ہجور۔“ وہ بھی تماشا کچھ دنوں رہا،نہ بٹھینے کو اچھی جگہ تھی نہ اچھا سامان تھا۔اس پر جو کچھ بھی آیا حرام زادی بھنگوئی کھا گئی۔۔۔۔۔نہ جانے مجھ سالے کو عورت رکھنے کی کیا

پڑی تھی۔۔۔۔۔لنگوٹی میں پھاگ۔۔۔۔۔

گھسیٹے کو اپنے او پر سخت غصہ آیا اور اپنے کو خوب گالیاں دینے لگا۔ اتنے میں فقرا سامنے سے آیا اور آتے ہی کڑے پن سے بولا۔۔۔۔۔''پھرتم نے چرا کر دودھ بیچ لیا۔ اب ہمارا تمہارا گذر نہیں ہوسکتا۔ جہا ل جانا چاہو چلے جاؤ۔''

گھسیٹے نے جواب دیا۔''کیسی چوری؟ کچھ پاگل ہوگیا ہے تو؟ روز کا یہی قصہ، روز کا یہی قصہ، بڑا آیا ہے گھر سے نکالنے والا۔

جیسے گھر میں میرا حصہ ہی نہیں اور بکریوں میں میرا حصہ ہی نہیں۔''

''گھر میں حصہ، بکریوں میں حصہ، تو حصہ بٹائے گا؟ کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا۔ پچیس سال کلکتہ میں گنوا کر ہماری جان کو آیا ہے، گیا تھا روپیہ کمانے!''

گھسیٹے گرم ہوکر بولا۔''کلکتہ میں کمانا کچھ آسان ہے؟ تو خود تو زندگی بھر قصبہ سے باہر نہیں گیا اور چلا ہے کلکتہ کی کمائی کی باتیں کرنے۔ وہاں وہ کماتا ہے جس کے دس جاننے والے ہوں جو اس کے لئے تکڑم لگائیں۔ وہ کماتا ہے جس کے پاس روپیہ ہو کہ کچھ کھو کر سیکھے۔ کام کچھ دنوں کے بعد آتا ہے کہ آپ ہی آپ؟''

فقیرا نے طعن سے کہا:''ہاں جو یہاں سے جاتے ہیں روپے کے ڈھیر تو لے جاتے ہی ہیں۔ بلّی جو اتنا روپیہ لایا ہے تو کیسے لایا ہے؟''

اب تو گھسیٹے تلملا گیا۔ وہ سب کچھ سن سکتا تھا مگر یہ کہ اس نے کلکتہ میں رہ کر کچھ نہیں کیا بالکل ہی نہیں سن سکتا تھا۔ وہ چلا کر بولا:

''اور تو نے کیا کر لیا ہے چوٹا کہیں کا۔ ان بکریوں میں، اس گھر میں کیا میرا حصہ نہیں تھا؟ سب کا سب بیچ کر کھا گیا۔ لا میرا حصہ دے۔ میں آج ہی اس منحوس گاؤں سے جاتا ہوں۔ بے ایمان کہیں کا۔۔۔۔۔''

گھسیٹے سے بن نہیں پڑتا تھا کہ اپنا سر پھوڑ ڈالے یا جان نکال کر رکھ دے۔ کیا کرے جو فقیرا کو یقین دلا دے کہ کلکتے میں میں نے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔

کچھ یوں ہی تو تو میں میں ہوتی رہی۔ پھر فقیرا بڑ بڑا تا ہوا اندر چلا گیا۔ دیر تک وہ اندر سے اور یہ باہر سے بڑ بڑاتے رہے۔

یہ قصہ آج کچھ نیا نہیں تھا بلکہ پورے چار مہینے سے ہو رہا تھا۔ روز یہی جھگڑا اٹھتا، روز یہی باتیں ہوتیں اور روز دونوں اسی طرح بڑ بڑا بڑ بڑا کر چپ ہو جاتے۔

رات جب روکھی روٹی کھا کر گھسیٹے بستر پر بیٹھ کر حقہ گڑ گڑانے لگا تو پھر ایک ٹھنڈا سانس کے ساتھ کلکتہ کی یاد آئی اور سوچنے لگا کہ شاید اب میں ہمیشہ کے لئے اس اجاڑ گاؤں دفن ہو گیا۔ اب باقی زندگی اسی طرح بنا تا ہے۔ کاش ایک بار صرف ایک بار میری پاس کچھ پیسہ آ جاتا جو میں کچھ دنوں اپنی تھکی ماندی آتما کو سکھ دے لیتا۔ چالیس برس کی تھکی ماندی آتما! میں یہ نہیں کہتا کہ بڑا سا گھر ہو، دوارے بھنس بندھی ہو، کٹھیوں میں اناج بھرا ہو۔ گھر والی ہو جو ساری کے پلّو سے تھالی صاف کرے، اس میں دال بھات لا کر سامنے رکھ دے، اس کے پاؤں میں موٹے موٹے کڑے پڑے ہوں جو بدھی کی طرح آڑے آڑے ایک طرف جھکے ہوں جیسے شرمائی سالی کا سر۔ بس مجھے تو بس اتنا مل جائے کہ اپنا ایک الگ چھپّر ہو، دونوں وقت اپنی روکھی سوکھی ہو۔ بس ارے ہاں اپنے پاس کچھ تو ہو۔ اب کہاں گھر والی کی خواہش اور کہاں بچوں کا ارمان۔ چالیس کا سن ہونے کو آیا۔۔۔۔۔

سِن کا خیال آتے ہی دل میں ایک تیز ہوک اٹھی کہ اب دو چار برس جوانی اور ہے پھر اندھیرا پا کھ۔ جانے کب موت آ جائے۔

ایک زبردست امنگ اٹھی کہ جیسے بنے ایک بار اور ہاتھ پاؤں مارو۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے فقیرا کو پکارا۔ ''بھیا فقیرا۔۔۔!''

فقیرا پیار کی پکار سن کر فوراً پاس آ گیا۔ جب وہ آرام سے بیٹھ گیا۔ اور حقہ کا ایک دم لے چکا تو گھسیٹے بولا: ''میں یہ کب کہتا ہوں کہ میں کچھ کروں گا ہی نہیں۔ مگر کوئی کام بھی تو ایسا ہو کہ جس سے کچھ ملے۔ ارے بھیا تم کہتے ہو کہ کلکتہ میں میں نے پچیس برس بھاڑ جھونکا، مگر میں کہتا ہوں کہ میں کم سے کم اتنا تو سیکھ ہی گیا ہوں کہ کون کام چل سکتا ہے اور کون نہیں۔ تم کہتے ہو پھیری لگائیں، یہ کریں وہ کریں، سچ کہتا ہوں کہ ان میں

کچھ نہیں دھرا ہے۔ پیسے والوں کے سامنے کون اپنا روزگار جما سکتا ہے۔؟''

گھسیٹے یہ کہہ کر اس طرح خاموش ہو گیا جیسے ابھی بات نہیں ہوئی۔ پھر فقیرا کی طرف دیکھ کر بولا۔''اگر کچھ مل سکتا ہے تو اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں۔ مگر جو ہم کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔وہ تو مانتے ہی نہیں۔۔۔۔۔اس میں تمہارا بھی بھلا، ہمارا بھی بھلا۔ کون جانے گا کہ ہم کیسے کماتے ہیں؟ اور جان بھی گیا تو کیا؟ جب ہمارے پاس پیسے ہوں گے تو سب ہماری برائی کو بھی اچھائی کہیں گے۔ جوگیوں کو دیکھو ان کے گھر ہن برس رہا ہے سن کہنے کو ہم شریف اور وہ رذیل۔ مگر کون کس کی خوشامد کرتا ہے؟ ہم ہی ہے جو آئے دن دوڑے جاتے ہیں کہ اچھے منگلو سیر بھر آٹا ادھار دے دو، ذرا سی تمبا کو دے دو۔ وہ ٹال مٹول بھی کوتے ہیں، دھتکار بھی دیتے ہیں، مگر ہم پھر جاتے ہیں نہ جائیں تو کریں کیا؟''

فقیرا بیٹھا چپ چاپ سنتا رہا، گھسیٹے دم لے کر پھر کہنے لگا:''اور ہم تو کہتے ہیں کہ سب ہم کو چھوڑ بھی دیں تو کیا؟ کیا کوئی لڑکا لڑکی بیاہنے کو بیٹھے ہیں ہم؟ ہم دونوں چین سے الگ ہی رہ لیں گے۔''

گھسیٹے نے اکدم سے کچھ یاد کر کے فقیرا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر کہا:

''ہاں تمہارا سا دی بیاہ کرنا ہے، روپیہ دیکھ کر سب ہی لڑکی دینے کو راضی ہو جاتے ہیں اور نہیں تو پھر اپنی برادری میں نہ سہی کسی اور میں یہی۔۔ارے ہاں! اس طرح تو کہیں بھی نہیں کر سکتے اور پھر یہ اماں کے لئے بھی اچھا ہے۔ جب پیسے ہوں گے تو ان کو بھی خوب کھانے کو ملے گا۔''

فقیرا اب بھی کچھ نہیں بولا۔ اس سے پہلے بھی گھسیٹے کئی بار یہی باتیں کر چکا تھا۔ مگر اب انہیں سن کر فقیرا کو غصہ آ گیا تھا۔ روپیہ کے لئے کہیں شرافت بیچی جاتی ہے۔؟ روپیہ ہے کیا؟ ہاتھ کا میل، آج آیا تو کل گیا اور شرافت وہ دھن ہے جو پیڑ ھیوں چلتا ہے اور خرچ نہیں ہوتا ہے۔ شریف پھول کا برتن ہے جتنا بھی کیچڑ میں سوند جائے، جب بھی مانجھو چم چم کرنے لگتا ہے اور جہاں شرافت گئی پھر آدمی مٹی ہو جاتا ہے مٹی۔ مانا جوگیوں کے پاس روپیہ، روپیہ ہے، گھر گرہستی ہے، ہم ہی اس کی خوشامد کرتے ہیں وہ نہیں کرتے، ہم ہی ان سے روٹی ادھار مانگتے ہیں، وہ نہیں۔ مگر اس سے کیا؟ ہاتھی لاکھ لٹ جائے پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔۔اور وہ مکھیا کے گھر جائیں تو ہم چبوترے پر بیٹھیں گے اور وہ دور زمین پر۔

فقیرا پانچ برس کا تھا جب گھسیٹے روپیہ کمانے شہر بھاگ گیا تھا، تب سے اس کے دل میں بھی کمانے کی تمنا پیدا ہو گئی تھی ۔لیکن جیسے جیسے دن بیتتے گئے اور گھسیٹے روپیہ کا گٹھر لے کر نہیں لوٹا ، اس کو خواہش مرتی گئی ۔غریبوں کو کہاں پیسہ ملتا ہے ۔ پیسہ ملتا ہے ۔ پیسہ مل جاتا تو کوئی غریب ہی کیوں رہتا؟ اس جیون میں بس یہی ہے کہ اپنا دوزخ پاٹ لو اور موقع ملے تو کسی سے ہنسی ، دل لگی کر لو، اور کیا دھرا ہے؟ بھورے کا حشر دیکھ کر تو رہی سہی ۔آس بھی گہری نیند سو گئی ۔لیکن اب جو گھسیٹے روزانہ شام کو، جب یہ دونوں کام کاج سے فارغ ہو کر بیٹھتے ، آس جگانے کا یہ منتر اسی موہنی سے پڑھتا رہا تو رفتہ رفتہ فقیرا کی سوئی ہوئی آس چونکی ، الگڑائی لے کر اٹھی اور پر پردے نکالنے لگی ۔ وہی فقیرا جسے کل تک کی کوئی فکر نہ تھی ، آج جو مایا کے مندر کی راہ سوجھائی دیک تو لگا کچھ اور ہی سپنے دیکھنے ، ذرا یہ چھپّر بدل جاتا ، تھوڑی سی بکریاں اور ہو جاتیں اور ذرا چار پانچ روپے اکٹھے ہو جاتے تو پھر ہمارا گھر بس جاتا ۔ارے ہاں اب گھر نہ بسا تو پھر کب بسے گا ، وہ رمضانی کی بیوہ ، آنکھ ملاؤ تو کیسا ہنستی ہے ۔اس سے آج کہو تو آج گھر بیٹھ جائے ، کیسا گدرایا بدن ہے ۔ جیسے پکّا آم ۔ کیسا ٹھمک ٹھمک چلتی ہے ! اور کتنی محنتی ہے وہ ۔ دودھ وہ دوہے ، اوپلے وہ تھاپے ، دہی وہ متھے ، اکیلی جھوؤں پانس اٹھا اٹھا کر کھیتوں میں وہ ڈالے ، کیا عورت ہے ! میں نے دیر کی تو کوئی اور اپنے گھر بٹھالے گا پھر میں منھ تکتا رہ جاؤں گا ۔

جس دن سے فقیرا کے دل میں یہ خیالتا گونجنے لگے ، وہ رمضانی کی بیوہ سے کنائی کاٹنے لگا ۔ ادھر وہ سامنے دیکھائی دیتی اور یہ راہ کترا کر نکل جاتا ۔ پندرہ بیس روز یوہی کٹ گئے ۔ ایک دن یہ لکڑی چیر رہا تھا کہ وہ اکبارگی پیچھے سے آ گئی ۔ اسے بھاگتے نہ بنی ، کچھ باتیں ہوئیں ، کچھ ہنسی دل لگی ہوئی پھر وہی جس کا فقیرا کو دھڑکا تھا یعنی اسی سن اس نے گھسیٹے کی بات مان لی ۔

(۴)

ابھی پہر رات باقی تھی کہ گھسیٹے نے فقیرا کو جگایا ۔ دونوں تاروں کی مدھم روشنی میں اٹھے اور ایک ٹوکرے کونس سے لٹکا کر ایک ڈولی سی بنالی اور اس میں خوب سا پیال بھر دیا اور پھر بڑھیا کے پاس گئے ۔ گھسیٹے نے ایک ہاتھ گلے میں اور ایک کمر میں ڈال کر اس کو چھپکلی کی طرح اٹھالیا ۔ آنکھ کا کھلنا تھا کہ وہ لگی باب ، باب ، باب کر کے اشارے سے کھانا مانگنے ۔ گھسیٹے نے پہلی بار اسے چھوا تھا ۔ اسے ایک عجیب اذیّت ہوئی جس سے

اس کا چہرہ عجب ہونّق ہو گیا۔ایک طرف تو آنکھوں میں آنسو آرہے تھے اور دوسری طرف بدن کے روئیں کھڑے ہو گئے تھے۔

گھسیٹے نے اسے لے جا کر آہستہ سے جیسے کوئی شیشے کا برتن ہو،ٹوکرے میں رکھ دیا اور پھر اسے چیتھڑوں میں چھپا دیا۔

ایک طرف کا بانس فقیرا نے تھاما اور دوسری طرف کا گھسیٹے نے اور دونوں گھر کے باہر چلے۔بکریاں اس لوگوں کو جاتے دیکھ کر بے کسی سے میں میں کرنے لگیں۔جیسے ہی لوگ اس کو ہمیشہ کے لئے بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے ہوں۔

جب یہ دونوں رات کے کالے کالے پردوں کی اوٹ میں منھ چھپائے ہوئے گاؤں کے نکڑ پر آ گئے تو پو پھٹی اور نسیم اٹھلا اٹھلا کر چلنے لگی۔یہ خوش تھے کے چلو ہم نظروں سے بچ کر نکل آئے کہ اچانک ایک طرف سے ایک کسان کندھے پر ہل رکھے نکل پڑا اور پہچان کر پوچھنے لگا۔''کہاں چلے فقیرا؟''

ہوا کا ٹھنڈا جھونکا فقیرا کے کلیجے کو برماتا نکل گیا۔اس کے کندھے کا بانس کانپا۔کسی وجہ گھسیٹے گھبرا کر فقیرا کی جگہ خود بول اٹھا:''شبراتن کا حال خراب ہے۔اماں کو لئے وہاں جا رہے ہیں۔''

''اماں کو لئے؟''کسان اتنا متاثر ہوا کے بے اختیار کہہ اٹھا۔

''شاباش تم لوگوں کو۔۔۔۔۔۔اپنی مہتاری کی اتنی سیوا کرتے ہو!''

شہر کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کا خطبہ شروع ہو چکا تھا،اس وقت فقیرا اور گھسیٹے نے مسجد سے ذرا ہٹ کر،ایک گلی میں آ کر ڈولی رکھی گھسیٹے نے بڑھیا کو جو کنڈلی مارے ٹوکرے میں سو رہی تھی،اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور پھر اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ کو ٹوکرے میں دو چیتھڑے باندھ کر اس پر رکھ دیا۔یہ احتیاط تھی اس بات کی کے کہیں ایسا نہ ہو کہ باب با کرتے وقت کہیں ہاتھ بجائے منھ کی طرف آنے کے کانپ کر کسی اور طرف نکل جائے۔مگر احتیاط فضول تھی کیونکہ دس برس سے اس ہاتھ کا صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ منھ کی طرف جا جا کر اشارے سے کھانا مانگا کرے۔اب سوائے ادھر کے اور کسی طرف جانے کی سکت ہی نہ تھی۔

بڑھیا جاگ پڑی مگر وہ ہچکولے کھاتے کھاتے اور رات رہے سے اس وقت تک باب باب کرتے

کرتے اتنی تھک گئی تھی کہ بلا چلاّ ئے اور کھا نا مانگے ، جیسے بٹھائی گئی تھی ویسی ہی بیٹھی رہی ۔ یہ تو بری رہی۔ساری کی کرائی پر پانی پھرا جا تا تھا،ضرورت ایجاد کی ماں ہے،فوراً گھسیٹے نے لپک کرسامنے کی حلوائی کی دکان سے ایک پیسہ کا جلیبیوں کا شیرا مانگا۔اس نے تھال پر چمٹی ہوئی بھڑوں اور بھنکتی ہوئی ۔مکھوں کواڑا کر تھال ایک طرف جھکا دیا اور جتنا شیرا بہہ آیا اُسے انگلی سے پونچھ پانچھ کرایک پتہ پر ٹیکا کرگھسیٹے کوتھما دیا۔اس نے لاکر شیرے کی ایک انگلی بڑھیا کو چٹا دی۔اس کا چٹاتھا کہ وہ فوراً باب باب کرکےاور مانگنے لگی۔

چلوعمل کامیاب رہا۔ بڑھیا کی کوک ہاتھ آ گئی۔گھسیٹے نے پتہ فقیرے کو پکڑا کر ہدایت کی کہ موقع پر بڑھیا کوایک انگلی چٹا دینا۔فقیرا زندگی میں تیسری بار شہر آیا تھا۔ یہاں کی گہما گہمی ،بھیڑ بھاڑ اور بڑی دکانوں سے وہ بھونچکا ہو گیا،عقل چندھیا گئی تھی اس کے برخلاف شہر کی ہوا لگتے ہی گھسیٹے کی ہر بات میں خوداعتمادی آ گئی تھی ۔گھسیٹے مشاق پیراک کی طرح تھا جو دریا میں اترتے ہی جھلیں کرنے لگتا ہےاور فقیرا نوسکھئے کی طرح جو پانی دیکھ دیکھ کرسہما جاتا ہے،گھسیٹے فقیرے کوحکم دے رہا تھااور وہ کل کی طرح اس کے اشاروں پر چل رہا تھا۔

دونوں ڈولی لے کر مسجد کے سامنے آئے ۔خدا کے گھر کے سامنے انسانی کوڑے کا ڈھیر لگا تھا۔کٹی انگلیاں اور بیٹھی ناک والے کوڑھی منمنا کر ڈراؤنی آواز میں بولنے ولی آتشکی بڑھیاں، چندے چپڑے بچے جن کے ہاتھ پاؤں سوکھے اور پیٹ بڑھے ہوئے تھے، جو نہ جانے کیوں مسلسل ریں ریں کررہے تھے، پھیکے، بے حیا دیدوں والی جوان عورتیں جن کے سر پر جوڑوں کا جنگل اور بدن پر میل کی کہگل ،چیتھڑے، ٹھیکرے، میل، آخور،بلغم ،ناکی ، پیپ،مکھیاں، جراثیم ،فریب، جھوٹ اوران سب کوڈھانک دینے والی،لوریاں دے دے کر،تھپک تھپک کرسلا دینے والی مہا پاپن بےحسی ۔!

۔۔۔۔اس سمندر میں گھسیٹے اور فقیرا نے بھی ماں کی ڈولی لے کرغوطہ مارا۔میل کچیل ہوا چاہے ذلت ہو، حیوانیت ہو، چاہے انسانیت ہو۔ مایا کے مندر کو یہی راستہ جاتا ہے۔ اس وقت جب کہ سب دروازے بند ہو چکے ہیں ۔صاف اور سیدھا راستہ،تنہا راستہ، پھوٹی آنکھ کا دیدہ۔

ڈولی رکھی ہی تھی کہ پاس کے ایک بڈھے فقیر نے ماں کی گالی دے کر کہا:’’ابے ادھر کہاں آیا ؟ بھاگ یہاں سے۔‘‘

پھر تو آس پاس کے سب فقیر گالیاں دینے اور غُل مچانے لگے۔ کیونکہ ان کی ڈولی دیکھ کر ہر ایک کو اپنی روزی کی پڑ گئی۔ فقیرا کی تو یہ ہنگامہ دیکھ کر جان ہی نکل گئی۔ اس نے جھٹ ڈولی کا ڈنڈا کاندھے پر رکھ وہاں سے ٹلنا چاہا مگر گھسیٹے نے دیکھا کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے اگر دبا تو پھر اس برادری میں گھس چکا۔ اس نے دو چار ماں بہن کی سُنا کر کہا: ''تمہارے باپ کی زمین ہے۔ چپ رہو، ورنہ سب کے سر پھوڑ دوں گا۔''

ڈانٹ سُنتے ہی فقیر تو زرا زرا بڑبڑا کر چُپ ہو گئے مگر بڑھیاں اسی طرح کائیں کائیں کرتی رہیں۔ آخر ایک نمازی نے جو جماعت کے لالچ میں دوڑا جا رہا تھا، ان کو ڈانٹا: ''چپ رہو بدنصیبوں نماز ہو رہی ہے۔''

نماز کا خیال سے یا ڈانٹ کے ڈر سے، کسی نہ کسی وجہ سے خاموشی ہو گئی۔ اگر کوئی بات نہ ہوتی تو بھی خاموشی ہو جاتی۔ کیونکہ اس سے زیادہ احتجاج کرنے کا بوتا ان لوگوں میں تھا ہی نہیں اور دوسرے گھسیٹے بھی اب جگہ پر پورا پا چکا تھا۔

ابھی نمازی نکلنا نہیں شروع ہوئے تھے۔ لیکن وہاں کی فضا سے فقیرا ایسا متاثر ہوا کہ اس نے بے سمجھے بوجھے بڑھیان کو ایک انگلی شیرا چٹا دیا۔ شیرا لگتے ہی گراموفون کے ریکارڈ کی طرح وہ بجنے لگی اور مشین کی طرح اُس کے جبڑے اور ہاتھ چلنے لگے۔ اسے دیکھ کر ایک دو برس کے بچے نے جسے ایک شخص پھونک ڈلوانے کو لایا تھا، گود مین سہم کر زور سے چیخ ماری اور بسورنے لگا۔ ایک جواب اینگلو انڈین لڑکی ہاتھ میں بٹوا لئے ادھر سے گذر رہی تھی۔ اس نے جو بڑھیا کو دیکھا تو ایک بار سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ جیسے ایسا ہی بھیانک بڑھاپا اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اس نے بے تحاشا دو پیسے نکال کر بڑھیا کے آگے پھینک دیے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بوڑھے کتّے کے سامنے رنوالہ پھینک دیتا ہے کہ وہ ہمیں بھول کر اس میں جٹ جائے۔ پیسے بڑھیا کے سامنے لگے ہوئے چیتھڑوں کے انبار مین ڈوب کر غائب ہو گئے، اب گھسیٹے کو اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ بھیک کوئی اس کے ہاتھ میں تھوڑی دے گا، دے گا بڑھیا کو، اس کے سامنے کوئی چادر ہونی چاہئے جس پر آ کر پیسے گریں۔ گھسیٹے نے جلدی سے اپنا انگوچھا بڑھیا کی گود میں پھیلا دیا۔

نماز ختم ہوئی اور نمازی غول کے غول باہر نکلنے لگے۔ فقیروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ بھوکا ہوں

بابا، بھوکا ہوں بابا، ایک فقیرنی گھگھیانے لگی جیسے کوئی نئی نویلی بیوہ سسکیاں بھرتی ہو۔ ایک لنگڑا فقیر حلق پھاڑ پھاڑ کر آوازیں لگانے لگا۔ ''جب دے گا اللہ ہی دے گا۔'' فقیرا بھیڑ بھاڑ، دھکم دھکّا اور شور ہنگامے سے ایسا بھونچکا ہوا کہ منھ پھیلا کر ایک طرف تکنے لگا اور شیرا چٹانا بھول گیا۔ گھسیٹے نے چلاّ چلاّ کر اسے کئی بار حکم دیا مگر جب دیکھا کہ اس کے حواس بالکل غائب ہیں تو جلدی سے پتہ چھین کر خود ہی چٹا دیا۔ شیرے کا لگنا تھا کہ مشین پھر تیزی سے چلنے لگی۔ مگر پھر بھی لوگ ادھر متوجہ نہیں ہوئے۔ گھسیٹے نے فوراً محسوس کیا کہ کیا کمی ہے۔ پہلے سے اس نے کوئی صدا تو سوچی نہیں تھی۔ جلدی مین اس کے منھ سے نکلا۔ ''اللہ ہر آفت سے بچائے۔'' اس صدا کو اس طرح دینے لگا، جیسے کوئی والنٹیئر 'انقلاب زندہ باد' کہے، کیونکہ دوسری لے اسے یاد ہی نہ آئی۔ اس کی صدا میں اگر تاثر تھی تو صرف اتنی کہ لوگ ادھر دیکھ لیتے تھے، دیکھتے ہی بڑھیا پر نگاہ پڑ جاتی تھی۔ یہ دردانگیز نظارہ دل کو ویرانی اور وحشت سے بھر دیتا تھا جس کی دوا صرف بھیک کے چند پیسے تھے۔ بڑھیا کے سامنے پیسوں کی بارش ہونے لگی۔ اس پاس کے فقیر یا تو خالی ہاتھ ایک ایک دو دو پیسے لئے حسرت سے ان دونوں خوش نصیبوں کو تک رہے تھے اور دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے کہ ہمارے پاس بھی کوئی ایسی ہی بڑھیا چیز کیوں نہیں ہے۔ گھسیٹے اپنی اتنی کامیابی دیکھ کر خوشی اور غرور سے متوالا ہو گیا۔ اور خوب کڑک کر صدا لگانے لگا۔ آج زندگی میں پہلا دن تھا کہ جس پیشے میں وہ گھُسا تھا اس میں چوٹی کی جگہ ملی تھی۔ حسرت رہی کہ کبھی ایسا ہوتا کہ جس پیشے میں گھسوں اس کا اچھا سامان، اس کا سب اونچ نیچ معلوم ہو مگر آخر آج دونوں نعمتیں میسر آ ہی گئیں۔ میرے پاس جو سامنے ہے وہ کسی کے پاس نہیں اور میں صدا بھی کیا خوب لگا رہا ہوں۔ سب خدا کی دین ہے۔ آخر وہ کب تک اپنے بندے کا امتحان لیتا۔ دیکھو پیسے کیسے برس رہے ہیں! تو ہی داتا ہے اور تو ہی جیون کا کھیون ہار ہے مالک۔۔۔ اماں زندگی بھر کوشش کر مریں کہ کچھ پیسہ جوڑ کر گھر کی حالت سدھاریں۔ ایک ایک بات کے پیچھے جان دے مریں مگر کچھ نہ ہوا اور اب ہوا بھی تو کیسی آسانی سے۔ یہ خدا کے کارخانے ہیں۔ حیلے روزی بہانے موت۔

سہ پہر کی سنہری دھوپ میں گھسیٹے اور فقیرا ڈولی لئے شہر کے باہر ایک شاہی کھنڈر کے پاس آئے۔ دونوں سارا دن ڈولی لادے لادے پھیری لگاتے رہے تھے، تکان سے چور چور تھے مگر پھر بھی آنکھوں میں

اطمینان اور خوشی موجیں مار رہی تھی۔ مست تھے، گا رہے تھے اور زور زور سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

ایک کھنڈر کے سایہ میں ڈولی اتار دی گئی۔ گھسیٹے نے بھیک کی جھولی کھولی۔ اس میں پانچ چھ آمیوں کے کھانے بھر روٹیوں کے ٹکڑے، دال بھات اور ترکاریاں ملی جلی بھری تھیں۔ ان پر ایک نظر ڈال کر مان کی گالی دے کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر ذرا اطمینان سے بیٹھ کر ایک پوٹلی کھولی جس میں تھیں بہت سی تیل کی پوریاں، کئی قسم کی ترکاریاں، سیر بھر بیچ میل مٹھائی، چٹ پٹ کباب، مولیاں اور بیڑی کا بنڈل۔ آج کے پھیرے میں ہونے دو روپئے ملے تھے۔ جس میں سے دیڑھ کی یہ سب خریداری تھی اور چار آنے ابھی گھسیٹے کی جیب میں اچھل رہے تھے۔ گھسیٹے نے سب نعمتیں نکال کر سامنے یہاں سے وہاں چن دیں۔ سب ملا کر چار آدمیوں بھر کھانا تھا۔ دونوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سامنے نعمتوں کا ڈھیر تھا۔ جس طرح چاہے کھاؤ اور جو چاہے پھینکو۔ پہلے دونوں نے مٹھائی کی ایک ایک ڈلی منھ میں ڈالی اور بدحواسی سے ان کو نگل گئے پھر مربھکوں کی طرح مٹھائی پر ٹوٹ پڑے۔ گویا زندگی بھر کی بھوک۔ اسی ایک آن مین بجھا دیں گے۔ پوریوں کی باری آئی، ایک ایک پوری کا ایک ایک نوالہ۔ کس کس کر دو چار دانت مارتے اور پھر غپ سے دوزخ میں اتار لیتے۔ اس شور سے بڑھیا جو سو رہی تھی جاگ پڑی اور جاگتے ہی کھانا مانگنے لگی۔ اب ان دونوں کو وہ بھی یاد آئی۔ گھسیٹے اس کی طرف پیار سے دیکھ کر ہنسا اور اسے اٹھا کر ٹیک لگ کر کر بٹھا دیا۔

''لو آج تم بھی مزے دار چیزیں کھالو۔ کبھی کاہے کو کھائی ہوں گی۔''

گھسیٹے نے کچھ نکتیاں اس کے منھ میں دے دیں۔ وہ جلدی سے ان کو نگل گئی اور نگلے ہی بدحواسی سے باب باب کرنے لگی۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہاتھوں پیروں کو ہلا جُلا کر آگے سرک آئی۔ گویا کہ چاہتی تھی ایک جھپٹا مار کر سب کچھ ایک ہی دفعہ اپنے منھ میں بھر لے۔ فقیرا اور گھسیٹے کے لئے دشواری یہ تھی کہ خود کھائیں یا اسے کھلائیں۔ ادھر اس کے منھ میں کچھ دیتے اور اُدھر وہ نگل کر مانگنے لگتی۔۔۔۔۔ گھسیٹے جھلاّ کر بولا۔۔۔۔ ''لو تم بھی کیا یاد کرو گی۔''

دانت سے کاٹ کر مولی کا ایک ٹکڑا بڑھیاں کے منھ میں دے دیا۔ بڑھیا فوراً خوش خوش اسے چبانے لگی مگر چبتا کیا وہ بار بار منھ سے نکل آتا اور پھر کسی نہ کسی طرح کانپتے ہاتھوں سے اسے اندر ٹھیل لیتی۔

دونوں پھر اپنا پیٹ پاٹنے میں جُت گئے۔ ذرا دیر میں بڑھیا کھانسی۔ اس کے حلق میں ٹکڑا پھنس گیا تھا۔ آنکھیں چڑھ گئیں اور آگے پیچھے جھوم جھوم کر سوں سوں کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب دم نکلا۔ گھسیٹے اسے مرتے دیکھ کر کھانا بھول گیا اور جلدی سے انگلی ڈال کر اس کے حلق سے ٹکڑا نکال لیا۔ نکالتے ہی بڑھیا نے ایک چیخ ماری جیسے کسی نے اس کا خزانہ لوٹ لیا ہو اور حلق پھاڑ پھاڑ اسے پھر مانگنے لگی۔ اب گھسیٹے نے اسے مشغول رکھنے کو ہاتھ میں ایک رس گلاّ پکڑنے تکی تھی، وہ کسی طرح منھ کے اندر نہ جا سکا۔ رس گلاّ دب رہا تھا۔ اس کا شیرا ٹھڈّی با چھوں سے ہوتا ہوا گلے سے چھاتیوں میں بہہ رہا تھا۔ بڑھیا ساری کی ساری میٹھی ہوگئی تھی۔

ماں اور بیٹے کھاتے چلے جاتے تھے۔ نہ یہ تھکتی تھی اور نہ وہ۔ رفتہ رفتہ بیٹوں کا ہاتھ تو سُست ہوتا گیا مگر ماں کا باب باب تیز ہی ہوتا گیا۔ آخر جب گھسیٹے اور فقیرا میں نگلنے کی بالکل سکت نہ رہی تو دونوں نے بچا کھچا کھانا آگے سے سرکا دیا، اور وہیں پڑ کر بیڑیاں پینے لگے۔ بڑھیا چلاّتی رہی۔ آخر چلاّتے چلاّتے تھک کر وہ بھی ٹوکرے میں گر پڑی۔

فقیرا بہت خوش تھا۔ اس کے دل میں اب تو یہ خیال تک نہ تھا کہ اگر کہیں کسی کو معلوم ہوگیا تو کیا ہوگا؟ اب اس کے سامنے ایک دنیا تھی جس مین چھپّر نیا ہوگیا تھا۔ اس میں ایک طرف لپا پتا چولھا تھا جسے رمضانی کی بیوہ جھکی ہوئی پھونک رہی تھی۔ جب چراغ جلے بکریوں کا ایک بڑا سا گلّہ لئے وہ واپس آتا ہے تو رمضانی کی بیوہ جلدی جلدی گرما گرم وسرخا سرخ روٹیاں پکا کر سامنے رکھ دیتی ہے۔ تھالی میں (گھر میں ایک پھول کی تھالی بھی آگئی ہے) ایک طرف بکری کا مسکا بھی ہے۔۔۔۔ فقیرا خوش تھا۔ بہت خوش۔

گھسیٹے کی طبیعت بھی زوروں پر تھی۔ زندگی میں پہلی بار کامیابی ہوئی تھی۔ کامیابی کامیابی! پونے دو روپئے اور صرف ایک دن میں! پچاس روپیہ مہینہ! افوہ! اگر ہم کہیں کلکتے میں ہوتے تو وہاں کتنی آمدنی ہوتی! پھر جب روپیہ ہوتو کلکتہ کی زندگی! سنگل چائے، بیڑیاں، تاڑی خانہ، بھُنا گوشت، وہ سالی نخریلی رنڈیاں، وہ ان کا مٹک مٹک چلنا، گود میں بل کھا کھا جانا۔ گھسیٹے مسکرانے لگا۔ کچھ دیر انہی خیالوں میں ڈوبا رہا۔ پھر ذرا سنجیدہ ہوگیا۔ سوچنے کی بات ہی تھی۔ فقیرا نے سارے گھر پر قبضہ کر لیا۔ سب بکریاں اپنی کر لی ہیں۔ حصہ مانگا سسرا

بگڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے سر پھوڑ دوں سالے کا۔ اب اماں میں بھی حصہ بٹائے گا۔۔۔۔نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں گھر دے دوں گا، مگر اماں کو نہیں دے سکتا۔ آخر میں بھی تو اس کا لڑکا ہوں اور اب فقیرا کا حق ہی کیا ہے؟ وہ سب کچھ تو لے چکا۔ اتنے دنوں تک اماں بھی اسی کی رہی، آخر مجھے بھی تو کچھ ملے۔ امّاں کو میں نہیں دے سکتا ۔ اگر وہ تکرار کرے گا تو ماروں گا، سر پھوڑ دوں گا۔۔۔۔۔حرامی سالا فقیرا!

گھسیٹے سوچ سوچ کر کھولنے لگا۔ فقیرا اتنی دیر میں اونگھ گیا تھا۔ گھسیٹے نے اس کو جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا۔ ''فقیرا سونا بعد کو پہلے حصہ بانٹ لو۔ آج یہ جھگڑا چُک جانا چاہیے۔''

''کاہے کا حصّہ بانٹ؟''

''ہاں اب تو کہو گے کاہے کا حصّہ۔ ارے گھر کا، بکریوں کا اور جو کمایا ہے اس کا۔''

فقیرا تلملا کر اُٹھ بیٹھا۔

''پھر وہی گھر، پھر وہی بکریاں۔ ہزار بار کہہ دیا کہ آبا کا بنایا ہوا چھپّر پندرہ برس ہوئے جب ہی سڑ گل کر ختم ہو گیا تھا۔ یہ میں نے بنوایا ہے۔ اور بکریاں بھی مر کھپ گئیں۔ یہ سب میری پالی ہوئی ہیں چلا ہے حصہ بانٹ کرنے اور اتنے دنوں تو جو ہماری روٹی توڑتا رہا ہے؟''

فقیرا اب شہر والا فقیرا نہیں تھا۔ شہر سے نکلتے ہی پھر شیر ہو گیا تھا۔

گھسیٹے غصے میں مگر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا: ''اچھا چلو گھر تم لے جاؤ اور بکریاں بھی تم ہی لے جاؤ۔ مگر لاؤ ہماری اماں کو ہمیں دے دو۔ اتنے دنوں اگر تم نے کھلایا ہے تو اب ہم کھلائیں گے۔

''ہاں اب تو تو کھلائے ہی گا؟ پندرہ برس میں پالتا رہا۔ گو موت صاف کرتا رہا۔ تب اماں کی یاد نہ آئی ۔ اب جو کمائی کے قابل ہو گئی تو اماں تیری ہے۔ تجھے دے دوں؟ مجال ہے تیری تو لے جائے؟''

گھسیٹے پر بھوت سوار ہو گیا اور وہ غصے میں ماں کی طرف لپکا۔ جیسے اس کو جیب ہی میں تو رکھ لے گا، مگر فقیرا فوراً کود کر سامنے آ گیا اور لگا گھسیٹے کو گالیاں دینے۔ گھسیٹے کا پارہ حد سے اونچا ہو گیا۔ اس نے بڑھ کر فقیرا کو زور سے دھکا دیا اور دوڑ کر بڑھیا کو اس طرح ہاتھوں میں دبوچ لیا گویا وہ کوئی گٹھری ہے۔ جس طرح بلّی چوہے پر جھپٹتی ہے فقیرا بڑھیا پر جھپٹا اور اس کے سر اور کمر میں ہاتھ دے کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بڑھیا اس بلّی کی

طرح جس کا بچہ مر گیا ہوعوعو کر کے حلق پھاڑ پھاڑ رونے لگی۔مگران دونوں کی گالیوں اورغل غپاڑے کے نیچے اس کی آواز دب گئی۔تھوڑی دیر چھینا جھپٹی ہوئی تھی کہ بڑھیا فقیرا کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔نہ جانے فقیرا نے زور کر کے چھین لیا یا گھسیٹے نے بڑھیا کے مر جانے کے ڈر سے اسے خود ہی چھوڑ دیا۔مگر فقیرا جیسے ہی اس کو گالیاں دیتا پیچھے ہٹا ہے گھسیٹے بھوکے بھیڑیے کی طرح اس پر پھاند پڑا۔وہ تڑ سے کھڑے قد میچے گر پڑا۔اور بڑھیا چیختی،قلابازی کھاتی ایک طرف جا پڑی۔گھسیٹے فقیرا پر چڑھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹنے لگا۔فقیرا کا اور تو کوئی بس نہیں چلا وہ نیچے سے اس کے سینے اور منہ پر گھونسے جمانے لگا۔گھسیٹے جیسے جیسے گھونسے کھاتا ویسے ہی ویسے زور سے گلا دباتا۔آخر فقیرا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔گھسیٹے نے کس کس کر دو جھٹکے اور دئے۔فقیرا کی آنکھوں کے ڈیلے غلوں کی طرح باہر نکل آئے،منہ بھیانک ہو گیا اور ہاتھ پاؤں بر ر گئے۔اب گھسیٹے کا غصہ اترا اور پتہ چلا کہ میں نے کیا کیا۔وہ کانپ کر کھڑا ہو گیا اور سکتے کی سی حالت میں فقیرا کو گھورنے لگا۔اس کا چہرہ رام لیلا کے بیجا کی طرح ہونّق ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں گھسیٹے نے اپنے حواس درست کر لیے۔کلکتہ میں ایسے ایسے کمئی قصے یہ دیکھ چکا تھا۔کئی بار ایسا ہوا کہ اس کے ساتھیوں میں آپس میں لڑائی ہوئی اور ایک نے دوسرے کو مار ڈالا۔ڈر کس بات کا؟ فقیروں کے مر جینے کی کسے پروا ہوتی ہے۔مر گیا۔۔۔۔مر گیا۔۔۔۔۔ہا۔۔۔فقیرا۔۔۔۔ناحق مرا۔مان لیتا میری بات۔میں نے کیا برا کہا تھا کہ اتنے دنوں تک اماں تم نے رکھی ہے۔اب مجھے دے دو۔اب ہاں۔میں بھی تو کچھ دنوں زندگی کی بہار دیکھ لوں۔میرے بھی تو جان ہے۔مجھے اینٹ بتھر سمجھا تھا،جیسا کیا ویسا بھُگتا۔

ہاں اب جلدی سے اماں کو لو اور بھاگو۔۔۔۔۔پیاری اماں۔۔۔۔کلکتہ،وہاں کی بھیک کا کیا کہنا !اب مزا ملے گا کلکتہ کا۔

گھسیٹے جلدی سے بڑھیا کی طرف مُڑا،دیکھا تو وہ آدھی چت،مٹی کے چونتھ کی طرح ڈھیر ہے ،آنکھیں چڑھ گئی ہیں۔منہ کلھیا کی طرح کھُلا ہوا ہے اور اس میں سے رہ رہ کر بلغم اور تھوک میں لتھڑی آدمی چبی آدھی پوری غذا نگل رہی ہے۔نکتیاں،گلاب جامن،پوری کے بھیگے ہوئے ٹکڑے۔لونڈے کے لونڈے

۔زردزردچبھن۔گھسیٹے نے بڑھ کر ہاتھ لگایا۔۔۔۔۔۔۔۔بڑھیامیں کچھ نہیں تھا۔

سورج ڈوب گیا تھا۔کھنڈر کا ہر کونا بلاؤ کا بھٹ معلوم ہوتا تھا۔پت جھاڑ ہوا کے جھکڑ سینکڑوں میل سے درختوں کو تاراج کرتے مردہ پتیوں کو اٹھا اٹھا کر ٹپکتے۔وحشت ناک سروں میں سائیں سائیں کرتے ایک طرف سے آرہا تھے اور دوسری طرف بھاگے جارہے تھے۔معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز کو اُڑا کر لے جائیں گے ،گھسیٹے ہکا بکا کھڑا تھا۔اس کے ایک طرف بھائی کی لاش تھی اور دوسری طرف ماں کی۔دونوں کے پہلو میں اس کی آخری کوشش کی بھی لاش تھی۔جب تک ماں زندہ تھی بھیک کا ٹھیکرا تھی مگر مر کر وہ اس کے دل میں سچ مچ ماں بن گئی تھی۔یہ وہی ماں تھی جو اس کے ہر دکھ پر بیتاب ہو جاتی تھی۔اس کی ہر خوشی پر اپنی خوشی قربان کر دیتی تھی ۔فقیرا بھی آخر بھائی ہی تھا۔زندگی کا سہارا۔اس کی یاد کلکتہ کی بے کسی میں بھٹکے مسافر کا دیا تھی۔اس دونوں کے مرتے ہی جو رہا سہا دنیا کا رشتہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔سمجھتا تھا مگر ابھی خود اس کے قابل نہیں بنا تھا۔۔۔۔۔۔امید کی آخری کرن ڈوب گئی۔اب زندگی کی اتھاہ مصیبتیں،طوفانی سمندر کی طرح آگے پیچھے،دائیں بائیں،اوپر نیچے ہر طرف تھیں۔اس کے بھیانک بھنور منھ پھاڑے بڑھ رہے تھے اور پاس تنکے تک کا سہارا نہ تھا۔

گھسیٹے سر جھکائے افق کی طرف چل کھڑا ہوا۔

2.6 افسانہ ’’آخری کوشش‘‘ کا خلاصہ

حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں فن کا گہرا احساس اور معمولی واقعات میں بڑے بڑے حقائق کی نقاب کشائی ملتی ہے۔’’آخری کوشش‘‘اس افسانے میں حیات اللہ انصاری کے معاشرے کے تلخ حقائق کو حقیقی لباس میں پیش کیا ہے اور دولت کی نابرابری تقسیم کی بدولت معاشرے کی ایک کثیر آبادی کس طرح معاشی بدحالی کا شکار ہے جس کا عبرت انگیز پہلو اس افسانے میں بتائے ہیں۔نچلے طبقے کے افراد اپنی معاشی حالت بہتر بنانے کی نہ صرف منصوبہ بندی کرتے ہیں بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانے کوشش کرتے ہیں لیکن لاکھ محنت وکوشش کے باوجود بھی سوائے مایوسی اور ناامیدی کے باوجود بھی اس کے ہاتھ کچھ نہیں لگتا۔بالکل ایسے ہی حالات سے اس کہانی کا اہم کردار گھسیٹے گذر رکا ہے۔

گھسیٹے دیہات کا رہنے والا تھا۔اس کا تعلق نچلے طبقے سے ہے۔آمدنی کا ذریعہ سوائے کھیتی اور

مویشیوں کچھ نہیں ہے۔آمدنی کم اور بچے زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی ناآسودگی میں ایک ایک چیز کے لئے اور خاص طور سے بنیادی ضرورتوں کے لئے ترستے ہوئے بسر ہو رہی تھی۔

گھسیٹے ایک مطمئن اور آرام دہ زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔اس لئے اس کی خواہش تھی کہ کلکتہ جائیں وہاں جا کر اتنا کمائیں کہ جس سے دو بیل خریدے جا سکے۔اور پھر اپنے گاؤں آ کر کاشتکاری کریں۔کئی دن کی محنت و مشقت اور لاکھ کوشش کے باوجود بھی گھسیٹے کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔گاؤں سے بھاگ کر کسی نہ کسی طرح وہ کلکتہ پہنچ جاتا ہے۔لیکن ایک اجنبی دیش میں جہاں اس کی جان پہچان والا دوست رشتہ دار کوئی نہیں۔اس پر کون بھروسہ کرے گا۔نتیجہ یہ ہوا کہ سوائے ہمالی کے اسے کلکتہ میں کوئی کام نہیں ملا۔

ہمالی کی اُجرت بہت کم ملتی تھی۔وہ دو وقت پیٹ بھر کر کھا بھی نہیں سکتا تھا۔وہ رکشا چلانا جانتا تھا لیکن رکشا چلانے کے لئے ضامن دار کی ضرورت تھی لیکن کلکتہ میں اور کوئی اس کا اپنا نہ ہونے کی وجہ سے اسے ضامن دار نہیں ملتا۔دن رات کی محنت و مشقت سے وہ شدید بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔جسکی وجہ سے اسے دواخانے میں شریک ہونا پڑتا ہے۔کئی دن دواخانے میں رہنے کے بعد جب وہ تندرست ہو جاتا ہے تو ڈاکٹر اسے یہ صلاح دیتا ہے کہ وہ اب زیادہ محنت کا کام نہ کرے۔وہ ہمالی بھی چھوڑ کر خوانچہ لگاتا ہے۔خوانچے سے کچھ پیسے مل رہے تھے کہ ایک عورت کے چکر میں وہ گرفتار ہو جاتا ہے اور وہ عورت جس کا نام بھنگوئی ہے۔اس کی ساری آمدنی لے کر بھاگ جاتی ہے۔بغیر کسی جرم کے محض شک کی بناء پر اسے گرفتار کیا جاتا ہے۔اور سزا بھی ہوتی ہے۔جیل سے چھوٹنے کے بعد سب سے پہلے اسے اپنا دیہات اور گھر یاد آتا ہے اور اس طرح ۲۵ سال بعد ناکام و نامراد اپنے گاؤں واپس آتا ہے۔گاؤں آ کر بھی اس کی زندگی اطمینان سے بسر نہیں ہوتی بلکہ یہاں آ کر زندگی اور اشتوں کے تلخ حقائق سے اسے گذرنا پڑتا ہے۔گھر سے سوائے اس کے بھائی فقیرا اور ماں کے کوئی نہیں رہتا۔یہاں آنے کے بعد اسے پتہ چلتا ہے کہ والد کا انتقال ہو چکا ہے دوسرا بھائی بھورے سونی چند کی ایک بکری چرانے کے جرم میں جیل جا چکا ہے۔دونوں بہنوں میں ایک بہن چمپا کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔دوسری بہن شرائن کی شادی گاؤں میں ہی کسی شخص سے کی گئی ہے۔وہ کبھی بھی اپنی ماں کو دیکھنے نہیں آتی۔گھر کے حالات پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ بدتر ہو گئے تھے۔بیل ہل اور پانی نہ ہونے کی

وجہ سے کھیتی نہیں ہو پاتی تھی۔صرف بکریاں ہی آمدنی کا ایک ذریعہ تھیں۔کچھ دن تک فقیرا بھائی کی خدمت کرتا رہا۔پھر بھوک اور غربت نے ان کے رشتوں کے بیچ دراڑ ڈال دی۔ماں زندہ تو تھیں لیکن ہوش وحواس سے بیگانہ۔اس کی سمجھ بوجھ سب کچھ رخصت ہو چکی تھی۔یہاں تک کہ وہ قوت گویائی سے بھی محروم ہو چکی تھی لیکن اسے صرف کھانے پینے کا ہوش تھا اور وہ ہر وقت کھانا مانگتی تھی۔

گھسیٹے بڑے شوق سے اپنے گاؤں آیا تھا لیکن دوسرے ہی دن سے یہاں کی ہر شئے سے اُسے بیزار محسوس ہو رہی تھی۔ماں کی ہر وقت کی باب باب، بکریوں کے پیشاب کی بدبو دن بھر بھوکا رہنا اور کسی دن رات کو بھی کھانا ملنا، بیڑی سگریٹ پان اور چائے کا تو سوال ہی نہیں روکھی پھیکی بے لطف باتیں، گھسیٹے چاہتا تھا کہ چند روپیوں کا انتظار ہو جائے اور وہ بارہ کلکتہ واپس چلا جائے۔بہت سوچ بچار کر بھی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ملتا تو اخلاق،انسانیت خلوص ہمدردی کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے اپنے ماں کے ذریعے روپیہ کمانے کی سوچتا ہے۔ماں کی اس حالت سے فائدہ اٹھانے کے لئے وہ فقیرے کو بھی آمادہ کرتا ہے۔دونوں مل کر ماں کو شہر لے جائیں گے اور وہاں ماں کے ذریعے بھیک مانگیں گے۔ان کا یہ منصوبہ کامیاب ہوتا ہے۔ماں کی اس عبرت انگیز حالت کو دیکھ کر دیکھنے والے عبرت اور خوف محسوس کرتے ہیں اور اس کے سامنے پیسے پھینکتے ہیں اس طرح ماں کی بدولت انہیں بہت سارے پیسے مل جاتے ہیں۔جب پیسے ملتے ہیں تو ذاتی مفاد اُبھر کر ان کے سامنے آجاتا ہے اور دونوں خودغرضی پر اُترتے ہیں۔گھسیٹے،فقیرا کو الگ کر کے ماں کے ذریعے صرف خود ہی پیسہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور گھسیٹے کی طرح فقیرا بھی آمدنی کے اس آسان ذریعے کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔دونوں ماں کو لے کر خوب لڑائی کرتے ہیں اور یہاں تک پہنچتی ہے کہ گھسیٹے کے ہاتھوں گلا گھونٹنے کے سبب فقیرا کی موت ہو جاتی ہے اور لڑائی کے دوران دھکا لگنے کی وجہ سے ماں بھی گر جاتی ہے اور وہ ختم ہو جاتی ہے اس طرح ماں کے ذریعے پیسے کمانے کا جو خواب گھسیٹے نے دیکھا تھا وہ شرمندۂ تعبیر ہوتا ہے۔

دولت کی کیسی نابرار تقسیم ہے اور معاشرے کا یہ کتنا گھناونا پہلو ہے کہ آسودگی بسر کرنے کے لئے انسان کو مجبوراً اس طرح کے حیاسوز کام بھی کرنے پڑتے ہیں اور آمدنی کا کچھ ذریعہ بنانا پڑتا ہے۔

2.7 فرہنگ

الفاظ	معنی
ٹکٹ بابو	ٹکٹ چیکر
خونچہ	چھوٹا سا خوان
خنکی	ٹھنڈی، سردی
جتھا	ٹولی، گروہ، جماعت
کھونچا لگنا	کپڑے کا کسی چیز سے الجھ کر پھٹ جانا
بغیا	چھوٹا سا باغ
چھاگل	مٹی کا وہ برتن جسمیں مسافر پانی بھر لیتے ہیں
جوئے	جوڑا۔ بالوں کو پیچھے کی طرف گول کر کے باندھنا
جھربیریاں	جھڑبیر۔ جھاڑی کے چھوٹے چھوٹے بیر
کیتھے	(اصل لفظ کیت) ایک درخت کا ترش پھل
کراہند	کراہت آمیز، جس سے کراہیت آئے
نابدان	گندے پانی کے نکاسی کی جگہ۔ موری۔
سڑاہند	بدبودار، سڑی ہوئی۔
چھیرہاٹاٹ	پھٹا ہوا ٹاٹ
سوتا پھوٹ جانا	جھرنا نکلنا
نمدہ، نمدے	وہ کپڑا جو اون کو جما کر بناتے ہیں
ورم	سوجن
پنجر	ڈھانچہ
چوپال	گاؤں کی وہ جگہ جہاں دیہاتی بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں

جمانتی	مراد ضمانت
ہن	دھن، دولت
گدرایا	بھرا بھرا
پیال	گھانس
نکتیاں	ایک قسم کی مٹھائی جو بیسن سے بنائی جاتی ہے۔

2.8 مشقی سوالات

(۱) حیات اللہ انصاری نے ہندوستانی سماج کی معاشی ابتری پر کس طرح چوٹ کی ہے؟

(۲) گھسیٹا اور فقیرا کے درمیان، ماں کو لے کر ہونے والی کشمکش کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

2.9 مزید مطالعہ کے لیے کتب

کتاب	مصنف
حیات اللہ انصاری	نافع قدوائی
نیا افسانہ	وقار عظیم
حیات اللہ انصاری 'صحافی' لیڈر، ادیب	حسن کمال
مجموعہ انوار حیات اللہ	اظہار احمد

اکائی 3۔ آنندی

غلام عباس

اکائی کے اجزاء

3.1 تمہید
3.2 حیات
3.3 غلام عباس کی افسانہ نگاری
3.4 ''آنندی'' (متن)
3.5 ''آنندی'' کا تنقیدی جائزہ
3.6 خلاصہ
3.7 نمونۂ امتحانی سوالات
3.8 فرہنگ
3.9 سفارش کردہ کتابیں

3.1 تمہید

غلام عباس کا شمار اردو کے معروف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ناول بھی لکھے اور بچوں کے لیے کہانیاں، دلچسپ مضامین، مزاحیہ ناٹک اور نظمیں بھی۔ لیکن افسانہ نگار کی حیثیت سے انہیں شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے ہم عصروں میں کرشن چندر، عزیز احمد، عسکری اور منٹو وغیرہ کے نام ملتے ہیں لیکن اپنے مواد، موضوعات اور طرزِ تحریر کے باعث غلام عباس نے اپنا مقام آپ پیدا کیا۔ ان کے افسانے اردو فکشن میں اپنی انفرادیت کا پتہ دیتے ہیں۔

اس اکائی میں ہم غلام عباس کے حالات زندگی پر روشنی ڈالیں گے۔ ان کی افسانہ نگاری کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا۔ آپ غلام عباس کا افسانہ ''آنندی'' پڑھیں گے۔ اس افسانے کا فنی اور ادبی تجزیہ بھی

پیش ہوگا۔نمونۂ امتحانی سوالات بھی دیے جائیں گے۔مشکل الفاظ کے معنی فرہنگ کے تحت ملیں گے اور آپ کے مزید مطالعہ کے لیے کتب کی فہرست بھی دی جا رہی ہے۔

3.2 حیات ''غلام عباس'':

آنندی جیسی خوبصورت کہانی کے لیے مشہور غلام عباس ۱۷ نومبر ۹۰۹۱ کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ لاہور سے انٹر اور علوم مشرقیہ کی تعلیم حاصل کی۔ ۵۲۹۱ سے لکھنے کا سفر شروع کیا۔ابتدا میں بچوں کے لیے نظمیں اور کہانیاں لکھیں جو کتابی صورت میں دارالاشاعت پنجاب لاہور سے شائع ہوئیں اور غیر ملکی افسانوں کے اردو میں ترجمے کیے۔ ۸۲۹۱ میں امتیاز علی تاج کے ساتھ ان کے رسالے 'پھول' اور 'تہذیب نسواں' میں معاون مدیر کی حثیت سے کام کیا۔ ۸۳۹۱ میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ ریڈیو کے ہندی اردو رسالے 'آواز' اور 'سارنگ' انھیں کی ادارت میں شائع ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوگئے۔اور ریڈیو کے رسالے 'آہنگ' کی ادارت کی۔ ۹۴۹۱ میں کچھ وقت مرکزی وزارت واطلاعات ونشریات سے وابستہ ہوکر بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کے خدمات انجام دیں۔ ۹۴۹۱ میں ہی بی بی سی لندن سے بطور پروگرام پروڈیوسر وابستہ ہوئے۔ ۲۵۹۱ میں واپس پاکستان لوٹ آئے اور 'آہنگ' کے ادارتی امور سے وابستہ ہوگیے۔ ۷۶۹۱ میں ملازمت سے سبکدوش ہوے۔یکم نومبر ۲۸۹۱ کو لاہور میں انتقال ہوا۔

غلام عباس کا نام افسانہ نگار کی حیثیت سے انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام سے کچھ پہلے احمد علی، علی عباس حسینی، حجاب امتیاز علی، رشید جہاں وغیر کے ساتھ سامنے آیا۔اور بہت جلد وہ اپنے وقت میں ایک سنجیدہ اور غیر معمولی افسانہ نگار کے طور پر تسلیم کر لیے گیے۔غلام عباس نے خیر وشر کے روایتی تصور سے اوپر اٹھ کر انسانی زندگی کی حقیقتوں کی کہانیاں لکھیں۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'آنندی' ۸۴۹۱ میں مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ 'جاڑے کی چاندنی' جولائی ۰۶۹۱ میں۔تیسرا اور آخری مجموعہ 'کن رس' ۹۶۹۱ میں لاہور سے شائع ہوا۔ان کے علاوہ 'گوندنی والا تکیہ' کے نام سے ان کا ایک ناول بھی منظر عام پر آیا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

۱۔ غلام عباس کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ غلام عباس کا پہلا افسانہ کس سنہ میں شائع ہوا؟

۳۔ غلام عباس کے تین افسانوی مجموعوں کے نام لکھیے۔

3.3 غلام عباس کی افسانہ نگاری

غلام عباس کا طویل افسانہ 'دھنک' جیسا 1969 میں برمحل تھا، جب یہ تخلیق ہوا تھا، اور اپنی ایک خاص معنویت رکھتا تھا، ایسے ہی آج بھی اس کا جواز بہت واضح ہے اور اس کی معنویت کے کئی نئے پہلو وا ہوتے ہیں۔ پیلی، نیلی اور سفید پگڑیوں والے ملاؤں کی کہانی اس دور میں ضرور قبل از وقت تصور کی جا سکتی ہوگی، لیکن آج اس کے برموقع ہونے کی کہیں زیادہ ٹھوس شہادتیں موجود ہیں۔

دھنک میں ایسے معاشرے کی کہانی بیان کی گئی ہے جو اعلیٰ تر سائنسی کمالات کے درجے پر پہنچنے کے بعد محض مذہبی تنگ نظری اور ملاؤں کی فرقہ پسندیوں اور ذہنی وفکری گھٹن کے باعث بربادی کا شکار ہوتا اور کھنڈر میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ گزرے ہوئے کل میں لکھا گیا یہ افسانہ ہماری آج کی صورت حال کو اپنا موضوع بناتا ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک عظیم لکھنے والا پچاس برس پہلے ان حالات کی پیشین گوئی کر رہا تھا جو آج زیادہ واضح اور نمایاں انداز میں رونما ہو رہے اور زیادہ حتمی صورت میں اس انجام کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کی ایک جھلک ہمیں غلام عباس نے اپنے افسانے میں دکھائی ہے۔ آج اس افسانے کا مطالعہ بالکل اسی انداز میں ضروری اور بامعنی ہو گیا ہے جیسا کچھ عرصہ پہلے عام انتخابات کے موقع پر اور اس کے بعد کے حالات میں منٹو کا افسانہ 'نیا قانون' کہیں زیادہ معنویت کے ساتھ ہم پر کھلا تھا جس کا کردار منگو کوچوان مسلسل نیا قانون، نیا قانون کی رٹ لگاتا ہے تو تھانیدار اس کی گردن پر دھپہ مارتے ہوئے چیخ کر کہتا ہے کہ شور مت مچاؤ، کوئی نیا قانون نہیں آیا، سب کچھ وہی ہے، جو پہلے تھا۔

دھنک ہی نہیں، غلام عباس کے ایک سے زائد افسانے ان کے اس رجحان کے عکاس ہیں جن میں انھوں نے مذہبی منافرت اور تعصب کو تنقید کا نشانہ بنایا اور اسے معاشرے کی سماجی و ثقافتی تباہی کا باعث قرار دیا۔ 'لچک' اسی موضوع کے گرد بنا ہوا غلام عباس کا ایک اور قابل ذکر افسانہ ہے۔

غلام عباس کی ملک گیر شہرت کا آغاز 1948 کے قریب ہوا جب ان کا افسانہ 'آنندی' شائع ہوا۔ اس شہرہ آفاق اور کثیر المعانی افسانے نے جائز طور پر ادبی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ غلام عباس ایک دم سے اردو کے اعلیٰ افسانہ نگاروں کی صف میں جا کھڑے ہوئے۔ آج بھی اردو کے مقبول اور اعلیٰ ترین افسانوں کی کوئی ایسی فہرست تصور کرنا دشوار ہے جس میں آنندی کی شمولیت نہ ہو۔

آنندی کی اثر انگیزی اور طاقت کا منبع اس کا دریاؤں کی سی شانتی اور استحکام کے ساتھ بہتا ہوا بیانیہ ہے۔ جیسا کہ محمد حسن عسکری نے کہا کہ افسانے کا خیال کسی عام افسانہ نگار کے ہاتھ آیا ہوتا تو وہ عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر کوئی سی بھی کہانی کا غلاف منڈھتا اور اسے چند پیراگرافس یا صفحوں میں سمیٹ کر ضائع کر دیتا۔ غلام عباس انتہائی فنی ضبط کے ساتھ لکھنے والے ایک غیر معمولی ادیب ہیں۔ یہ صبر و ضبط انھوں نے اپنی افتادِ طبع سے تو لیا لیکن عظیم عالمی کلاسیکی ادب کے مطالعے اور ترجمے نے اسے جلا بخشی۔ آنندی میں انھوں نے عمارتوں اور گھروں کی دیواریں اساریں، دکانیں قائم کیں، بازار سجائے، لوگوں کو وہاں آباد کیا، اور ایک شہر بسایا جو وقت گزرنے کے ساتھ اسی شہر جیسا پر رونق ہو جاتا ہے، جیسا وہ شہر تھا، جہاں سے نکال کر طوائفوں کو وہاں لا پھینکا گیا تھا۔

غلام عباس نے اپنے ایک انٹرویو میں خود بھی اس امر کا اظہار کیا کہ خیال آفرینی اور تخیل آزمائی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے ذاتی تجربے کو بھی اس افسانے میں سمو دیا تھا۔ ''میرا افسانہ آنندی بھی اسی قسم کے مشاہدے پر مبنی ہے جو میں نے طوائفوں کے علاقے کی تعمیر نو کے سلسلے میں مشاہدہ کیا۔'' دہلی میں طوائفوں کو اس باعث چاوڑی کے علاقے سے نکال دیا گیا تھا کہ ان کی موجودگی شہر کے شرفاء کو کھٹکتی تھی اور اس سے مردوں اور عورتوں کے اخلاق بگڑنے کا اندیشہ تھا۔ طوائفوں کو شہر سے میلوں دور رہنے کو جگہ دی گئی تھی۔ لیکن جب وہ جگہ بھی آخر ان عورتوں کی وجہ سے آباد ہو گئی اور یہ بازار حسن اس آبادی کا مرکز بن گیا تو پھر اس علاقے

کی بھی میونسپل کمیٹی نے انھیں اس علاقے سے نکال دینے کا مطالبہ کیا۔آنندی ہمیں انسانی تہذیب کے آغاز و ارتقا کی کہانی ایک مختلف زاویے سے بیان کرتا ہے جسے ماننے کو دل نہیں چاہتا۔لیکن اسے مانے بغیر چارہ نہیں ہے۔ یہ محبت اور نفرت کا ملا جلا رشتہ،فطرت اور زندگی کے ساتھ انسان کا یہ دورخا تعلق ہی غلام عباس کا محبوب موضوع ہے۔

غلام عباس کے حوالے سے محمد حسن عسکری سمیت کئی ناقدین نے یہ شکوہ کیا کہ اردو میں ایسے بڑے فن کار کو طویل عرصے تک نظرانداز کیا گیا اور ہنوز انھیں ان کا جائز مقام نہیں دیا جارہا ہے۔اس کے باوجود غلام عباس کے آنندی سمیت چند افسانے اردو افسانے کی آبرو مانے جا سکتے ہیں،اور وہ معروف بھی بہت ہوئے لیکن خود غلام عباس نہ اپنی زندگی میں اور نہ بعد ہی بہت زیادہ زیر بحث لائے گئے۔عمومی طور پر ناقدین نے انھیں نظرانداز کیا۔افسانہ نگار کا معروف ہونا اور کسی ادیب کے چند افسانوں کا معروف ہونا،یہی فرق ہمیں غلام عباس کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔

غلام عباس کی شخصیت اور ان کی مجموعی لکھت میں ویسا گلیمر اور شور شرابا اور پرانی جمالیات یا بوسیدہ اخلاقی اقدار وغیر کی بلند آہنگ توڑ پھوڑ دکھائی نہیں دیتی کہ جو قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلے۔یا اگر یہ ہے بھی تو ایسے دھیمے اور شائستہ انداز میں ہے کہ یہ سنائی تو دے لیکن آپ کے حواس کو اپنی جکڑ میں نہ لے۔نہ ہی آپ نے کسی نظریے کے سائبان تلے آکر خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔نہ آپ نے اپنی کہانیوں کی زبان کو پرشکوہ یا جذباتیت سے مملو بنایا۔نہ تکنیک کے تجربے کیے۔نہ کسی پر کیچڑ اچھالا،نہ کسی کو للکارا۔غرض کہ انھوں نے کوئی ایسا فارمولہ نہیں اپنایا کہ جو فی زمانہ معروف ہے اور جو کسی بھی لکھنے والے کی شہرت کو یقینی بنانے کی ضمانت فراہم کرسکتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے خود کو سجانے اور سنوارنے کی کبھی سرے سے کوشش ہی نہیں کی۔

غلام عباس نے بہت خاموشی سے اور تحمل کے ساتھ عام کرداروں پر مبنی زندگی کے نکتے سجھاتی ہوئی خاص کہانیاں لکھیں جن میں سردیوں کی دو پہروں جیسی خوش گوار حدت ہے۔ یہ کہانیاں بظاہر جتنی سادہ ہیں اور انھیں جس سادہ انداز میں بیان کیا گیا ہے،حقیقت میں یہ اپنے اندرون میں اس سے کہیں زیادہ گہرائی

اور معنوی وسعت لیے ہوئے ہیں، جتنی کسی بھی عالمی سطح کی کسی بہترین کہانی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ کیوں نہ ہم اردو کی پانچ بہترین کہانیوں کا انتخاب کریں اور ان میں منٹو کی ٹوبہ ٹیک سنگھ کے بعد آنندی کو شامل کر لیں۔ کہانی میں غلام عباس کا اختصاص جزئیات نگاری اور کرداروں کے نویکلے پن کا بیان ہے۔ اس پر زبان و بیان کا کمال ایک رنگ جما تا ہے۔ موضوعات کی وسعت کہانیوں کے پلاٹ سے پھیل کر بعض صورتوں میں عالمگیریت کو چھو لیتی ہیں۔ کردار بعض ایسے تخلیق کیے، جو سراسر حقیقی ہونے کے باوجود نہایت انوکھے، دلچسپ اور یاد رہ جانے کے لائق ہیں اور بلا شبہ اردو ادب میں بھی یہ یادگار کرداروں کی صف میں جگہ پاتے ہیں۔ جیسے جواری کا ننّو، یا بہروپیا، عام کرداروں میں سے ایسے چنے گئے ہیں کہ کوئی عام کردار حتیٰ کہ بہت سے خاص کردار بھی ان کے ہم سر ہونے کا دعویٰ نہیں کر پاتے۔

غلام عباس کے افسانوں کے بنیادی موضوعات میں ایک موضوع 'سمجھوتہ' ہے۔ سمجھوتہ، زندگی اور فطرت کے ساتھ۔ سمجھوتہ جو فطرت اور انسان کے مابین طے پانے والا معاہدہ ہے۔ فطرت طاقت ور ہے۔ انسان اس سے جھوجھنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن آخر اس کی فراواں قوتوں کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسے الٹا اپنے آپ کو بدلنا اور زندگی اور فطرت کے موافق بنانا پڑتا ہے۔ حمام میں، سمجھوتہ، ناک کاٹنے والے، کتبہ، بردہ فروش وغیرہ چند افسانے ہیں جو اس حوالے سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

غلام عباس جس دور میں لکھ رہے تھے، تب ایک طرف حلقہ ارباب ذوق والوں کا شہرہ تھا تو دوسری طرف اردو ادب کے ایوانوں میں ترقی پسند تحریک کا طوطی بولتا تھا۔ بڑے بڑے لکھنے والے ان دونوں چھتریوں تلے جمع تھے لیکن منٹو کی طرح غلام عباس نے ایسے کسی سہارے یا نشان کو اپنی پہچان بنانے کے لیے استعمال کرنے سے گریز کیا۔ وہ خود ایک جگہ اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں، ''کسی سیاسی نقطہ نظر کو ادب یا ڈرامے کے ذریعہ پھیلایا جائے تو میں اسے ادب نہیں سمجھتا۔''

چیخوف کی طرح کا ٹھہراؤ غلام عباس کے فکشن کا ایک اور نمایاں وصف ہے۔ آپ بات کہنے کی جلدی میں کبھی مبتلا نہیں ہوتے۔ اور بقول محمد حسن عسکری 'وہ پہلے ٹھہر کے اسے سمجھ لیتے ہیں، اور پھر جس حد تک وہ ان کی گرفت میں آتی ہے، اسی حد تک کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' غیر معمولی تحمل اور بردباری آپ کو ایسا اعتدال

اور وقار عطا کرتی ہے جس سے آپ کے بیانیہ میں جلال اور وجاہت دونوں صفات بیک وقت پیدا ہو جاتی ہیں۔ جب کہ اس بیانیہ میں جزئیات نگاری کی زیرکی اور تنوع سے جاذب نظر رنگ پیدا کئے گئے ہوتے ہیں۔ آج ایسی صورت حال ہے اور سوچ اور اظہار کے وسائل پر اتنی پابندیاں عائد کردی گئی ہیں کہ دھنک جیسی کہانی لکھنے والا اور حتی کہ ایسی کہانی پر بات کرنے والا بھی ہوسکتا ہے، کسی ادارے یا فرد کے ذاتی غیض و غضب کا نشانہ بنے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کہانی ہمیں غلام عباس کی فن کارانہ عظمت پر زیادہ سے زیادہ قائل کرتی ہے۔

3.4 متن ''آنندی''

بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنان بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھرکم رکن جو ملک وقوم کے سچے خیر خواہ اور دردمند سمجھے جاتے تھے، نہایت فصاحت سے تقریر کررہے تھے، "اور پھر حضرات آپ یہ بھی خیال فرمائیے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے چنانچہ ہر شریف آدمی کو چاروناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفاء کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ، نیم عریاں بیسواؤں کے بناؤ سنگار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غازوں، لونڈروں، زرق برق ساریوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پُرمسرت گھر، ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔"

"اور صاحبان پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمائیے کہ ہمارے نونہالانِ قوم جو درسگاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور ان کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں اور قیاس چاہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو

بھنور سے نکالنے کا سہرا ان ہی کے سر بندھے گا، انہیں بھی صبح شام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں ہر وقت بارہ ابھرن سولہ سنگار کیے ہر راہرو پر بے حجابانہ نگاہ ومژہ کے تیر وسناں برساتی اور اسے دعوتِ حسن دیتی ہیں۔ کیا انہیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے نا تجربہ کار جوانی کے نشے میں محو، سود وزیاں سے بے پرواہ نونہالانِ قوم اپنے جذبات وخیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! کیا ان کا حسنِ زاہد فریب ہمارے نونہالانِ قوم کو جادۂ مستقیم سے بھٹکا کر، ان کے دل میں گناہ کی پراسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی، ایک اضطراب، ایک ہیجان برپا نہ کر دیتا ہوگا۔۔۔"

اس موقع پر ایک رکن بلدیہ جو کسی زمانے میں مدرس رہ چکے تھے اور اعداد وشمار سے خاص شغف رکھتے تھے بول اٹھے: "صاحبان، واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبہ کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔"

ایک رکن نے جو چشمہ لگائے تھے اور ہفتہ وار اخبار کے مدیرِ اعزازی تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا، "حضرات ہمارے شہر سے روز بروز غیرت، شرافت، مردانگی، نیکوکاری وپرہیزگاری اٹھتی جا رہی ہے اور اس کی بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بدمعاشی، چوری اور جعل سازی کا دور دورہ ہوتا جا رہا ہے۔ منشیات کا استعمال بڑھ گیا ہے۔ قتل وغارت گری، خودکشی اور دیوالیہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا سبب محض ان زنانِ بازاری کا ناپاک وجود ہے کیونکہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر ہوش وخرد کھو بیٹھتے ہیں اور ان کی بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لیے ہر جائز وناجائز طریقہ سے زر حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سعی وکوشش میں جامہ انسانیت سے باہر ہو جاتے ہیں اور قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جانِ عزیز ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں۔"

ایک پنشن یافتہ معمر رکن جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے اور دنیا کا سرد وگرم دیکھ چکے تھے اور اب کش مکش حیات سے تھک کر باقی ماندہ عمر ستانے اور اپنے اہل وعیال کو اپنے سایہ میں پنپتا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے، تقریر کرنے اٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی تھی اور لہجہ فریاد کا انداز لیےہوئے تھا۔ بولے: "صاحبان

رات رات بھران لوگوں کے طبلے کی تھاپ، ان کی گلے بازیاں، ان کے عشاق کی دھینگا مشتی، گالی گلوچ، شور و غل، ہاہاہا ہو ہو ہو، سن سن کر آس پاس کے رہنے والے شرفا کے کان پک گیے ہیں۔ضیق میں جان آ گئی ہے۔ رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود۔علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر صاحب اولاد خود کر سکتا ہے۔۔۔"

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔سب اراکین بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی کیونکہ بدقسمتی سے ان کا مکان اس بازار حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔ان کے بعد ایک رکن بلدیہ نے جو پرانی تہذیب کے علمبردار تھے اور آثار قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے تقریر کرتے ہوئے کہا، "حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں جب وہ اس بازار سے گزرتے ہیں اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجئے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔"

اب صدر بلدیہ تقریر کرنے اٹھے۔گو قد ٹھگنا اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے مگر سر بڑا تھا جس کی وجہ سے بردبار آدمی معلوم ہوتے تھے۔لہجہ میں حد درجہ متانت تھی، بولے:"حضرات! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب وتمدن کے لئے باعثِ صدعار ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑ دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟" ایک صاحب بول اٹھے، "یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

اس پر ایک طویل فرمائشی قہقہہ پڑا اور ہال کی ماتمی فضا میں یکبارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہو گیے۔جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحب صدر بولے، "حضرات یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انہیں اپنے گھروں میں گھسنے نہ دیں گے اور مفلس اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لیے ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے، یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی۔"

اس پر ایک صاحب بولے، "بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں۔"

صدر نے کہا، "صاحبان یہ بھی آسان کام نہیں ہے۔ ان کی تعداد دس بیس نہیں سیکڑوں تک پہنچتی ہے اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکانات ہیں۔"

یہ مسئلہ کوئی مہینے بھر تک بلدیہ کے زیر بحث رہا اور بالآخر تمام اراکین کی اتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہئے اور انہیں رہنے کے لیے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہئے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس فیصلہ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں بھگتیں مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی اور چار و ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے رہے اور مکانوں کے گاہک پیدا کیے جاتے رہے۔ بیشتر مکانوں کو بذریع؟ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے ہی مکانوں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تا کہ اس عرصہ میں وہ نئے علاقہ میں مکان وغیرہ بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی اور اس سے آگے کوس بھر کا کچا راستہ تھا۔ کسی زمانہ میں وہاں کوئی بستی ہوگی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے اور دن دہاڑے اُلّو بولتا تھا۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ مگر کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے، یا یونہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہر خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روز روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گیے تھے۔

پانچ سو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دل

بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں اور اپنے دولت مند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے بادل ناخواستہ اس علاقہ میں رہنے پر آمادہ ہوگئی تھیں ورنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کی کونوں کھدروں میں جا چھپیں گی یا پھر اس شہر کو چھوڑ کر کہیں اور نکل جائیں گی۔

یہ چودہ بیسوائیں اچھی خاصی مالدار تھیں۔اس پر شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے،ان کے دام انہیں اچھے وصول ہو گیے تھے اور اس علاقہ میں زمین کی قیمت برائے نام تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کیلئے تیار تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے بڑے عالیشان مکان بنوانے کی ٹھانی۔ایک اونچی اور ہموار جگہ جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی، منتخب کی گئی۔زمین کے قطعے صاف کرائے اور چابک دست نقشہ نویسوں سے مکان کے نقشے بنوائے گیا اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔دن بھر اینٹ،مٹی،چونا،شہتیر،گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان گاڑیوں، چھکڑوں،خچروں،گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا اور منشی صاحب حساب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انہیں گنواتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔میر صاحب معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے ڈپٹتے۔مزدور ادھر ادھر دوڑتے پھرتے۔مزدورنیوں کو چلا چلا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لیبلاتے۔غرض سارا دن ایک شور ایک ہنگامہ رہتا۔اور سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دور سے آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی دھیمی آوازیں سنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا جو بند پڑا تھا۔راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر ستانے کی غرض سے اور کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گزاری کے خیال سے سب سے پہلے اس کی مرمت کی چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا،اس لئے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہو گئی۔دن کو بارہ بجے جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی دو ڈھائی سو راج،مزدور،میرِ عمارت،منشی اور ان بیسواؤں کے رشتے دار یا کارندے جو

تعمیر کی نگرانی پر مامور تھے، اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی، اس بستی کی خبر سن کر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک خوردسال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ، بیڑی، چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا اور کنویں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترا بنا پیسے کے دو دو شکر کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کر لے آیا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر "لے لو خربوزے، شہد سے میٹھے خربوزے!" کی صدا لگانے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا، گھر سے سری پائے پکا، دیگچی میں رکھ، خوانچہ میں لگا، تھوڑی سی روٹیاں، مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے آ موجود ہوا اور اسی بستی کے کارکنوں کو جنگل میں گھر کی ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت، میر عمارت، منشی، معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنویں سے پانی نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا، پھر ایک کو امام بنا دیا جاتا اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں میں ایک ملا کے کان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے وہ دوسرے ہی دن علی الصبح ایک سبز جز دان میں قرآن شریف، پنج سورہ، رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ آ موجود ہوا اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھائے آ جاتا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس زمین پر چولہا بنا، کباب، کلیجی، دل اور گردے سیخوں پر چڑھا، بستی والوں کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو ساتھ لے کر مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لئے پھونس کا ایک چھپر ڈال کر تنور گرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نائی، پھٹی پرانی کسبت گلے میں ڈالے جوتی کی ٹھوکروں سے راستے کے روڑوں کو لڑھکاتا ادھر ادھر گشت کرتا دیکھنے میں آ جاتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے، کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آ جاتیں اور

غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آجاتیں اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور انہیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے، اوباش و بیکار مباش کچھ کیا کر، کے مصداق شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سن گن لینے آجاتے اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے دور ہٹ کر ان کے گرداگرد چکر لگاتے رہتے۔ فقرے کستے، بے تکے قہقہے لگاتے۔ عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں تھوڑے ہی دن پہلے ہو کا عالم تھا اب ہر طرف گہما گہمی اور چہل پہل نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں اس علاقہ کی ویرانی میں ان بیسواؤں کو یہاں آکر رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی، وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی اور اب وہ ہر مرتبہ خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکیدیں کر جاتی تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن بستی کے راج مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس دھواں اٹھ رہا ہے اور ایک سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا تڑنگا مست فقیر، لنگوٹ باندھے چار ابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے ارد گرد پھر رہا ہے اور کنکر پتھر اٹھا اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک گھڑا لے کر کنویں پر آیا اور پانی بھر بھر کر مزار پر لے جانے اور اسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنویں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے۔ وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا، "جانتے ہو وہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا! میرے باپ دادا، ان کے مجاور تھے۔" اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کرامتیں بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائنتی چراغ روشن کر دیے۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے اللہ ہو کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

چھ مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گیے ۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے۔ سات ایک طرف اور سات دوسری طرف ۔ بیچ میں چوڑی چکلی سڑک تھی ۔ ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دکانیں تھیں ۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ وسیع برآمدہ تھا۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لئے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھی ۔ جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے دکھائے گیے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گیے تھے، جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدہ کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لیےتھا، اس میں سنگ مرمر کے نازک نازک ستون بنائے گیے تھے۔ دیواروں پر خوش نما پچی کاری کی گئی تھی ۔ فرش چمکدار پتھر کا بنایا گیا تھا۔ جب سنگ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرش زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں ۔

بدھ کا شبھ دن، اس بستی میں آنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی۔ بستی کے کھلے میدان میں زمین کو صاف کرا کر شامیانے نصب کر دیے گیے ۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبو، بیس بیس کوس سے فقیروں اور کتوں کو کھینچ لائی ۔ دوپہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس جہاں لنگر تقسیم کیا جانا تھا اس قدر فقیر جمع ہو گیے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہوئے ہوں گے ۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کروایا اور دھلوایا گیا اور اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا، جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا ۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا۔ گاؤ تکئے ، پان دان، پیک دان، پیچواں دانی اور گلاب پاش رکھ لیے گیے اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی ۔ دور دور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا جو ان کی سہیلیاں یا برادری کی تھیں ۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آئے جن کے لیے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کے رخ چقیں ڈال دی گئیں ۔ بے شمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعۂ نور بنی ہوئی تھی ۔ ان بیسواؤں کے توندل سیاہ فام سازندے زربفت اور

کمخواب کی شیروانیاں پہنے، عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے، ادھر ادھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پر سے باریک ساریوں میں ملبوس، غازوں اور خوشبوؤں میں بسی ہوئی نازنین اٹھکیلیوں سے چلتیں۔ رات بھر رقص اور سرور کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی تو یہ بیسوائیں ساز و سامان کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہو گئیں۔ جھاڑ، فانوس، ظروفِ بلّوری، قد آدم آئینے، نواڑی پلنگ، تصویریں اور قطعاتِ سنہری، چوکٹھوں میں جڑے ہوئے لائے گئے اور قرینے سے کمروں میں لگائے گیے اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کیل کانٹے سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصہ تو استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے، غزلیں یاد کرنے، دھنیں بٹھانے، سبق پڑھنے، تختی لکھنے، سینے پرونے، کاڑھنے، گراموفون سننے، استادوں سے تاش اور کیرم کھیلنے، ضلع جگت، نوک جھونک سے جی بہلانے یا سونے میں گزارتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں، جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال نکال کر ٹب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے بعد وہ بناؤ سنگھار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا، یہ مکان گیسوں کی روشنی سے جگمگا اٹھتے جو جا بجا سنگ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائیگیے تھے اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو پھول پتیوں کی وضع کے کاٹ کر جڑے گیےتھے ان کی قوسِ قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دور سے جھلمل جھلمل کرتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ بیسوائیں، بناؤ سنگار کیے برآمدوں میں ٹہلتیں، آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں، ہنستیں کھکھلاتیں۔ جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چھالیہ کترتی رہتیں۔ جب رات ذرا بھیگ جاتی تو ان کے ملنے والے ٹوکروں میں شراب کی بوتلیں اور پھل پھلاری لیے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔ اس بستی میں جن کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگتی۔ نغمہ و سرود، ساز کے سر، رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگھروؤں کی آواز، قلقلِ مینا میں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت

جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ دکانوں کے کرایہ دار پیدا ہو گیے۔ جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دکان دار آیا وہ وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پر کرنے کے لیے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگریٹوں کے بہت سے ڈبے اٹھا لائے اور اسے منبر کے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں رنگ دار پانی بھر دیا گیا تاکہ معلوم ہو کہ شربت کی بوتلیں ہیں۔

بڑھیا نے اپنے بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگریٹ کی ڈبیوں سے بنائی ہوئی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی، بعض ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں بھی پرانے رسالوں سے نکال کر لئی سے دیواروں پر چپکا دیں۔ دکان کا اصل مال دو تین قسم کے سگریٹ کے تین تین چار چار پیکٹوں، بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں یا دیا سلائی کی نصف درجن ڈبیوں، پانی کی ڈھولی، پینے کے تمباکو کی تین چار ٹکیوں اور موم بتی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا، تیسری میں حلوائی اور شیر فروش، چوتھی میں قصائی، پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں ایک کنجڑا آ بسے۔ کنجڑا آس پاس کے دیہات سے سستے داموں چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا اور یہاں خاصے منافع پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا۔ چونکہ دکان خاصی کھلی تھی، ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار، گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا اور شام کو انہیں چنگیر میں ڈال کر ایک ایک مکان پر لے جاتا اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ ایک ایک دو دو گھڑی بیٹھ، سازندوں سے گپ شپ بھی ہانک لیتا اور حقے کے دم بھی لگا آتا۔ جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی میں ہی کوٹھے پر چڑھ آتی اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھنٹوں اٹھنے کا نام نہ لیتا، مزے مزے سے گانے پر سر دھنتا اور بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا۔ جس دن رات زیادہ گزر جاتی اور کوئی ہار بچ جاتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دن ایک بیسوا کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے، سینے کی ایک مشین رکھ کر بیٹھ گیے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آ گیا اور اپنے ساتھ ایک رنگریز کو بھی لیتا آیا۔ اس کی دکان کے باہر الگنی پر لٹکتے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے آنکھوں کو بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجیئے بساطی نے جس کی دکان شہر میں چلتی نہ تھی، بلکہ اسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا، شہر کو خیر باد کہہ کر اس بستی کا رخ کیا۔ یہاں پر اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے لونڈر، قسم قسم کے پاؤڈر، صابن، کنگھیاں، بٹن، سوئی، دھاگا، لیس، فیتے، خوشبودار تیل، رومال، منجن وغیرہ کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے روز کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکاندار کوئی بزاز، کوئی پنساری، کوئی نیچہ بند، کوئی نانبائی مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھتے ہوئے کرائے سے گھبرا کر اس بستی میں آ پناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے، ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لے کر شہر سے اٹھ آئے اور اس بستی میں ایک دکان کرایہ پر لے لی۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں، شربت کی بوتلوں اور مربے، چٹنی، اچار کے بویاموں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طبِ اکبر، قرابادین قادری اور دوسری طبی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں کے ساتھ جو جگہ خالی بچی وہاں انہوں نے اپنے خاص الخاص مجربات کے اشتہارات سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پر چپکا کر آویزاں کر دیے۔ ہر روز صبح کو بیسواؤں کے ملازم گلاس لے لے کر آ موجود ہوتے اور شربتِ بزوری، شربتِ بنفشہ، شربتِ انار اور ایسے ہی اور نزہت بخش، روح افزا شربت و عرق، خمیرہ گاؤزبان اور تقویت پہنچانے والے مربے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں بچ رہیں، ان میں بیسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں تاش، چوسر اور شطرنج کھیلتے، بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھوٹتے، بٹیروں کی

پالیاں کراتے، تیتروں سے "سبحان تیری قدرت" کی رٹ لگواتے اور گھڑا بجا بجا کر گاتے۔

ایک بیسوا کے سازندے نے ایک دکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا اس میں لا بٹھایا۔ دکان کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں، ستار، طنبورے، دلربا وغیرہ ٹانگ دیے گیے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام وہ اپنی دکان میں ستار بجاتا، جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دکان دار اپنی دکانوں سے اٹھ اٹھ کر آ جاتے اور دیر تک بت بنے ستار سنتے رہتے۔ اس ستار نواز کا ایک شاگرد تھا جو ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوئی، سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا، غرض اس ستار نواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملاّ جی، جب تک تو یہ بستی زیر تعمیر رہی رات کو دیہات اپنے گھر چلے جاتے رہے۔ مگر اب جب کہ انہیں دونوں وقت مرغن کھانا بافراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض بیسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں پڑھنے آنے لگے، جس سے ملا جی کو روپے پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجہ کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھتے ہوئے کرایہ اور اپنی بے مائیگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے اس بستی کا رخ کیا اور ان بیسواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلہ پر میدان میں تنبو کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دے۔ اس کے ایکٹر اداکاری کے فن سے محض نابلد تھے۔ ان کے ڈریس پھٹے پرانے تھے جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشہ بھی بہت دقیانوسی دکھاتے تھے مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔ شہر کے مزدور پیشہ لوگ، کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غربا جو دن بھر کی کڑی محنت مشقت کی کسر شور وغل، خرمستیوں اور ادنیٰ عیاشیوں سے نکالنا چاہتے تھے، پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، ہنستے بولتے، بانسری اور الغوزے بجاتے، راہ چلتوں پر آوازے کستے، گالی گلوچ بکتے، شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازارِ حسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا، تھیٹر کا ایک مسخرہ تنبو کے باہر ایک سٹول پر کھڑا کبھی کولھو ہلاتا، کبھی منہ پھلاتا، کبھی آنکھیں مٹکاتا، عجیب عجیب حیا سوز حرکتیں کرتا

جنہیں دیکھ کر یہ لوگ زور زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہوئے۔ چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے "آؤ، کوئی نئی بستی کو" شہر سے پانچ کوس تک جو پکی سڑک جاتی تھی اس پر پہنچ کر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کے لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے۔ منہ سے ہارن بجاتے اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دوڑ میں غریب گھوڑوں کا برا حال ہو جاتا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔ رکشا والے، تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم دام پر سواریاں بٹھا، طرارے بھرتے اور گھنگھرو بجاتے اس بستی کو جانے لگے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے، جوق در جوق اس پر اسرار بازار کی سیر دیکھنے آتے، جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے پر تیار نہ ہوتی تھیں اب اس کی دن دگنی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے تو جھٹ زمینیں خرید، ان بیسواؤں کے ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دیے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اٹھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں، مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکان دار آ بسے جو عیال دار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہو گئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لیے درخواست بھیجی گئی، جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاکخانہ بھی کھول دیا گیا۔ ایک بڑے میاں ڈاکخانہ

کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے، کارڈ اور قلم دوات رکھ،بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں کا فساد ہو گیا جس میں سوڈا واٹر کی بوتلوں، چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہئے۔ تھیٹریکل کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی۔ اس شہر کے ایک سینما مالک نے سوچا کیوں نہ اس بستی میں بھی ایک سینما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا تا کہ تماشائی اگر بائیسکوپ شروع ہونے سے پہلے آ جائیں تو آرام سے باغیچہ میں بیٹھ سکیں۔ ان کے ساتھ لوگ یونہی ستانے یا سیر دیکھنے کی غرض سے آ کر آ کر بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصی سیر گاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سقے کٹورا بجاتے اس باغیچے میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کی تیل مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے، کاندھے پر میلا کچیلا تولیہ ڈالے، دل پسند، دل بہار مالش کی صدا لگاتے دردِ سر کے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

سینما کے مالک نے سینما ہال کی بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں تو ہوٹل کھل گیا جس میں رات کو قیام کرنے کے لیے کمرے بھی مل سکتے تھے اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا، ایک فوٹو گرافر، ایک سائیکل کی مرمت والا، ایک لانڈری والا، دو پنواڑی، ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دواخانہ کے آ رہے۔ ہوتے ہوتے پاس ہی ایک دکان میں کلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ فوٹو گرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آ ڈیرا جمایا اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھوں پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پرزوں میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد بستی میں نل، روشنی اور صفائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے سرخ جھنڈیاں، جریبیں اور اونچ نیچ دیکھنے والے آلے لے کر آ پہنچے اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چلنے لگا۔

اس واقعہ کو بیس برس گزر چلے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھرا پرا شہر بن گئی ہے جس کا اپنا ریلوے سٹیشن بھی ہے اور ٹاؤن ہال بھی، کچہری بھی اور جیل خانہ بھی، آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج، دو ہائی سکول، ایک لڑکوں کے لیے، ایک لڑکیوں کے لیے اور آٹھ پرائمری سکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سینما ہیں اور چار بنک جن میں سے دو دنیا کے بڑے بڑے بنکوں کی شاخیں ہیں۔

شہر سے دو روزانہ، تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی، دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی، ایک صنعتی، ایک طبی، ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں بیس مسجدیں، پندرہ مندر اور دھرم شالے، چھ یتیم خانے، پانچ اناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں سے ایک صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کے نام کی مناسبت سے "حُسن آباد" کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی۔ یعنی بجائے "حُسن آباد" کے "حَسن آباد" کہلانے لگا۔ مگر یہ نام چل نہ سکا کیونکہ عوام حُسن اور حسن میں امتیاز نہ کرتے۔ آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا جس سے یہ بستی آج سے سیکڑوں برس قبل اجڑنے سے پہلے موسوم تھی اور وہ نام ہے "آنندی۔"

یوں تو سارا شہر بھرا پرا، صاف ستھرا اور خوش نما ہے مگر سب سے خوبصورت، سب سے بارونق اور تجارت کا مرکز وہی بازار ہے جس میں زنانِ بازاری رہتی ہیں۔

آنندی بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں، "معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیرِ اثر اس ناپاک طبقے کو ہماری اس قدیمی اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دی گئی" اس مرتبہ ان عورتوں کے لیے

جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا۔

3.5 ''آنندی'' کا تنقیدی جائزہ

اُن تخلیقی توفیقات کا اندازہ کیے بغیر جو غلام عباس (1909-1982) کے افسانے کو ماجرا نویسوں کو محبوب ہو جانے والی حقیقت نگاری سے مختلف اور نمایاں کرتے چلے گئے ہیں، اس باکمال افسانہ نگار کو ڈھنگ سے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ غلام عباس جنھوں نے ۱۹۳۹ء میں ''آنندی'' لکھ کر ادبی دنیا میں ایک تہلکہ سا مچا دیا تھا۔سب حیرت سے اس افسانے کو دیکھتے تھے،اچھایوں بھی افسانہ لکھا جا سکتا ہے، کہ اس کا کوئی ایک مرکزی کردار نہ ہو،کوئی ہیرو ہو نہ اینٹی ہیرو، سب کچھ منظر ہو کر یوں کاغذ پر اترے کہ وقت پہلو بدلنا بھول جائے۔ وہ جو اِن کے قلم کے بارے میں کہا گیا کہ وہ نرم رو اور سبک سیر تھا تو اس کا سب سے کامیاب مظاہرہ اسی افسانے میں ہوا تھا۔خود غلام عباس کو بھی یہ افسانہ لکھتے ہی احساس ہو گیا تھا کہ ایک مصنف کی حیثیت سے ان کی زندگی میں ایک بہت بڑا موڑ آ چکا تھا۔انہوں نے بہت پہلے بچوں کے لیے کہانیاں اور نظمیں لکھنا شروع کر دی تھیں، تراجم کیے اور ماخوذ کہانیاں بھی دیں،افسانے بھی لکھے مگر جب پہلی بار ان کے افسانوں کا مجموعہ چھپا تو اس کا نام ''آنندی'' تھا؛ جی اس افسانے کے نام پر، جسے لکھ کر انہوں نے خود کو ایک تخلیق کار کے طور پر شناخت کیا اور جو ان کے فن کو عجب طرح کی توقیر دے گیا تھا۔غلام عباس نے اس مجموعے کے بارے میں لکھ رکھا ہے:''یہ افسانے میں نے دلّی میں ۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے وقفوں میں لکھے۔'' یہیں انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ انہوں نے ۱۹۳۹ء سے پہلے بھی متعدد افسانے لکھے،مگر اپنی تصنیفی زندگی کو ایک خاص سال سے اہم سمجھنے کی وجہ کچھ اور نہیں ''آنندی'' جیسا شاہکار افسانہ ہے۔غلام عباس کی تخلیقی شخصیت محض اس ایک افسانے کے منہا کرنے سے وہ رہتی ہی نہیں جو اِس افسانے کو تصور میں لاتے ہی بن جاتی ہے۔تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غلام عباس کے پاس اور کامیاب افسانے نہیں ہیں۔اوورکوٹ، فینسی ہیئر کٹنگ سیلون، ہمسائے، کتبہ، اُس کی بیوی، باجے والا، کن رس، دھنک۔۔۔پڑھتے جائیے اور مختلف لطف والا بیانیہ آپ کو زیادہ دُور نہیں جانے دے گا، باندھ کر کہانی کے آخر تک لے جائے گا۔ میں نے کئی ماجرا نویسوں کو بڑی بڑی ہانکتے سنا ہے مگر انہیں پڑھ جائے تو شروع سے آخر تک انہیں کہانی کہتے ہوئے اپنے بیان کو تخلیقی بیانیے میں

ڈھال لینے کی توفیق نہیں ہوتی۔ بس واقعہ واقعہ اور واقعہ، جو لکھنے والے کے اعصاب پر سوار رہتا ہے وہی وہ اپنے قاری کے اعصاب پر بھی سوار کر دیتے ہیں۔ غلام عباس کی حقیقت نگاری کی کوئی نسبت ایسے بے توفیقوں سے ہے ہی نہیں۔ ذرا دیکھئے وہ پورے منظر کو اور پورے ماحول کو اپنے بیانیے میں کیسے مختلف کر رہے ہیں:

''یہ چھوٹا سا کمرہ اپنی ہلکی نیلی روشنی کے ساتھ باہر سے یوں دکھائی دیتا، گویا ٹرین کا کوئی ٹھنڈا ڈبہ ہے۔''

''وہ (بدلیاں) دُور تک ایک کے پیچھے ایک اس طرح دکھائی دے رہی تھیں جیسے شرمیلی لڑکیاں بڑی عمر کی لڑکیوں کی اوٹ لے کر جھانک رہی ہوں۔''

''وہ سارے دارالسلطنت میں اس طرح گھوم گیا جس طرح کوئی دُور دراز ملک کا رہنے والا منچلا سیاح تھوڑے سے وقت میں کسی مشہور تاریخی شہر کا ایک ایک بازار کو دیکھنا اور ایک ایک سڑک پر سے گزرنا اپنے اوپر فرض کر لیتا ہے۔'

تو یوں ہے صاحب، کہ ٹھہر ٹھہر کر لکھنا اور اپنے تجربے کی تازگی، مشاہدے کی گہرائی اور انوکھے تخیل کو تخلیقی کٹھالی میں ڈال کر، پگھلا کر، ڈھال کر، سہار سہار کر لکھنا غلام عباس نے اپنے اوپر فرض کر لیا تھا۔ چونکائے بغیر، واقعات میں اُتھل پتھل کیے بغیر، زندگی کو یوں لکھنا جیسی وہ تھی، مگر اُسے یوں لکھ دینا کہ عین مین ویسی نہ رہے جیسی وہ تھی۔

۱۹۰۹ء میں امرتسر میں پیدا ہونے والے غلام عباس کی زندگی کا وہ دورانیہ جو ۱۹۳۹ء سے پہلے کا تھا، ایک تخلیق کار کی حیثیت سے چاہے غلام عباس کے لیے اہم نہ ہو، ان کی تخلیقی زندگی میں بعد میں یوں ظاہر ہوا کہ ان کے فکشن کے لیے بہت اہم ہو گیا ہے۔ ابھی وہ شیر خوار تھے کہ ان کا باپ مر گیا۔ ماں نے دوسری شادی کی اور ابھی نو سال کے ہی تھے کہ ایک بار پھر یتیم ہو گئے۔ چار سال کے ہوئے تو امرتسر سے لاہور آ گئے۔ ماں نانی اور نانی کی بہن، یہیں بھاٹی گیٹ کے قریب ایک مکان میں رہے۔ کمانے والا کوئی نہ تھا، ماں نے پان سگریٹ اور مٹھائی کی چھوٹی سی دکان بنا لی، ذوق عمدہ تھا ناول وغیرہ پڑھتی رہتی تھیں۔ یہ پڑھنا غلام عباس نے ماں سے لیا۔ چھوٹی عمر میں ماں نے انہیں امام حسین علیہ السلام کا ملنگ بنا کر در در کا منگتا بھی بنایا تھا، اس سے

ان کا مزاج بہت کچھ سہہ لینے پر قادر ہوا۔نویں جماعت میں تھے کہ انگریزی نظموں اور کہانیوں کا ترجمہ کرنے لگے اور معاوضہ ملنے لگا، گویا ماں کے معاون ہو گئے۔اسی زمانے میں ان کی ملاقاتیں عبدالرحمٰن چغتائی، ڈاکٹر تاثیر اور نیرنگ خیال والے حکیم یوسف حسن سے ہوئیں کہ وہ سب وہاں ایک پان والی دکان پر اکٹھے ہوتے تھے۔نویں پاس نہ کر سکے تو سکول سے اُٹھوالیا گیا۔سوچا کیا کر سکتے ہیں،موسیقی سیکھنے کی طرف نکل گئے۔بعد میں پڑھا بھی اور بہت کچھ حاصل بھی کیا مگر زندگی کا یہ دورانیہ ان کے افسانوں میں بار بار ظاہر ہوا ہے۔یہ زمانہ بھی،اور وہ زمانہ بھی کہ جب وہ آل انڈیا ریڈیو کے رسالے''آواز'' کے ایڈیٹر تھے۔اور ان کا دفتر پرانی دلّی کے علی پور روڈ پر واقع تھا اور گھر نئی دلّی کی ایک لین میں،یعنی شہر کے دوسرے سرے پر۔تو جو کچھ اُن پر بیتا اور جو کچھ انہوں نے دیکھا، جو کچھ انہوں نے سہا اور جس کا اُنہوں نے تخیل باندھا وہ اُن کی زندگی سے کٹا ہوا نہیں تھا۔مثلاً دیکھیے کہ تیس روپے ماہانہ کی ملازمت کا وہ تجربہ جو انہوں نے اسٹیشن کے مال گودام پر حاصل کیا تھا،''فینسی ہیئر کٹنگ سیلون''اور''چکر'' لکھتے ہوئے یاد آ جاتا ہے۔''تنکے کا سہارا'' لکھتے ہوئے وہ اپنے یتیم ہونے کے تجربے سے جڑ رہے ہوتے ہیں،حتیٰ کہ''آنندی''اور''سایہ'' میں پان والی دکان کو اس پان والی دکان سے الگ کر کے کیوں کر دیکھا جا سکتا ہے،جس کا ذکر اُن کی ماں کے حوالے سے اوپر ہو چکا۔

دلّی میں قیام کا زمانہ تو ان کے کامیاب افسانوں کے ریشے ریشے میں بسا ہوا دِکھتا ہے۔بات ''آنندی'' سے شروع ہوئی تھی،تو اسی کا قصہ خود غلام عباس کی زبان سے سنیے۔انہوں نے بتا رکھا ہے کہ دوسری عالمی جنگ شروع ہونے سے کچھ ہفتے پہلے،انہوں نے یہ افسانہ لکھا تھا۔ان دنوں وہ دلّی میں تھے اور وہاں کے مشہور بازار چاوڑی کو طوائفوں سے خالی کرا کے انہیں شہر سے باہر دھکیل دیا گیا تھا۔جس سڑک پر ان زنان بازاری کو منتقل کیا گیا وہ غیر آباد تھی۔سڑک کے دونوں طرف چوں کہ خالی زمین پڑی تھی،اس لیے دلّی کے شرفا کے لیے کم''خلل رساں'' سمجھ کر میونسپل کمیٹی نے اسے طوائفوں کو الاٹ کر دیا گیا تھا۔غلام عباس دفتر آتے جاتے وہاں سے گزرتے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ پہلے پہل تو ہفتوں زمین ویسے ہی بے آباد پڑی رہی پھر اس نے انگڑائی لی راج مزدور آ گئے اور جوشِ تعمیر جنوں کی حدوں کو چھونے لگا۔یہی تجربہ'آنندی' میں ہے مگر محض یہ مشاہدہ اس افسانے میں نہیں اور بھی بہت کچھ ہے،ایسا کہ جسے شاید سہولت سے بیان ہی نہیں کیا جا

سکتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس افسانے کا آغاز بلدیہ کے اجلاس کی کارروائی کی رپورٹنگ سے ہوتا ہے۔ اس اجلاس میں زندگی کے مختلف شعبوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والے زنان بازاری کو شہر بدر کیے جانے کے حق میں اپنے اپنے دلائل دے رہے ہیں۔ سب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔ یہیں بیانیہ ہم پر بازار کی تجارتی اہمیت اُجاگر کرتا ہے اور مختلف سطحوں پر اس بازار کے عام زندگی میں دخیل ہونے کی صورتوں کو سامنے لاتا ہے۔ افسانہ ہمیں باور کرا دیتا ہے کہ نئی زندگی کے مرکز میں بازار ہے۔ اسی سے نہ صرف سب مردوں کو، ان کی بہو بیٹیوں کو بھی گزرنا ہوتا ہے۔ ایسے میں جاری بحث کا خلاصہ یہ بنتا ہے کہ شریف زادیاں جب آبرو باختہ، نیم عریاں بیسواؤں کا بناؤ سنگھار دیکھتی ہیں تو غریب شوہروں سے فرمائشیں کرتی ہیں۔ طبلے کی تھاپ سے زندگی کا وہ بے ہنگم پن خطرے میں پڑ جاتا ہے، جس کے وہ عادی ہیں۔ یہیں ایک پنشن یافتہ معمر رُکن کی آواز بھراتے دکھایا گیا ہے جس کا مکان بازار کے وسط میں تھا، اور کسی رُکن سے یہ سوال بھی پچھوا لیا گیا ہے کہ آخر یہ طوائفیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ اس کا جواب سماج کی طرف سے فقط ایک قہقہہ ہے۔ جی، یہ افسانے میں بتا دیا گیا ہے۔

افسانے میں بھی وہی کچھ ہوتا ہے جو غلام عباس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بازاری عورتوں کے مکانات خرید کر اُنھیں شہر سے چھ کوس باہر ایک ویرانہ الاٹ کر دیا جانا۔ غلام عباس کا قلم یہاں جادو دکھاتا ہے اور زندگی کی تفہیم کرتے ہوئے، جنس کو زندگی کے عین وسط میں متعین کر دیتا ہے حتیٰ کہ ادبدا کر پھر سے آدمی اس جنس کو آلائش سمجھتے ہوئے اپنی زندگی، کہہ لیجیے سو کالڈ پاکیزہ زندگی سے کاٹ کر دُور پھینکنے کے جتن کرنے لگتا ہے۔ اس افسانے کو پڑھتے ہوئے آج کے کارپوریٹ اداروں کی بالادستی کے عہد میں عورت کا پراڈکٹ بن جانا بھی سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ اگر افسانہ یہ بتا رہا ہے کہ پانسو بیسواؤں میں سے چودہ ایسی تھی کہ خوب مالدار تھیں اور انھوں نے مکانات بنوانا شروع کر دیے تھے تو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان بیسواؤں کو کس کی سرپرستی حاصل تھی، گویا سرمایہ بیسوؤں پر سرمایہ کاری کر رہا تھا۔ اچھا یہ بھی دیکھئے کہ تعمیر کو مزدور، معمار تو آنے ہی تھے مگر حیران کن سلیقے سے غلام عباس نے بتایا ہے کہ وہاں سب سے پہلے اللہ کا نام بلند ہوا۔ حُسن آباد، جسے بعد میں حسن آباد کا نام دینے کی کوشش کی گئی اور جس کا سرکاری نام ''آنندی'' ہوا، اس میں ایک جگہ پر مسجد کے

آثار تلاش کر لیے گئے، کنواں بحال ہوا، مسجد بن گئی تو اذان بھی دی گئی۔ ایک امام کی ضرورت تھی کسی گاؤں کا ملا وہاں پہنچ گیا۔ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار بھی وہاں مل گیا تھا۔ اس کی پھوٹی قسمت جاگ اٹھی، ایک لمبا تڑنگا مست فقیر آگیا، پیر کڑک شاہ کی جلالی کرامات کا ذکر ہونے لگا۔ گویا اللہ کے نام پر حُسن آباد، آباد ہو رہا تھا۔ ایک بڑھیا ایک لڑکے کے ساتھ مسجد کے قریب ایک درخت تلے گھٹیا سگریٹ، بیڑی چنے اور گڑ کی مٹھایوں کا ٹھیلا لگا کر بیٹھ گئی۔ مذہبی وسائل، عورت اور پسا ہوئے سماج کے کارکن، سب ہی بازار کی بھٹی کا ایندھن بننے لگے۔ بوڑھا شربت لگا کر بیٹھ گیا، سری پائے والا آیا اور خربوزے والا بھی۔ خوانچے والا کبابی، تندور والا، شہر کے شوقین، لچے لفنگے سب وہاں پہنچ گئے۔ رونق بڑھتی گئی، چھ مہینے میں چودہ مکان بن گئے، ہر مکان کے نیچے چار چار دکانیں، بدھ کو نیاز دلوائی گئی، دیگیں پکیں، شامیانے کرسیاں لگیں اور نیا شہر بس گیا، بیسوائیں، بناؤ سنگھار رقص وسرود، نازنخرے، شراب کی بوتلیں۔ دکانوں پر کرائے دار آگئے۔ پہلے تھریٹکل کمپنی نے تمبو لگائے پھر وہاں سینما بنا، ڈاکخانہ، بینک، اسکول، ریلوے اسٹیشن، جیل، کچہری۔ تو یہ ہے وہ سارا ہنگامہ جو غلام عباس نے اس افسانے میں دکھایا ہے اور اسی سے یہ نکتہ بھی بہت سلیقے سے سجھا دیا ہے کہ زندگی کو اسی دائرے میں گھومنا ہوتا ہے اور اسی دائرے میں گھومتے رہے گی۔

3.6 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے آپ کو سب سے پہلے غلام عباس کے حالاتِ زندگی سے واقف کرایا۔ غلام عباس ۱۷، نومبر ۱۹۰۹ء کو پنجاب کے شہر امرتسر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے امرتسر اور لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ ابتدا ہی سے انہیں لکھنے لکھانے اور دیگر زبانوں کے ادب کے مطالعہ کا شوق تھا۔ انہوں نے ترجمہ نگاری کی طرف بھی توجہ دی۔ ان کی پہلی کہانی ۱۹۲۵ء میں رسالہ ''ہزار داستان'' میں شائع ہوئی۔ ۱۹۳۵ء سے انہوں نے باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ ''پھول'' اور ''تہذیب نسواں'' جیسے جرائد کے اداروں سے بھی وہ وابستہ رہے۔ تقسیم ہند سے پہلے وہ آل انڈیا ریڈیو سے متعلق تھے۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان گئے اور وہاں ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہوئے۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انہیں کئی ایوارڈ مل چکے ہیں۔ حکومت پاکستان نے انہیں ''ستارۂ امتیاز'' سے نوازا۔

غلام عباس کی افسانہ نگاری کا آغاز ترقی پسند تحریک سے پہلے ہو چکا تھا۔ان کے ہم عصروں میں علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو اور عزیز احمد وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔غلام عباس نے اپنی راہ آپ نکالی اور زیادہ نہ لکھنے کے باوجود اپنی انفرادیت اور امتیازی حیثیت پیدا کی۔غلام عباس کے افسانوں میں آس پاس اور اطراف واکناف کی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔انہوں نے عام زندگی کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔اوورکوٹ، فینسی ہیر کٹنگ سیلون اور ایسے ہی افسانوں سے اندازہ ہوگا کہ ہماری معاشرت پر ان کی کتنی تیز نظر ہے۔غلام عباس کے افسانوں کا ایک اہم موضوع طوائف بھی ہے۔اردو میں طوائف کے موضوع پر افسانوں کی کمی نہیں لیکن غلام عباس طوائف کو معاشرے کی حالت کا ذمہ دار قرار نہیں دیتے بلکہ معاشرے کے نام نہاد مصلحین کو نشانہ بناتے ہیں۔''آنندی''،''بھنور'' اور ''اس کی بیوی'' پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ یہ افسانے طوائف کے موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔تقسیم ہندی کے موضوع پر بھی غلام عباس کے ہاں افسانے مل جائیں گے۔فرقہ وارانہ فسادات اور ترک وطن، تقسیم ہند کا ردِعمل ہیں۔''تنکے کا سہارا'' اور ''فینسی ہیر کٹنگ سیلون'' اس کا بہترین اظہار ہیں۔غلام عباس نے ایسے افسانوں میں بازآبادکاری، غربت، بے کسی کی مصوری کی ہے اور انسان دوستی اور ہمدردی کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

منظر نگاری سے غلام عباس نے خوب خوب کام لیا ہے اور جزئیات نگاری بھی وہ فنکارانہ انداز سے کرتے ہیں۔نفسیات نگاری میں بھی غلام عباس کو کمال حاصل ہیں۔ خاص طور پر ان کا افسانہ ''بردہ فروش'' نفسیات نگاری کے زاویہ سے یاد رکھا جائے گا۔یہی حال کردار نگاری کا بھی ہے۔ان کے کردار زندگی دوست ہیں۔ پڑھتے ہوئے ان کرداروں میں ہم زندگی پاتے ہیں۔یہ کردار ہمارے ساتھ چلتے پھرتے، جیتے جاگتے محسوس ہوتے ہیں۔خاص طور پر ''اُس کی بیوی''،''بھنور''،''بردہ فروش'' اور ''ایک دردمند دل'' کے کردار۔غلام عباس کوئی مصلح نہیں اور نہ بادی النظر میں اصلاح کی سعی کرتے ہیں لیکن ان کے ہاں بین السطور میں اصلاح کا جذبہ مضمر ہوتا ہے۔غلام عباس نے رومانی افسانے بھی لکھے۔''تپلی بائی'' ایک ایسا ہی افسانہ ہے۔

غلام عباس کا افسانہ ''آنندی'' کئی زاویوں سے متوجہ کرتا ہے۔اس افسانے کا موضوع طوائف

ہے۔لیکن غلام عباس نے ''آنندی'' میں زندگی کے اور کئی پہلوؤں کو سمیٹ لیا ہے۔شہر میں زنانِ بازاری کے وجود پر بلدیہ کے اجلاس میں بحث ہوتی ہے۔ارکان بلدیہ اظہار خیال کرتے ہیں کہ شہر میں بدمعاشی، چوری، جعل سازی، منشیات کے استعمال قتل و غارت گری اور خودکشی کا سبب یہی طوائفیں ہیں، چنانچہ طے پاتا ہے کہ شہر سے چھ کوس دور ایک ویران اور اجاڑ علاقہ میں ان کو بسا دیا جائے۔تھوڑی بہت لیل ولعل کے بعد طوائفیں آمادہ ہوجاتی ہیں اور وہ اس غیر آباد علاقہ میں اپنے مکانات کی تعمیر شروع کر دیتی ہیں۔دوڈھائی ہزار مزدور اپنے کام پر لگے ہیں اور ان کی ضرورتوں کے اعتبار سے دوسرے پیشہ ورڈ کاندار وغیرہ یہاں چلے آتے ہیں۔ چند ایک سال میں ڈاک خانہ، پولیس اسٹیشن اور تھیٹریکل کمپنی بھی کھل جاتی ہے۔فوٹو گرافر، کلال اور جیل خانہ بھی آجاتا ہے۔مسجدیں اور منادر بھی تعمیر ہوجاتے ہیں۔غرض کوئی بیس سال میں یہ علاقہ جو کبھی ویرانہ تھا،مکمل اور پر رونق شہر کی طرح آباد ہوجاتا ہے۔جس کی اپنی مجلس بلدیہ بھی ہوتی ہے۔لیکن پھر وہی ہوتا ہے جس کا اندیشہ تھا۔مجلس بلدیہ یہاں بھی درمیانِ شہر سے زنانِ بازاری کو نکال باہر کرنے کی قرارداد منظور کرتی ہے اور طے پاتا ہے کہ ان زنانِ بازاری کو شہر سے کوئی بارہ کوس دور ویرانے میں بسا دیا جائے....غلام عباس دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زنانِ بازاری کا خاتمہ ممکن نہیں۔یہ معاشرہ کی ''ضرورت'' ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں رہیں گی۔ان کو شہر سے خواہ کتنی ہی دور بسایا جائے گا کل پھر یہ شہر آباد کردیں گی۔اور اب تو طوائف کے جدید ایڈیشن کی صورت میں کال گرل موجود ہے۔غلام عباس نے اس افسانے میں منظر نگاری اور جزئیات نگاری سے خوب خوب کام لیا ہے۔کرداروں کے خصوص میں کہنا یہ ہے کہ ''آنندی'' میں ایسے کوئی واضح کردار نہ ہوں، تاجر پیشہ ور،فن داں اور مزدور وغیرہ اپنی اپنی جگہ کردار ہیں اور بھرپور کردار۔اور افسانہ نگاروں کے طوائف کے موضوع پر افسانوں کے برعکس غلام عباس کا یہ افسانہ اور نوعیت کا ہے۔یہ افسانہ پڑھتے ہوئے طوائف سے نفرت نہیں ہوتی بلکہ معاشرہ ایک ویلن اور غاصب کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ حقیقت نگاری سے اس افسانے میں غلام عباس نے خوب خوب کام لیا ہے۔

3.7 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں تحریر کیجیے۔

۱۔ غلام عباس کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیجیے۔

۲۔ افسانہ ’’آنندی‘‘ کا فنی اور ادبی تجزیہ کیجیے۔

۳۔ آنندی کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

۱۔ غلام عباس کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ غلام عباس کے افسانوں میں نفسیات نگاری اور کردار نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

۳۔ افسانہ ’’آنندی‘‘ پر مختصراً اظہارِ خیال کیجیے۔

3.8 فرہنگ

الفاظ		معنی
غیر منقسم	=	جو تقسیم نہیں ہوا (مراد ۱۹۴۷ء سے قبل کا پنجاب)
منسلک	=	وابستہ
سبک دوش	=	آزاد، بے تعلق
ہم عصر	=	ایک ہی زمانے کے
سیمیا	=	ایسی اشیا جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہ ہو
نمود	=	ظاہر ہونا
برافگندۂ نقاب	=	نقاب اُٹھانا، ظاہر ہونا
استحصال	=	بالجبر حاصل کرنا، زبردستی حاصل کرنا
بازآبادکاری	=	دوبارہ بسانا

مساعی	=	سعی کی جمع، کوششیں
قحبہ	=	بدچلن عورت
مابعد	=	اس کے بعد
جزئیات نگاری	=	چھوٹی چھوٹی بات کو بیان کرنا
بھوبھل	=	گرم راکھ، ریت
تلاطم	=	موجوں کا زور، طوفان
مصلح	=	اصلاح کرنے والا
بادی النظر	=	ابتدائی نظر میں، دیکھتے ہی
بین السطور	=	سطروں کے درمیان
مضمر	=	پوشیدہ، چھپا ہوا
گھٹیا	=	کم قیمت، معمولی
ترسیل	=	بھیجنا، روانہ کرنا
آنکنے	=	اندازہ کرنے

3.9 مزید مطالعہ کے لیے کتب

۱۔ طاہر مسعود یہ صورت گر کچھ خوابوں کے

۲۔ ڈاکٹر صادق ترقی پسند اردو افسانہ۔

اکائی 4۔افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''

سعادت حسن منٹو

اکائی کے اجزاء:

4.1 مقاصد

4.2 تمہید

4.3 مصنف کا تعارف

4.4 سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری

4.5 افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''

4.6 خلاصہ

4.7 فرہنگ

4.8 مشقی سوالات

4.9 مزید مطالعہ کے لیے کتب

4.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور اس کے افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری سے متعارف کرانا ہے۔اس اکائی کی تکمیل کے بعد آپ کو درج ذیل نکات سے واقفیت حاصل ہو جائے گی۔

(۱) افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' میں کس واقع کو پیش کیا گیا ہے؟

(۲) ہندو پاک کی تقسیم کے بعد ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے تلخ ردعمل پر اظہار خیال کیجیے۔

(۳) پاگل خانہ کے پاگل بھی اس فیصلہ کے خلاف کیوں تھے؟

(۴) اردو افسانہ میں منٹو کا مقام، مرتبہ متعین کیجیے؟

4.2 تمہید

''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' سعادت حسن منٹو کا بلند پایہ افسانہ ہے۔اس افسانہ میں انھوں نے برصغیر کی تقسیم پر اپنے تلخ ردعمل کا اظہار کیا۔ان کا خیال ہے کہ سیاست دانوں کے علاوہ اس ملک کےعوام اس فیصلہ سے خوش نہیں تھے۔ یہاں تک کے پاگل خانہ کے پاگلوں نے بھی اس فیصلہ کے خلاف اپنے شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے۔

سعادت حسن منٹو کا شمار اردو کے چند بلند پایہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے زیادہ تر افسانے طوائفوں اورجنسی موضوعات پر لکھے ہیں۔منٹو نے اپنے افسانوں میں طوائفوں کی زندگی اوران کے ماحول کی سچی اورحقیقی عکاسی کی ہے۔

4.3 سعادت حسن منٹو(تعارف)

سعادت حسن منٹو ١١/مئی/١٩١٢ء کوسمرالہ ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔آباء واجداد اٹھارویں صدی کے آخر میں کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آئے۔اور لاہور مین بس گئے۔خاندانی پیشہ سوداگری تھا اورانتہائی دین دارلوگ تھے۔غلام حسن منٹو کے والد تھے۔جنہوں نے دوشادیاں کیں۔منٹودوسری بیوی کے پاس تھے۔ صفیہ بیگم کےبطن سے چار بچے ہوئے۔پہلالڑکا عارف جس کا دیڑھ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

منٹوکو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔دودفعہ ایف،اے۔میں فیل ہوئے۔ناکامیابی کے بعدتھرڈ ڈویژن سے پاس ہوئے۔پڑھائی سے بددلی اورذہنی انتشار کے سبب دوستوں کےساتھ مل کرشراب ،سگریٹ، چرس اورکوکیں کا سہارالیا۔باری صاحب نے منٹو کے ذہن کوسمجھا اورتین مہینے ان کی صحبت میں رہنے کے بعد صحافت کی طرف راغب ہوئے۔منٹوکی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز وکٹر ہیوگوکےاورآسکر وائلڈ کے ڈرامے ویرا سے ہوتا ہے باری صاحب نے ان کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں کو باقاعدہ کتاب کی شکل دے کر تیس روپئے میں فروخت کیا۔اس طرح وہ کاتب بن گئے۔١٩٣٥ء سے١٩٤٧ءتک وہ بمبئی میں رہے۔بعد میں دہلی میں ایک ڈیڈھ سال تک آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے۔١٩٤٨ءمیں وہ پاکستان چلے گئےاور١٨ جنوری ١٩٥٥ءکوصرف ٤٣ سال کی عمر میں لاہور میں ابدی نیندسو گئے۔

4.4 منٹو کی افسانہ نگاری

سعادت حسن منٹو کا شمار صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ کہانی کہنے اور لکھنے کے گر سے بخوبی واقف تھے۔ ان کی کہانی اپنی اچھوتی ساخت کی وجہ سے فوراً پہچانی جاتی ہے۔ ان کے افسانوں میں الفاظ کی بندش اور غضب کی چستی پائی جاتی ہے ہے۔ وہ لمبے لمبے جملے اور غیر ضروری بیانات سے گریز کرتے ہیں۔ تفصیل میں جانے کے بجائے اشارے کنایے سے باتوں کو مکمل کر دیتے ہیں۔ ہر فنکار کی طرح منٹو کی بھی ایک ذہنی ساخت تھی، جس کی بنیاد پر وہ اپنے موضوع کا انتخاب کرتے تھے۔ منٹو کے پسندیدہ موضوعات فرقہ وارانہ فسادات، جنسی ونفسیاتی مسائل، تقسیم ہند کا المیہ اور زندگی کے گھناؤنے پہلو ہیں۔ وہ اپنے دور کے سب سے زیادہ باغی تخلیق کار، فراڈ، جھکی اور فحش نگار بھی قرار دیے جاتے ہیں۔ ان کے فن پر طرح طرح سے نکتہ چینی کی گئی، اعتراضات کیے گئے اور مقدمے چلائے گئے لیکن پلڑا منٹو کی طرف ہی جھکا اور انہیں سرخروئی حاصل ہوئی۔ فحش نگاری کی منٹو کمزوری ہے لیکن جہاں ایک طرف کمزوری ہے وہیں دوسری طرف ان کی طاقتر بھی ہے۔ جہاں اُنہوں نے مخفی رازوں کو بے نقاب کرنے کی غرض سے جنسی موضوعات کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا وہیں وہ ایک کامیاب حقیقت نگار کی شکل میں ابھرے ہیں۔ انہوں نے انسانی زندگی اور سماج کے تلخ تجربات کو پیش کیا ہے۔ منٹو کے اندر ایک اچھے فنکار کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ وہ ایک فطری فنکار ہیں۔ اپنے افسانے کے بارے میں منٹو نے خود کہا ہے:

''زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے واقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ قابل برداشت ہے۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں، جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔'' [بحوالہ سعادت حسن منٹو، پریم گوپال متل۔ ص۱۴]

گرچہ منٹو کی شناخت افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے لیکن، ان کی ادبی زندگی کا آغاز ترجمہ سے ہوتا ہے۔ دراصل منٹو پر ابتدا میں روسی ادیبوں کا بہت اثر رہا ہے۔ خاص طور پر گورکی، چیخوف، ترگنیف، گوگول، دیگر

ادیبوں میں لارنس فرائیڈ اور موپساں ہیں۔ان کے فن کا منٹو نے کافی مطالعہ کیا ہے،مضامین لکھے ہیں اور خود ان کے اثرات شعوری یا غیر شعوری طور پر منٹو کے فن پر پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ منٹو اس پیروی کا قطعی اعتراف نہیں کرتے لیکن اگر ہم غور کریں تو پائیں گے کہ منٹو نے گورکی کے بارے میں لکھا ہے:

''گورکی افسانہ لکھنے سے پیشتر چاروں طرف نگاہ دوڑا کر حقیر سے حقیر واقعات کو بھی فراہم کر لیتا ہے کہ شاید وہ کسی جگہ کے لیے موزوں ہوں۔شوربے کی تلخی،مرد کے بوٹ سے چمٹی ہوئی برف،کسی عورت کے بالوں میں اٹکے ہوئے برف کے گالے،لکڑیاں کاٹتا ہوا لکڑ ہارا، دہقانوں کی بھدی گفتگو، پیانو کے چھیڑتے ہوئے پردے،سنتری کی آنکھوں میں حیوانی جھلک۔۔۔۔۔'' [منٹو کے مضامین ص ۲۴۶]

منٹو کی افسانہ نگاری کا آغاز سیاسی افسانوں سے ہوتا ہے جس میں نیا قانون، ۱۹۱۹ء کی ایک رات، سوراج کے لیے اور یزید کافی اہم ہیں۔تقسیم کے بعد منٹو کے افسانوں کے گیارہ مجموعے شائع ہوئے جو تقریباً ۱۰۰/افسانوں پر مشتمل ہیں اور جن میں بیشتر فن کے بہترین نمونے ہیں۔منٹو نے رومانی افسانے بھی لکھے ہیں لیکن یہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔اس کی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ خود منٹو کا ذہن رومان پسند نہ تھا۔اس زمرے میں عشق حقیقی، دوقومیں،عشقیہ کہانی، جاؤ حنیف جاؤ،سودا بیچنے والی، اور پشاور سے لاہور تک شامل ہیں۔ طوائف کی زندگی پر منٹو نے ایسی ایسی کہانیاں لکھی ہیں جن کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ہتک، کالی شلوار، دس روپے، جانکی، پہچان،فوبھابائی، شاردا، سراج، سوکینڈل پاور کا بلب اور سرکنڈوں کے پیچھے اس موضوع پر بہترین کہانی ہیں۔

منٹو کے افسانوں میں فنی خصوصیات مثلاً کردار نگاری، پلاٹ، مکالمے اور زبان و بیان کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔محمد حسن عسکری نے منٹو کو موضوع اور ہیئت کا پیشرو کہا ہے۔افسانے کے ضمن میں منٹو نے تمہید، وسط اور انجام پر بھی خاص توجہ دی ہے۔انہوں نے اپنی تمہید سے خاص کام لیا ہے۔وہ اس کے ذریعے کردار کا تعارف کراتے ہیں،کبھی کردار کی ذہنی،نفسیاتی اور داخلی کیفیت کو پیش کرتے ہیں،کبھی کہانی کے لیے ماحول تیار کراتے ہیں،کبھی کردار کی ذہنی،نفسیاتی اور داخلی کیفیت کو پیش کرتے ہیں،کبھی کہانی کے لیے ماحول تیار کرتے ہیں،کبھی موضوع سے واقف کراتے ہیں اور کبھی آنے والے واقعات کے لیے زمین ہموار کرتے

ہیں، غرض کہ ان کے افسانوں کی تمہید کئی کام کرتی ہے جو عموماً قاری کے ذہن پر چھا جاتی ہے۔

منٹو اپنے کرداروں کو حقیقی روپ میں پیش کرنے کے قائل ہیں۔ ان کے کردار شیطان یا فرشتے نہیں ہوتے بلکہ گوشت پوشت کے انسان ہوتے ہیں جو اپنی تمام تر برائیوں اور خوبیوں کے ساتھ قاری کے سامنے آتے ہیں۔ اس بات سے بے خبر کہ ان سے نفرت کی جائے گی یا محبت ان کی یہی سادگی، ان کی اصلیت انہیں انسان دوست اور ہمدردی کا مستحق بنا دیتی ہے اور قاری کی تمام تر ہمدردیاں اور نیک خواہشات ان کرداروں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ یہیں پر منٹو کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ یہی ان کی خواہش بھی ہے کہ قاری ان کے کرداروں کا احترام کریں اور ان کے فن کی قدر کریں۔

4.5 افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا بھی تبادلہ ہونا چاہیے۔ یعنی جو مسلمان پاگل ہندوستان کے پاگل کانوں میں ہیں انہیں پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انہیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول۔ بہر حال دانشمندوں کے فیصلے کے مطابق اِدھر اُدھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بلآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لئے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے۔ وہیں رہنے دیئے گئے تھے۔ باقی جو تھے ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے۔ اس لئے کسی کو رکھنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو سکھ پاگل تھے سب پولیس کی حفاظت میں سرحد پر پہنچا دیئے گئے۔

ادھر کا معلوم نہیں۔ لیکن ادھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دل چسپ چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ ''زمیندار'' پڑھتا تھا اس کے ایک دوست نے پوچھا ''مولبی ساب یہ پاکستان کیا ہوتا ہے۔''؟ تو اس نے بڑے غور وفکر کے بعد جواب۔ ''ہندوستانی میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں۔''

یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک اور سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا۔''سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جارہا ہے۔۔۔ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔''

دوسرا مسکرا دیا۔''مجھے تو ہندوستلوڑوں کی بولی ہے۔۔۔۔ہندوستانی بڑے شیطانی آکڑ آکڑ پھرتے ہیں۔ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔بعض پاگل ایسے بھی تھے۔ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے لا کر پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے۔لیکن صحیح واقعات سے یہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور پہرے دار سپاہی ان پڑھ اور جاہل تھے۔ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائداعظم کہتے ہیں۔اس نے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے۔یہ کہاں ہے؟اس عمل وقوع کیا ہے ۔اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔اگر ہندوستان میں ہیں یو پاکستان کہاں ہے۔اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان،اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہوگیا۔جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان کے نازک مسئلے پر تھی۔سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا۔۔۔میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں۔۔۔۔میں اسی درخت ہی پر رہوں گا۔

بڑی مشکل کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔اس خیال سے اس کا دل بھر آیا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم۔ایس سی،پاس ریڈیو انجنیئر جو مسلمان تھا اور سرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ باغ کی

ایک خاص روش پر سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا۔ یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفع دار کے حوالے کر دئے اور ننگ دھڑنگ سارے باگ میں چلنا شروع کر دیا۔

چینوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا ایک سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں مبتلا ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امرت سر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہو گئی تھی۔ گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنہوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیئے۔۔۔ اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل برا نہ کرے اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے۔ مگت وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس خیال سے کہ امرت سر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یورپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت رنج ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں اس مسئلہ پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں ان کی حیثیت کس قسم کی ہو گئی۔ یوروپین وارڈ رہے گا یا اُڑ جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انہیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنی پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان پر عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے۔ ''اوپڑی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیان دمنگ دی دال آف دی

لالٹین۔'' دن میں سوتا تھا نہ رات میں۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لحظے کے لئے بھی نہیں سویا۔ لیٹا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں۔ مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا۔ ''اوپڑی گڑگڑ دی اینکس دی بے دھیانا وی منگ دی دال آف دی پاکستان گورنمنٹ۔''

لیکن بعد میں آف دی پاکستان گورنمنٹ کی جگہ اوف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ و گورنمنٹ نے لے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں، وہ بتانے کی کوشش کرتے تھے وہ خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے۔ کیا پتہ ہے کہ لاہور جواب پاکستان میں ہے کل ہندستان میں چلا جائے گا۔ اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہو جائیں گے۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کے بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا اس لئے داڑھی اور بال آپس میں جم گئے تے۔ جن کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی مگر آدمی بے ضرف تھا۔ پندرہ برسوں میں کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے وہ اس کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمین دار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔

مہینے میں ایک بار ملاقات کے لئے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر سب اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو قطعاً یہ معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا

ہے۔ مہینہ کون سا ہے۔ یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لئے آتے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آ رہی ہے۔اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگا کرتا۔ اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا نکلوا کے پہنتا اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار۔''او پڑی گڑ گڑ بڑ وی اینکن دی بے دھیانا وی منگ دی وال آف دی لالٹین'' کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینہ ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہوگئی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھ میں آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی ہے۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا کہ ملنے والے آ رہے ہیں۔ پر اب جیسے اس دل کی آواز بھی بند ہو گئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے۔ اور اس کے لئے پھل مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو یقیناً اُسے بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ کیوں اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو ''خدا'' کہتا تھا۔ اس سے جب ایک بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں، تو اس نے حسبِ عادت قہقہہ لگایا اور کہا۔''وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔ اس لئے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں لگایا۔

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت سماجت سے کہا کہ وہ اسے حکم دے دے تا کہ جھنجھٹ

ختم ہو،مگر وہ بہت مصروف تھا اس لئے کہ اسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ایک دن تنگ آ کر وہ اس پر برس پڑا۔''او پڑی گڑگڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف واہے گرو جی دا خالصہ ایند واہے گورو جی کی فتح۔جو بولے سونہال ست اکال۔''

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہوتے ضرور میری سنتے۔

تبادلے میں کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا ملاقات کے لئے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا، جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا مگر سپاہیوں نے اسے روکا۔''یہ تم سے ملنے آیا ہے۔تمہارا دوست فضل دین ہے۔''

بشن سنگ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا،فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔''میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی۔۔۔تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے تھے۔۔۔مجھ سے جتنی مدد ہوسکی میں نے کی۔۔۔تمہاری بیٹی روپ کور۔۔۔۔''

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔۔۔۔بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا۔

''بیٹی روپ کور۔''

فضل دین نے رک رک کر کہا۔''ہاں۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔''

بشن سنگھ خاموش رہا۔فضل دین نے کہنا شروع کیا۔''انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری خیر خیریت پوچھتا رہوں۔۔۔اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان جارہے ہو۔۔۔ بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے سلام کہنا ۔۔۔ اور بہن امرت کور سے بھی۔۔۔۔ بھائی بلبیر سنگھ سے کہنا کہ فضل دین راضی خوشی ہے۔۔۔۔۔وہ بھوری بھینس جو وہ چھوڑ گئے تھے۔ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے۔۔۔۔۔دوسری کے کٹّی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مرگئی۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔اور میرے لائق جو خدمت ہو کہنا، میں ہر وقت تیار ہوں۔۔۔۔۔اور یہ تمہارے لئے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں۔

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا۔

''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟''

فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا۔''کہاں ہے؟۔۔۔۔وہیں ہے جہاں تھا۔''

بشن سنگھ نے پوچھا۔''پاکستان میں یا ہندوستان میں؟''

''ہندوستان میں۔۔۔۔نہیں نہیں پاکستان میں۔''فضل دین بوکھلا سا گیا۔بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی دھیانا وی منگ دی دال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی در فٹے منہ۔'' تبادلے کی تیاری مکمل ہو چکی تھیں۔اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو گیا۔سخت سردیاں تھیں۔جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔واہگہ کے بورڈ پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کاروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔جو نکلنے پر رضامند ہوتے تھے ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔کیونکہ اِدھر اُدھر بھاگ اُٹھتے تھے، جو ننگے تھے،ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے۔۔۔۔۔کوئی گالیاں بک رہا ہے،کوئی گا رہا ہے۔آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔رو رہے ہیں۔بک رہے ہیں۔کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔۔۔۔پاگل عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا۔اور سردی اتنی کڑا کے کی تھی کہ دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی۔اس لئے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے، چند جو کچھ سوچ رہے تھے۔''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگا رہے تھے۔دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا، کیونکہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کے نعرے سن کر طیش آ گیا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا۔''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟''،''پاکستان میں یا ہندوستان میں؟''

4.6 ۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ کا خلاصہ'':

بشن سنگھ ایک خوش حال زمیندار تھا۔ دماغی توازن کھو بیٹھنے کی وجہ سے اس کے عزیز و اقارب نے اسے پاگل خانے میں شریک کر دیا تھا۔ اس کے رشتے دار ہر ماہ اس سے ملنے کے لئے آیا کرتے تھے اور وہ ان کی آمد کا منتظر رہتا تھا۔ پاگل پن کی وجہ سے وہ اپنی چہیتی بیٹی ''روپا'' کو بھی بھول گیا تھا۔ اسے اپنے گاؤں ٹوبہ ٹیک سنگھ سے بے حد محبت تھی۔ یہ فکر لاحق تھی کہ تقسیم ہند کے بعد اس کا گاؤں کس ملک میں جائے گا ؟ ہندوستان یا پھر پاکستان۔

منٹو نے اس افسنے میں پاگلوں کے جذبات کے ذریعے ہندو پاک میں بسنے والے تمام ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے جذبات کی بہت عمدہ عکاسی کی ہے۔ افسانہ نگار کے نزدیک پاکستان کی اصلیت بس اتنی تھی کہ ''ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بستے ہیں۔'' پاگل کی پریشانی، بے چینی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔ ''ایک پاگل تو ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ اب گرفتار رہا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ اور ایک درخت پر چڑھ کر اعلان کرنے لگا کہ 'میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں، نہ پاکستان میں، میں اسی درخت پر رہوں گا۔'' اینگلو انڈین پاگل کو یہ پریشانی لاحق ہے کہ ''ہندوستان میں بریڈ یا بریک فاسٹ ملے گا یا نہیں۔''

بشن سنگھ کا ایک مسلمان دوست مفصل دین اس سے ملنے کے لئے آتا ہے تب وہ اس سے یہی سوال پوچھا ہے کہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟ پاگلوں کے تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو جاتی ہیں۔ جب بشن سنگھ کی باری آتی ہے تب وہ سوال پوچھتا ہے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟'' جب وہ افسر جواب دیتا ہے کہ پاکستان میں، تب وہ چلنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اسے بہت سمجھایا جاتا ہے لیکن وہ نہیں مانتا اور ایک جگہ جا کر متورم پیروں پر ساکت کھڑا ہو جاتا ہے کیونکہ وہ بے زار تھا۔ دوسرے دن سورج نکلنے سے پہلے ایک زوردار چیخ مار کر وہ زمین کے اس خطہ پر اپنی جان دے دیتا ہے جو ہندوستان کا حصہ تھا نہ پاکستان کا اور نہ اس کا کوئی نام تھا۔

4.9 فرہنگ

الفاظ	معنی
معقول	مناسب
لواحقین	متعلقین، رشتے دار، بھائی بند
مخمصے	جھمیلا
اینگلوانیڈین	ہندوستان میں رہنے والے انگریز۔
زہر مار کرنا	مجبوراً کوئی چیز کھانا
لحظے	لمحہ
کیس	بال
بے ضرر	جس سے کوئی نقصان نہ ہو

4.8 مشقی سوالات

☆ افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا موضوع کیا ہے۔

☆ بشن سنگھ کو کس سے بے حد محبت تھی۔

☆ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا اصلی نام کیا ہے۔

4.9 مزید مطالعہ کے لیے کتب

(۱) تاریخ ادب اردو (جلد چہارم) : سیدہ جعفر

(۲) ادب کا تنقیدی مطالعہ : سلام سندیلوی

(۳) تاریخ ادب اردو (جلد چہارم) : وہاب اشرفی

(۴) انتخاب افسانہ : مرتبہ اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ

اکائی 5۔ افسانہ ''نظارہ درمیاں ہے''

قرۃ العین حیدر

اکائی کے اجزاء:

5.1 مقاصد

5.2 تمہید

5.3 مصنف کا تعارف

5.4 **قرۃ العین حیدر** کی افسانہ نگاری

5.5 **افسانہ ''نظارہ درمیاں ہے''**

5.6 خلاصہ

5.7 فرہنگ

5.8 مشقی سوالات

5.9 مزید مطالعہ کے لئے کتب

5.1 مقصد

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ:

☆ قرۃ العین حیدر کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیں۔

☆ قرۃ العین حیدر کی ادبی خدمات کا مختصر جائزہ لیں۔

☆ افسانہ ''نظارہ درمیاں ہے'' کا خاکہ پیش کریں۔

☆ مجموعی طور پر اس افسانے کا عمومی جائزہ لیں۔

5.2 تمہید

اس اکائی میں نئی نسل کی نمائندہ افسانہ نگار خاتون قرۃ العین حیدر کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ ان کا ایک افسانہ ''نظارہ درمیاں ہے'' پیش کیا جائے گا اور طلبہ کی سہولت کی خاطر افسانے کا خاکہ بھی دیا جائے گا اور ساتھ ہی عمومی جائزہ بھی لیا جائیگا تا کہ طلبہ اس سے مزید استفادہ کر سکیں۔

5.3 مصنف کا تعارف: (قرۃ العین حیدر)

قرۃ العین حیدر ۱۹۲۸ء میں علی گڑھ میں پیدا ہوئی۔ ان کے والد سجاد یلدرم اردو کے مشہور انشائیہ نگار اور افسانہ نویس تھے۔ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے انگریزی میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۵ء تک انہوں نے ہفتہ وار ''السٹرڈیڈ ویکلی'' کی مدیر ومعاون کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۴ء تک وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ اردو کی وزیٹنگ پروفیسر رہیں۔ ۱۹۸۹ء میں ان کے ادبی خدمات پر انہیں گیان پیٹھ ایوارڈ عطا کیا گیا۔ ۲۱ اگست ۲۰۰۷ء کو دلی میں ان کا انتقال ہوا۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے متعدد مجموعہ شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ستاروں سے آگے، شیشے کا گھر، پت جھڑ کی آواز۔ ۱۹۶۷ء جس پر انہیں ساہتیہ اکیڈمی کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ''روشنی کی رفتار'' ۱۹۸۲ء اور جگنوؤں کی دنیا ۱۹۹۰ء وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے موضوعات کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں۔ ان کی تخلیقات کا غالب رجحان وقت کی اور گریزاں نوعیت اور اس کی مراجعت، نا آشنا کردار کا احساس ہے۔ ان کے اسلوب کو علامتی طرز سے خاص نسبت ہے۔ چنانچہ ان کی تخلیقات کے نام بھی علامتی ہیں۔ جیسے ''سفینۂ غم دل''، شیشے کا گھر، پت جھڑ کی آواز'' وغیرہ۔ ان کے افسانوں میں ''جلاوطن'' اور ''ہاؤزنگ سوسائٹی'' کو ان کے بہترین فن پاروں کی فہرست میں رکھا جا سکتا ہے۔ ''ڈالن والا قلندر''، ''فوٹو گرافر''، ''حسب نسب''، ملفوظات حاجی گل بابا''، روشنی کی رفتار وغیرہ۔ افسانے کا رانہ تکمیل اور تجربے کو افسانے میں منتقل کرنے میں منتقل کرنے میں جدت و تازگی کے آئینہ دار ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے اسلوب کا ایک وصف وہ منظر کشی ہے جو واقعات و تجربات کے پس منظر میں کام دیتی ہے اور اس میں کا عنصر اپنی جھلک دکھا تا رہتا ہے۔ منظر کشی عقبی زمین کا کام کرتی ہے اور بیانیہ کا لطف دو بالا کر دیتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کی تحریروں رمزیت اور علامتی طرز نے تہہ دار پر مغز اور فکر انگیز بنا دیا ہے۔ مصوری سے مصنفہ کی عملی دلچسپی نے بھی فکشن میں ان کی تحریروں کو خوبصورت رنگ آمیزی اور تبلیغ اشاروں کا ترجمان بنا دیا۔ ان کے افسانوی ادب میں اپنے تجربات کی ندرت، اپنی تخلیق اور تازہ خیالی کے

وسیلے سے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ وہ اردو کی منفرد اور صف اول کی افسانہ نگاری ہیں۔

5.5 متن ''نظارہ درمیاں ہے''

تارابائی کی آنکھیں تاروں ایسی روشن ہیں اور وہ گرد وپیش کی ہر چیز کو حیرت سے تکتی ہے۔ دراصل تارابائی کے چہرے پر آنکھیں ہی آنکھیں ہیں۔ وہ قحط کی سوکھی ماری لڑکی ہے جیسے بیگم الماس خورشید عالم کے ہاں کام کرتے ہوئے صرف چند ماہ ہوئے ہیں اور وہ اپنی مالکن کے شان دار فلیٹ کے ساز وسامان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہتی ہے کہ ایسا عیش وعشرت اس سے پہلے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ وہ گورکھپور کے ایک گاؤں کی بال ودھوا ہے جس کے سسُر اور ماں باپ کے مرنے کے بعد اس کے ماما نے جو بمبئی میں دودھ والا بھیا ہے۔ اسے یہاں بلا بھیجا تھا۔

الماس بیگم کے بیاہ کو بھی ابھی تین چار مہینے ہی گذرے ہیں۔ ان کی منگلورین آیا جو ان کے ساتھ آئی تھی ''ملک'' چلی گئی تو ان کی بے حد منتظم خالہ بیگم عثمانی نے جو ایک نامور سوشل ورکر ہیں۔ ایمپلائمینٹ ایکس چینج فون کیا اور تارابائی پٹ بجنے کی طرح آنکھیں جھپکاتی کمبلا ہل کے ''اسکائی اسکریپر'' گلِ نسترن کی دسویں منزل پر آن پہنچیں۔ الماس بیگم نے ان کو ہر طرح قابل اطمینان پایا۔ مگر دوسرے ملازموں نے ان کو تارابائی کہہ کر پکارا تو وہ بہت بگڑیں۔ ''ہم کوئی پتُریا ہیں۔؟'' انہوں نے احتجاج کیا۔ مگر اب ان کو تارابائی کے بجائے تارادائی کہلانے کے عادت ہوگئی ہے۔ اور وہ چپ چاپ کام میں مصروف رہتی ہیں اور بیگم صاحب اور ان کے صاحب کو آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھا کرتی ہیں۔

الماس بیگم کا اگر بس چلے تو وہ اپنے طرح دار شوہر کو ایک لمحے کے لئے اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں اور وہ جوان جہاں آیا کو ملازم رکھنے کی ہرگز قائل نہیں۔ مگر تارابائی جیسی بے جان اور سگھڑ خادمہ کو دیکھ کر انہوں نے اپنی تجربہ کار خالہ کے انتخاب پر اعتراض نہیں کیا۔

تارابائی صبح کو بیڈ روم میں چائے لاتی ہے۔ بڑی عقیدت سے صاحب کے جوتوں پر پالش اور کپڑوں پر استری کرتی ہے۔ ان کے شیو کا پانی لگاتی ہے۔ جھاڑ پوچھ کرتے وقت وہ بڑی حیرت سے ان خوبصورت چیزوں پر ہاتھ پھیرتی ہے جو صاحب اپنے ساتھ پیرس سے لائے ہیں۔ ان کا وکلن وارڈ رروب

کے اوپر رکھا ہے۔ جب پہلی بار تارا بائی نے بیڈروم کی صفائی کی تو دئکن پر بڑی دیر تک ہاتھ پھیرا کی۔ مگر پر سوں صبح حسب معمول جب وہ بڑی نفاست سے وئکن صاف کر رہی تھی تو نرم مزاج اور شریف صاحب (بیگم صاحب متیّا مرچ ہیں) اسی وقت کمرے میں آ گئے اور اس پر برس پڑے کہ وائکن کو ہاتھ کیوں لگایا اور تارا بائی کے ہاتھ سے چھین کر اسے الماری کے اوپر پٹخ دیا۔ تارا بائی سہم گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور صاحب ذرا شرمندہ سے ہو کر باہر برآمدے میں چلے گئے، جہاں بیگم صاحب بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ ویسے بیگم صاحب کی صُبحیں ہیئر ڈریسر اور بیو ٹی سیلون میں گزر تی ہیں ۔ مینی کیور ، پیڈی کیور ، تاج نیشل ۔۔۔۔۔ ایک سے ایک بڑھیا ساڑیاں ، درجنوں رنگ بر نگے ، سٹکیس اور عطر کے ڈوبے اور گہنے ان کی الماریوں میں پٹے پڑے ہیں ۔ مگر تارا بائی سوچتی ہے۔ ''بھگوان نے میم صاحب کو دولت بھی ، اِبّت بھی اور ایسا سندر پتی بھی۔ بس شکل دینے میں کنجوس سی کر گئے۔''

صاحب سُنا ہے میم صاحب مس صاحب لوگ سوسائٹی میں بے حد مقبول تھے۔ مگر بیاہ کے بعد سے بیگم صاحب نے ان پر بہت سی پابندیاں لگا دی ہیں۔ دفتر جاتے ہیں تو دن میں کئی بار فون کرتی ہیں۔ شام کو کسی کام سے باہر جائیں تو بیگم صاحب کو پتہ رہتا ہے کہ کہاں کہاں گئے ہیں اور ان جگہوں پر فون کرتی رہتی ہیں شام کو سیر و تفریح یا ملنے ملانے کے لئے دونوں میاں بیوی باہر جاتے ہیں تب بھی بیگم صاحب بڑی کڑی نگرانی رکھتی ہیں۔ مجال ہے جو وہ کسی دوسری لڑکی پر نظر بھی ڈال لیں۔

صاحب نے یہ سارے قاعدے قانون ہنسی خوشی قبول کر لئے ہیں، کیونکہ بیگم صاحب بہت امیر ہیں اور صاحب کی نوکری بھی ان کے دولت مند سسر ہی نے دلوائی ہے ورنہ بیاہ سے پہلے صاحب بہت غریب آدمی تھے۔ اسکالرشپ پر انجنیئر نگ پڑھنے فرانس گئے تھے۔ واپس آئے تو روزگار نہیں ملا۔ پریشان حال گھوم رہے تھے جب ہی بیگم صاحب کے گھر والوں نے اُنہیں پھانس لیا۔

بڑے لوگوں کی دنیا کے یہ عجیب و غریب قصے تارا بائی فلیٹ کے مستری (باورچی) حمّال اور دوسرے نوکروں سے سنتی اور اس کی آنکھیں اچنبھے سے جھلملاتی رہتی ہیں۔

خورشید عالم بڑے اچھے وائکن نواز بھی تھے، مگر جب سے بیاہ ہوا ہے، بیوی کی محبت میں ایسے کھوئے

کہ وائلن کو ہاتھ نہیں لگایا کیوں الماس بیگم کو ساز سے دلی نفرت ہے۔ خورشید عالم بیوی کے بے حد احسان مند ہیں کیونکہ اس شادی سے ان کی زندگی بدل گئی اور احسان مندی ایسی شے ہے کہ ایک سنگیت کی قربانی بھی دے سکتا ہے۔ خورشید عالم شہر کی ایک خستہ عمارت میں پڑے تھے اور بسوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اب لکھ پتی کی حیثیت سے کمبالا ہل میں فروکش ہیں۔ مرد کے لئے اس کا اقتصادی تحفظ غالباً سب سے بڑی چیز ہے۔

خورشید عالم اب وائلن کبھی نہیں بجائیں گے۔

یہ صرف ڈیڑھ سال پہلے کا ذکر ہے۔ الماس اپنے ملک التجار باپ کی عالی شان کوٹھی میں مالا بار ہل پر رہتی تھیں۔ وہ سوشل ورک کر رہی تھیں اور عمر زیادہ ہو جانے کے کارن شادی کی امید سے دست بردار ہو چکی تھیں۔ جب ایک عورت میں ان کی ملاقات خورشید عالم سے ہوئی اور ان کی جہاں دیدہ خالہ بیگم عثمانی نے ممکنات بھانپ کر اپنے ''جاسوسوں'' کے ذریعہ معلومات فراہم کیں۔۔۔۔۔۔ لڑکا یو۔ پی کا ہے۔ یورپ سے لوٹ کر تلاشِ معاش میں سرگرداں ہے، مگر شادی پر تیار نہیں کیونکہ فرانس میں ایک لڑکی چھوڑ آیا ہے اور اس کی آمد کا منتظر ہے۔ بیگم عثمانی فوراً اپنی مہم پر جُٹ گئیں۔ الماس کے والد نے اپنی اک فرم میں خورشید عالم کو پندرہ سو روپے ماہوار رکھ لیا۔ الماس کی والدہ نے انہیں اپنے ہاں مدعو کیا اور الماس سے ملاقاتیں خود بخود شروع ہو گئیں۔ مگر پھر بھی ''لڑکے'' نے ''لڑکی'' کے سلسلے میں کسی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔ دفتر سے لوٹ کر بیشتر وقت انہیں الماس کے ہاں گزارنا پڑتا اور اس لڑکی کی سطحی گفتگو سے اکتا کر اس پُر فضا بالکنی میں جا کھڑے ہو تے جس کا رُخ سمندر کی طرف تھا۔ پھر وہ سوچتے ایک دن ''اُس'' کا جہاز آ کر اس ساحل سے لگے گا اور ''وہ ''اس میں سے اُترے گی۔ اسے ہمرہ ہی آ جانا چاہئے تھا مگر پیرس میں کالج میں اس کا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ ''اس'' کا جہاز اس ساحل سے آ لگے گا۔۔۔۔۔۔ وہ بالکنی کے جنگلے پر جھُکے اُفق کو تکتے رہتے۔ الماس اندر سے نکل کر شگفتگی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھتی۔ ''کیا سوچ رہے ہیں؟'' وہ ذرا جھینپ کر مسکرا دیتے۔

رات کے کھانے پر الماس کے والد کے ساتھ ملکی سیاست سے وابستہ ہائی فنانس پر تبادلہ خیالات

کرنے کے بعد وہ تھکے ہارے اپنی جائے قیام پر پہنچتے اور وائلن نکال کر دھنیں بجانے لگتے جو ''اس'' کی سنگت میں پیرس میں بجایا کرتے تھے۔ وہ دونوں ہر تیسرے دن ایک دوسرے کو خط لکھتے تھے اور پچھلے خط میں انہوں نے ''اسے'' اطلاع دی تھی کہ انہیں بمبئی ہی میں بڑی عمدہ ملازمت مل گئی ہے۔ اس ملازمت کے ساتھ جو فنا ک شاخسانے بھی تھے اس کا ذکر انہوں نے خط میں نہیں کیا تھا۔

ایک برس گزر گیا مگر انہوں نے الماس سے شادی کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ آخر عثمانی بیگم نے طے کیا کہ خود ہی ان سے صاف صاف بات کر لینا اب عین مناسب ہے۔ مگر تب ہی پرتاپ گڈھ سے تار آیا کہ خورشید عالم کے والد سخت بیمار ہیں اور وہ چھٹی لے کر وطن روانہ ہو گئے۔

ان کو پرتاپ گڈھ گئے چند روز ہی گزرے تھے کہ الماس جواب ان کی طرف سے نا اُمید ہو چکی تھی اک شام اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک جرمن پیانسٹ کا نسرٹ سننے تاج محل گئی۔ کرسٹل روم میں حسب معمول بوڑھے پارسنوں کا مجمع تھا اور ایک حسین آنکھوں والی پارسی لڑکی کونسرٹ پروگرام بانٹتی پھر رہی تھی۔ ایک شناسا خاتون نے الماس کا تعارف اس لڑکی سے کرایا۔

الماس نے حسب عادت بڑی ناقدانہ اور تیکھی نظروں سے اس اجنبی لڑکی کا جائزہ لیا۔ لڑکی بے حد حسین تھی۔

''آپ کا نام کیا۔ بتلایا مسز رستم جی نے؟'' الماس نے ذرا مشفقانہ انداز میں سوال کیا۔

''پیروجا دستور'' لڑکی نے سادگی سے جواب دیا۔

''میں نے آپ کو پہلے کسی کونسرٹ وغیرہ میں نہیں دیکھا۔''

''میں سات برس بعد پچھلے ہفتے ہی پیرس سے واپس آئی ہوں۔''

''سات برس پیرس میں!'' ''تب تو اب فرنچ خوب فرفر بول لیتی ہوں گی؟'' الماس نے ذرا ناگواری سے کہا۔

''جی ہاں'' ۔۔۔۔۔۔۔ پیروجا ہنسنے لگی۔

اب خاص مہمان جرمن پیانسٹ کے ہمراہ لاؤنج کی سمت بڑھ رہے تھے۔ پروجا الماس سے معذرت

چاہ کر ایک انگریز خاتون سے اس پیانسٹ کی موسیقی پر بے حد ٹکنیکل قسم کا تبصرہ کرنے میں منہمک ہوگئی۔لیکن اسی لاؤنج میں پہنچ کر الماس پھر اس لڑکی سے ٹکرا گئی۔مرے میں چائے کی گہما گہمی شروع ہو چکی تھی۔

''آیئے یہاں بیٹھ جائیں؟'' پیروجا نے مسکرا کر الماس سے کہا۔وہ دونوں دریچے سے لگی ہوئی ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔

''آپ تو ویسٹرن میوزک کی ایکسپرٹ معلوم ہوتی ہیں۔الماس نے ذرا اکھائی سے بات شروع کی کیوں کہ وہ خوب صورت اور کم عمر لڑکیوں کو ہرگز برداشت نہ کر سکتی تھی۔

''جی ہاں، میں پیرس میں پیانو کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ہی گئی تھی۔''

الماس کے ذہن میں کہیں دور خطرے کی گھنٹی بجی۔اس نے باہر سمندر کی شفاف اور بے حد نیلی سطح پر نظر ڈال کر دفعتاً بڑے اخلاق اور بے تکلفی سے کہا۔''ہائی نٹرسٹنگ۔۔۔۔۔۔۔پیانو تو ہمارے یہاں بھی موجود ہے۔کسی روز آ کر کچھ سناؤ۔''

''ضرور۔'' پیروجا نے مسرت سے جواب دیا۔

''سنیچر کے روز کیا پروگرام ہے تمہارا۔میں اپنے ہاں ایک ہین پارٹی کر رہی ہوں، میری سہیلیاں تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔''

''آئی وڈ لوٹو کم۔۔۔۔۔۔تھینک یو؟''

''تم رہتی کہاں ہو پیروجا؟''

پیروجا نے تاردیو کی ایک گلی کا پتہ بتایا۔الماس نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔تاردیو مفلوک الحال پارسیوں کا محلّہ ہے۔

''میں اپنے چچا کے ساتھ رہتی ہوں۔میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔میرے کوئی بھائی بہن بھی نہیں۔مجھے چچا نے پالا ہے۔وہ لا ولد ہیں۔چچا ایک بینک میں کلرک ہیں۔پیروجا سادگی سے کہتی رہی۔پھر ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد سمندر کی پُرسکون سطح کو دیکھتے ہوئے اس نے اچانک کہا۔''کیسی عجیب بات ہے

۔پچھلے ہفتے جب میرا جہاز اس ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا تو میں سوچ رہی تھی کہ اتنے عرصے کے بعد اجنبیوں کی طرح بمبئی واپس پہنچ رہی ہوں ۔ یہ بڑا کٹھور شہر ہے۔تم کو معلوم ہی ہوگا الماس !مخلص دوست یہاں بہت مشکل سے ملتے ہیں مگر میری خوش قسمتی دیکھو کہ آج ہی تم سے ملاقات ہوگئی۔الماس نے دردمندی کے ساتھ سر ہلایا۔سی لاؤنج میں باتوں کی دھیمی دھیمی بھنبھناہٹ جاری تھی ۔ چند لمحوں کو بعد اس نے پوچھا۔''تم پیرس کیسے گئیں؟''

''مجھے اسکالرشپ مل گیا تھا ۔ وہاں پیانو کی ڈگری لینے کے بعد چند سال تک میوزک کالج میں ریسرچ کرتی رہی ۔ میں وہاں بہت خوش تھی ۔مگر میری چچا چچی یہاں بالکل اکیلے تھے ۔ دونوں بہت بوڑھے ہو چکے ہیں ۔ چچی بیچاری تو ضعیف العمری کی وجہ بالکل بہری بھی ہوگئی ہیں ۔ میں ان کی خاطر واپس آ گئی اور اس کے علاوہ۔۔۔۔۔۔۔''

سنیچر کے روز پیروجا الماس کے گھر پہنچی جہاں مرغیوں کی پارٹی اپنے عروج پر تھی ۔بٹیلز کے ریکارڈ بج رہے تھے ۔ چند لڑکیاں جنہوں نے چند روز پہلے ایک فیشن شو میں حصہ لیا تھا ۔ روز شور سے اس کے واقعات پر تبصرہ کر رہی تھیں ۔ یہ سب لڑکیاں جن کر ماتر بھا شائیں اُردو، ہندی، گجراتی اور مراٹھی، انگریزی اور صرف انگر یزی بول رہی تھیں اور انہوں نے بے حد چُست پتلونیں یعنی ''اسٹریچ پینٹس'' پہن رکھی تھی ۔۔۔۔۔۔۔پیرو جا کو ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا کہ وہ ابھی ہندوستان واپس نہیں آئی ہے ۔اس کا اپنا فرقہ بے حد مغرب پسند تھا مگر برسوں یورپ میں رہ کر اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اجنتا کی زندہ تصویروں کی بجائے ان مغربیت زدہ ہندوستان خواتین کو دیکھ کر اہل یورپ کو سخت افسوس اور مایوسی ہوتی ہے ۔ چنا چہ پیروجا جہانگیز دستور پیرس اور روم میں اپنی ٹھیٹھ ہندوستانی وضع قطع پر بڑی نازاں رہتی تھی ۔بمبئی کی ان نقلی امریکن لڑکیوں سے اکتا کر وہ بالکنی میں جا کھڑی ہوئی جس کے سامنے سمندر تھا اور پہلو من برج خموشاں کا جنگل نظر آ رہا تھا ۔ وہ چونک اٹھی گھنے جنگل کے اوپر کھُلی فضاؤں میں چند گدھ اور کوّے منڈلا رہے تھے اور چاروں طرف بڑا ڈراؤنا سنّاٹا طاری تھا ۔وہ گھبرا کر واپس پہنچی اور زندگی سے گونجتے ہوئے کمرے میں آ کر ایک صوفے پر ٹک گئی۔

کمرے کے ایک کونے میں غالباً بطور آرائش اسٹین دے کا گرینڈ پیانو رکھا ہوا تھا ۔لڑکیاں اب ریڈیو

گرام پر ہیلی بیلا فونٹے کا پرانا کلپسو ''جمیکا فرویئل'' بجارہی تھیں۔مغنی کی دل کش آواز گٹار کی جان لیوا گونج کمرے میں پھیلنے لگی:

DOWN THE WAY WHERE THE NIGHTS ARE GAY AND THE SUN SHINES DAILY ON THE MOUNTAIN TOP I TOOK A TRIP ON A SAILING SHIP.
AND WHEN I REACHED JAMAICA I MADE A STOP BUT I AM SAD TODAY I AM ON MY WAY AND WON'T BE BACK FOR MANY A DAYS;
I HAD TO LEANE A LATTLE GIRL IN KINGSTON TOWN.

الماس چپ چاپ جا کر بالکنی میں کھڑا ہوگئی۔ریکارڈ ختم ہوا تو اس نے اندر آ کر پیرو جا سے کہا۔''ہم لوگ سخت بد مذاق ہیں۔ایک ماہر پیانسٹ یہاں بیٹھی ہے اور ہم ریکا رڈ بجا رہے ہیں۔چلو بھائی اٹھو۔۔۔''

پیرو جا مسکراتی ہوئی پیانو کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

''کیا سناؤں؟ میں تو صرف کلاسیکی میوزک ہی بجاتی ہوں۔''

''ہائے ۔۔۔۔۔ پوپ (Pop) نہیں؟ لڑکیوں نے غل مچایا۔۔۔۔۔۔''اچھا کوئی انڈین فلم سانگ ہی بجاؤ۔''

''فلم سانگ بھی مجھے نہیں آتے ۔۔۔۔۔۔مگر ۔۔۔۔۔۔مگر ایک غزل یاد ہے ۔۔۔۔۔ جو مجھے ۔۔۔۔۔ جو مجھے ۔۔۔۔۔۔ وہ جھینپ کر ٹھٹک گئی۔

غزل۔۔۔۔۔؟ اوہ! آئی لو اُردو پوئٹری۔۔۔۔۔''ایک مسلمان لڑکی نے کس کے والدین اہلِ زبان تھے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا۔

پیرو جا نے پردوں پر انگلیاں پھیریں اور ایک انجانی، مسرور پھریری سی آئی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ ایک دل کش دھُن بجانا شروع کی۔

''گاؤ بھی ساتھ ساتھ۔''لڑکیاں چلائیں۔

''بھئی میں گا نہیں سکتی۔میرا اُردو تلفظ بہت خطرناک ہے۔''

''اچھا اس کے الفاظ بتا دو۔۔۔۔۔'' ہم لوگ گے۔''

''وہ کچھ اس طرح ہے۔۔۔۔۔'' پیروجا نے کہا۔

''تو سامنے ہے اپنے بتلا کہ تو کہاں ہے

کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے''

چند لڑکیوں نے ساتھ ساتھ گانا شروع کر دیا۔نظارہ درمیاں ہے۔۔۔۔۔نظارہ درمیاں ہے۔

غزل ختم ہوئی تالیاں بجیں۔

''اب کوئی ویسٹرن چیز بجاؤ۔۔۔۔۔۔'' ایک لڑکی نے فرمائش کی۔

''شوپاں کی مڈنز فینسی(MAIDEN'S FANCY) بجاؤں؟ یہ نغمہ میں اور میرا منگیتر ہمیشہ اکٹھے بجاتے تھے پیرس میں۔وہ وئلن پر میری سنگت کرتے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔''

''تمہارے منگیتر بھی میوزیشین ہیں؟'' ایک لڑکی نے پوچھا۔

''پروفیشنل نہیں۔شوقیہ''۔پیروجا نے جواب دیا اور نغمہ بجانے میں محو ہوگئی۔

اگلے دو ہفتوں میں الماس نے پیروجا سے بڑی گہری دوستی گانٹھ لی۔اس دوران میں پیروجا کو ایک کانونٹ کالج میں پیانو سکھانے کی نوکری مل چکی تھی جو تعطیلات کے بعد ملنے والا تھا۔ہفتے میں تین بار ایک امریکن کی دس سالہ لڑکی کو پیانو سکھانے کا ٹیوشن بھی اسے مل گیا تھا۔امریکن کی بیوی کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا اور وہ اپنا غم بھلانے کے لئے اپنے بچوں کے ہمراہ بغرض سیاحت ہندوستان آیا تھا اور جو ہو میں سن اور سینڈ میں مقیم تھا۔تاردیو سے جو ہو کا سفر خاصا طویل تھا مگر امریکن پیروجا کو اچھی تنخواہ دینے والا تھا اور بڑی شفقت سے پیش آتا تھا۔پیروجا اپنی زندگی سے فی الحال بہت خوش تھی۔چند روز بعد ''وہ'' اپنے وطن سے واپس آنے والا تھا۔پیروجا نے اسے بمبئی آتے ہی ملازمت اور ٹیوشن ملنے کی اطلاع نہیں دی تھی کہ وہ ''اسے ''ایک ''اچانک'' سرپرائز دینا چاہتی تھی۔

ایک روز الماس کے ساتھ اس کی کوٹھی کے باغ میں ٹہل رہی تھی کہ فوارے پر پہنچ کر الماس نے اس سے دفعتاً سوال کیا۔''تم نے وہ غزل کہاں سے سیکھی تھی۔۔۔۔۔

''اوہ۔۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔۔؟ پیرس میں!''

''پیرس! ہاؤ انٹرسٹنگ! کس نے سکھائی؟''

''میرے منگیتر نے۔۔۔۔۔۔''

''اوہ پیروجا۔۔۔۔۔یورڈارک ہورس۔۔۔۔۔! چار سو بیس! مجھ کو بتایا بھی نہیں اب تک!''

''تمہاری ہی کمیونٹی کے ہیں وہ۔۔۔۔۔۔''

''اوہ۔۔۔۔۔۔واقعی۔۔۔۔۔۔؟'' الماس فوارے کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔

''میرے باپ دادا دستور تھے مگر میری چچا بہت روشن خیال ہیں۔انہوں نے اجازت دے دی ہے!''

''کیا نام ہے صاحب زادے کا؟''

''یہ ناموں کا بھی عجیب قصہ تھا۔خورشید عالم اس کی نرگسی آنکھوں پر عاشق ہوئے تھے۔جب پیرس کے ہندوستانی سفارت خانے کی ایک تقریب میں پہلی ملاقات ہوئی اور کسی نے اس کا تعارف ''پیروجا'' کہہ کر ان سے کرایا تو انہوں نے شرارت سے کہا تھا لیکن آپ کا نام نرگس ہونا چاہئے تھا۔!''۔''او ہنرگیش تو میری آنٹی کا نام ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ۔۔۔۔۔۔''خورشید عالم نے ایسی بے تکلفی سے کہا تھا جیسے اسے ہمیشہ سے جانتے ہوں۔۔۔۔۔''نرگیش، کھورشیٹ، پیروجا۔آپ لوگوں نے حسین ایرانی ناموں کی ریڑھ ماری ہے۔میں آپ کو فیروز پکاروں تو کوئی اعتراض ہے؟''۔۔۔۔۔۔ہرگز نہیں۔۔۔۔۔۔'' پیروجا نے ہنس کر جواب دیا تھا ۔۔۔۔۔اور پھر ایک بار خورشید عالم نے دریا کے کنارے ٹہلتے ہوئے اس سے کہا تھا ''یہ تمہاری بہادر آنکھیں ۔۔۔۔۔۔ہفت زبان آنکھیں، جگنو

ایسی شہاب ثاقب ایسی، ہیرے جواہرات ایسی، روشن دھوپ اور جھلملاتی بارش ایسی آنکھیں۔۔۔۔۔۔نرگس کے پھول جو تمہاری آنکھوں میں تبدیل ہو گئے۔''

''میں نے پوچھا۔''کیا نام ہے ان صاحب کا؟''الماس کی تیکھی آواز پر وہ چونکی۔

''کھورشیٹ عالم ۔''اس نے جواب دیا۔ چند لحظوں کے سکوت کے بعد اس گھبرا کر نظریں اُٹھائیں۔ سیاہ ساری میں ملبوس، کمر پر ہاتھ رکھے، سیاہ اونٹ کی طرح اس کے سامنے کھڑی الماس اس سے کہہ رہی تھی۔'' کیسا عجیب اتفاق ہے پیروجا ڈیر! میری منگیز کا نام بھی خورشید عالم ہے وہ بھی وائلن بجاتے ہیں، وہ بھی پیرس سے آئے ہیں اوران دنوں اپنے والد سے ملنے وطن گئے ہوئے ہیں۔

اگست کے آسمان پر روز سے بجلی چمکی مگر کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ لکتی ہوئی بجلی آن کر پیروجا دستور پر گر گئی۔ وہ کچھ دیر تک ساکت سا کت بیٹھی رہی پھراس نے اس عالی شان عمارت پر نظر ڈالی اوراپنے تاردیو کے فلیٹ کا تصور کیا، بجلی پھر چمکی اور مالا بار ہل کے اس منظر کو روشن کر گئی۔ چشم زدن میں ساری بات پیروجا کی سمجھ میں آ گئی۔ اور یہ بھی کہ اپنے خطوں میں خورشید عالم نے الماس کا ذکر کیوں نہیں کیا تھا اور کچھ عرصے سے شادی کی تذکرہ کو وہ اپنے خطوط میں کس وجہ سے ٹال رہے تھے۔ وہ آہستہ سے اٹھی اوراس نے آہستہ سے کہا۔'' اچھا بھئی مبارک ہو۔ خدا حافظ۔''

''جارہی ہو پروجا؟ ٹھہرو، میری کار تم کو پہنچا آئے گی ۔۔۔۔۔ڈرائیور۔۔۔۔۔۔''الماس نے سکون کے ساتھ آواز دی۔

''نہیں الماس۔ شکریہ''۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی پھاٹک کی طرف دیکھتی رہی۔ بارش کی زبردست بوچھار نے پام کے درختوں کی جھکا جھکا دیا۔ وہ جلدی سے قدم اٹھاتی، کیچڑ سے بچتی برساتی کے اندر چلی گئی۔

اس واقعہ کے تیسرے روز خورشید عالم کا خط الماس کے والد کے نام آیا جس میں انہوں نے اپنے ابا میاں کی شدید علالت کی وجہ سے رخصت کی معیاد بڑھانے کے درخواست کی تھی۔ انہوں نے الماس کے والد کو یہ نہیں لکھا کہ اس خبر سے کہ ان کا اکلوتا لڑکا کسی مسلمان رئیس زادی کے بجائے کسی پارسن سے شادی کر رہا ہے۔۔۔۔۔ان کے کٹّر مذہبی ابا جان صدمے سے جاں بلب ہو چکے ہیں۔ خورشید عالم کے خط سے ظاہر تھا کہ وہ بیحد پریشان ہیں۔ جواب میں الماس نے خود انہیں لکھا۔

'' آپ جتنے دن چاہیں وہاں رہئے ڈیڈی آپ کو غیر تو نہیں سمجھتے۔ ہم سب آپ کی پریشانی میں شریک ہیں۔ آپ ابا میاں کو علاج کے لئے یہاں کیوں نہیں لے آتے۔؟''

برسبیل تذکرہ کل میں سوئمنگ کے لئے سن اینڈ سینڈ گئی تھی۔ وہاں ایک بڑی دلچسپ پارسن مس پیرو جادستور سے ملاقات ہوئی جو پیانوں بجاتی ہے اور پیرس سے آئی ہے اور شاید کسی امریکن کی گرل فرینڈ ہے اور شاید اسی کے ساتھ سن اینڈ سینڈ میں ٹھہری ہوئی ہے۔ میں نے آپ کو اس لئے لکھا کہ غالباً آپ بھی کبھی اس سے ملے ہوں پیرس میں۔

اچھا۔۔۔۔اب آپ ابا میاں کو لے کر آ جایئے۔ تار دیجئے تا کہ یہاں بریچ کینڈی ہسپتال میں ان کے لئے کمرہ ریزرو کر لیا جائے۔۔۔۔

آپ کی مخلص۔۔۔۔الماس

شام پڑے تار دیو کی خستہ حال عمارت کے سامنے ٹیکسی آ کر رکی اور خورشد عالم باہر اترے۔ جیب سے نوٹ بک نکال کر انہوں نے پتے پر نظر ڈالی اور عمارت کے لب سڑک برآمدے کی دھنسی ہوئی سیڑھی پر قدم رکھا۔ سامنے ایک دروازے کی چوکھٹ پر چونے سے جو''چوک'' صبح بنایا گیا تھا، وہ اب تک موجود تھا۔ اندر نیم تاریک کمرے کے سرے پر کھڑکی مین ایک بوڑھا پارسی صدرا اور میلی سفید پتلون پہنے، سر پر گول ٹوپی اوڑھے، کمر میں بندھی ''کسٹی'' کھول کر اس میں گرہیں لگاتے ہوئے زیرِ لب دعائیں پڑھ رہا تھا۔ ایک طرف میلی سی آرام کرسی پڑی تھی۔ وسطی میز پر رنگین موم جامہ بچھا تھا۔ دیواروں پر زرتشت کی بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔ کمرے میں ناریل اور مچھلی کی تیز باس اڈ رہی تھی۔ ایک بوڑھی پارسن سرخ جارجٹ کی ساری پہنے، سر پر رومال باندھے منڈیا ہلاتی اندر سے نکلی۔

''مس دستور ہیں۔''

''پیرو جا؟ پارسن نے دھندلی آنکھوں سے خورشید عالم کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ حد ہو گئی ہے سینڈ اینڈ سینڈ۔

''کیا؟ کیا مس دستور سن اینڈ سینڈ میں منتقل ہو گئی ہیں؟''

بہری پٹ ضعیفہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

''کس کے۔۔۔۔۔کس کے ساتھ۔۔۔۔۔۔؟'' خورشید عالم نے ہکلا کر پوچھا۔

بوڑھی غراپ سے اندر گئی اور ایک وزیٹنگ کارڈ لا کر خورشید عالم کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔کارڈ پر کسی امریکن کا نام درج تھا۔

''تم مسٹرکھورشیٹ عالم ہو؟ پیروجا نے کہا تھا کہ تم آنے والے ہو۔اگراسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آؤ تو میں فوراًاس کو جوہوفون کر دوں۔اورتم کو یہ بتاؤں کہ وہ کہاں گئی ہے!''اس نے بلاؤں کی سے پچیس پیسے نکالے۔خورشید عالم نے ہکّابکّا ہوکر بوڑھی کو دیکھا۔

''آپ کواس صورت حال پر کوئی اعتراض نہیں؟''

بہری بھنڈ ضیفہ نے نفی میں سر ہلایا۔''ہم بہت غریب لوگ ہیں مگر اب پیروجا کو ایک امریکن۔'' دفعتہً سنز دستور کو دیا کہ انہوں نے مہمان کو اندر ہی نہیں بلایا ہے اورانہوں نے پیٹھ جھکا کر کہا۔''آؤں اندر آجاؤ۔۔''

خورشید عالم مبہوت کھڑے رہے۔پھر تیزی سے پلیٹ کر ٹیکسی میں جا بیٹھے۔

''بائی بائی۔''ضعیفہ نے ہاتھ ہلایا۔

بوڑھا پارسی دعا ختم کر کے باہر لپکا مگر ٹیکسی زن سے آگے جا چکی تھی۔

جس روز الماس اورخورشید عالم کی منگنی کی دعوت تھی،ایسی ٹوٹ کر بارش ہوئی کہ جل تھل ایک ہو گئے۔ڈنر سے ذر پہلے بارش تھی اورخورشید عالم اور الماس کت والد کے دوست ڈاکٹر صدیقی جو حال ہی میں تبدیل ہوکر بمبئ آئے تھے۔بالکنی میں جا کھڑے ہوئے۔جس سے کچھ فاصلے پر برج خموشاں کا اندھیرا جنگل بھیگی ہوئی ہوائیں سائیں سائیں کرر ہا تھا۔اندرڈرائنگ روم میں قہقہے گونج رہے تھےاورگرینڈ پیانو پرر کھے ہوئے نقرئی شمعدان میں موم بتیاں جھلملا رہی تھیں۔بڑا سخت رومینٹک اور پُر کیف وقت تھا۔اتنے میں گیلری میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ایک ملازم نے آکر الماس سے کہا۔''خورشید صاحب کے لئے فون آیا ہے،'' دلہن بنی ہوئی الماس لپک کرفون پرپہنچی۔ایک مقامی ہسپتال سےایک نرس پریشان آواز میں دریافت کرر ہی تھی۔''کیا مسٹرعالم وہاں موجود ہیں؟''

''آپ بتایئے۔آپ کومسٹرعالم سے کیا کام ہے؟''الماس نے درشتی سے پوچھا۔

''مس پیرو جا دستور ایک مہینے سے یہاں سخت بیمار پڑی ہیں۔آج ان کی حالت زیادہ۔۔زیادہ نازک ہوگئی ہے۔انہوں نے کہلوایا ہے کہ اگر چند منٹ کے لئے مسٹر عالم یہاں آسکیں۔۔۔۔''

''مسٹر عالم یہاں نہیں ہیں۔''

''آر یو شیور؟''

''یس،آئی ایم وری شیور؟''الماس نے گرج کر جواب دیا۔''کیا سمجھتی ہیں میں جھوٹ بول رہی ہوں؟اور کھٹ سے فون بند کر دیا اور ذرا سراسیمگی سے مہمانوں میں آشامل ہوئی۔

دو گھنٹے بعد پھر فون آیا۔

''ڈاکٹر صدیقی آپ کا کال۔۔۔۔۔گیلری میں کسی نے آواز دی۔''آپ کو فوراً ہسپتال بلایا گیا ہے۔''

ڈاکٹر صدیقی جلدی سے ٹیلی فون پر گئے۔پھر انہوں نے الماس کو آواز دی۔''بھئی معاف کرنا مجھے، بھاگنا پڑ رہا ہے۔''

الماس دروازے تک آئی۔''کل ضرور آیئے گا،ہم لوگ ویک اینڈ کے لئے پونا جا رہے ہیں۔''

ضرور۔۔۔۔ضرور۔۔۔۔گڈ نائٹ۔۔۔۔''ڈاکٹر صدیقی نے کہا اور باہر نکل گئے۔

بریچ کینڈی کے ہسپتال میں صحت یاب ہوکر خورشید عالم کے ابا میاں خوش خوش پرتاب گڑھ واپس جا چکے تھے۔جب تک کمبالا ہل والا فلیٹ تیا نہیں ہوا جو دلہن کو جہیز میں ملا تھا۔شادی کے بعد دولھا میاں سسرال ہی میں رہے۔اکثر وہ صبح کو دفتر جانے سے قبل بالکنی میں جا کھڑے ہوتے نیچے پہاڑ کے گھنے باغ میں سے گزرتی بل کھاتی سڑک برج خموشاں کی طرف جاتی تھی۔وقتاً فوقتاً سفید براق کپڑوں میں ملبوس پارسی ''نسیار'' سفید رومالوں کے ذریعہ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے قطاریں بنائے جنازہ اٹھائے دور پہاری پر چڑھتے نظر آتے۔کوّے اور گدھ درختوں پر منتظر بیٹھے رہتے۔برج خموشاں کے احاطے کا پھاٹک دور کیمپس کا رنر پر کھلتا۔پھاٹک پر ایک جھاڑ جھنکاڑ داڑھی والا خوفناک بوڑھا پھونس پارسی دربان ساکت بیٹھا رہتا تھا۔سفید ساریوں سفید کپڑوں مین ملبوس سوگوار پارسی ''میت چڑھانے'' کے بعد سرسبز پہاڑی سے اتر کر اپنی اپنی

موٹروں میں بیٹھ جاتے۔ پھاٹک کے باہر زندگی کا پرجوش سمندر اسی طرح ٹھاٹھیں مارتا رہتا۔ مقابل کی عمارت پر ایر انڈیا کے ''مہاراجہ'' کا اشتہار نت نئے پُر لطف الفاظ میں ان زندہ انسانوں کو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ایک سے ایک دل چسپ شہروں تک سفر کرنے کی دعوت میں مصروف رہتا۔

''اس'' نے ایک بار خط لکھا تھا۔ ''ذہن کی ہزاروں آنکھیں ہیں۔ دل کی آنکھ صرف ایک ہے لیکن جب محبت ختم ہو جائے تو ساری زندگی ختم ہو جاتی ہے۔''

سمندر کی موج پل کی پل میں فنا ہوگئی۔ آسمان پر سیگذرنے والے بادل فضا میں تحلیل ہو چکے۔ جب وہ مری ہوگی تو کووں اور گدھوں نے اس کا کس طرح سواگت کیا ہوگا۔ اس طوفانی رات کو ہسپتال کے وارڈ سے نکل کر اس کی روح جب آسمانوں پر پہنچی ہوگی اور عالمِ بالا کے گھپ اندھیرے میں کسی دوسری روح نے اس سے ٹکرا کر پوچھا ہوگا۔ ''تم کون ہو؟'' تو اس نے جواب دیا ہوگا۔ ''پتہ نہیں۔۔۔۔ میں کل ہی تو مری ہوں۔''

اب تک اس کی روح کہاں سے کہاں نکل گئی ہوگی۔ مرے ہوئے انسان زیادہ تیزی سے سفر کرتے ہیں۔

تارا بائی اپنی روشن آنکھوں سے صاحب کے گھر کی ہر چیز کو ارمان اور حیرت سے دیکھتی ہے۔ وہ صاحب کو حیرت سے تکا کرتی ہے۔ الماس بیگم اب امید سے ہیں۔ بہت جلد تارا بائی کا کام دگنا بڑھ جائے گا۔

آج صبح آئی اسپشلٹ ڈاکٹر صدیقی آئے تھے۔ جب تارا بائی ان کے لئے چائے لے کر برآمدے میں گئی تو وہ چونک پڑے اور خوشی سے پوچھا۔ ''ارے تارا بائی۔۔۔ تم یہاں کام کر رہی ہو؟''

''جی واگدر صاحب۔۔۔۔'' تارا بائی نے شرما کر جواب دیا۔

''اب صاف سمجھائی دیتا ہے۔''

5.6 خلاصہ

قرۃ العین حیدر اردو افسانہ نگاری کی مشہور و مقبول ادیبہ ہے۔ ان کے افسانے اور ناول نا قابل فراموش ہیں اپنے ناول اور افسانے میں انہوں نے ماضی، حال اور مستقبل تینوں کو اپنی گرفت میں لینے کی کو

شش کی ہے۔''نظارے درمیان ہے'' یہ افسانہ ان کے افسانوی مجموعہ ''روشنی کی رفتار'' سے لیا گیا ہے۔

خورشید عالم ایک ذہین طالب علم ہے اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے پیرس جانے کا وظیفہ ملتا ہے۔خورشید عالم متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔پیرس میں اس کی ملاقات پیروجا نامی ایک ہندوستان پارسی لڑکی سے ہوتی ہے وہ بھی پیرس سے پڑھنے کے لئے آتی ہے سنگت اس شوق ہے۔ یہ دونوں ہم خیال اور ہم وطن ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے بہت قریب ہو جاتے ہیں اور یہ قربت عشق کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔پیروجا ایک گیت گاتی تھی ۔ویسے تو وہ سراپا حسن تھی لیکن اس کے جسم کا سب سے خوبصورت جُز اس کی آنکھیں تھیں۔جس نے پہلے ہی نظر میں خورشید عالم کو اپنا بنالیا تھا۔تاریخ ختم ہونے کے بعد یہ لوگ ہندوستان واپس آنے والے تھے ۔ہندوستان آنے سے پہلے ہی منگنی کر لینے ہیں کی ہندوستان جا کر شادی کریں گے۔خورشید عالم کا کورس پہلے ہی ختم ہوتا ہے اور وہ دائمی وصل کے خوشگوار تصور میں عارضی جُدائی کو بہ خوشی قبول کر کے ہندوستان آتا ہے۔

ہندوستان آنے کے بعد باہر ملک کی ڈگری علمی لیاقت وقابلیت اور پُر وقار شخصیت کے باوجود بھی اسے اس کے معیار کے مطابق ملازمت نہیں ملتی جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھا۔ایک محفل میں اس کی خوبصورتی، علم لیاقت باہر ملک کی ڈگری اور بے روزگاری کو دیکھ کر ایک سماجی کارکن اپنی بڑی عمر کی ایک غیر شادی شدہ ایک بدصورت بھانجی جس کا نام الماس ہے اس کے لئے اس کا انتخاب کرتی ہے اور اس کی اقتصادی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اسے اپنے جال میں پھنسانے کا منصوبہ بناتی ہے۔

الماس ایک امیر باپ کی بیٹی ہے جس کا سمندر کے کنارے ایک حسین عالیشان بنگلہ ہے اس کے والدملوں کے مالک ہیں۔الماس کی آنٹی کے کہنے پر اس کے والد خورشید عالم کو اپنی فیکٹری دے دیتے ہیں ۔الماس کی آنٹی اسے اپنے منصوبے سے باخبر کرتی ہے اور منصوبے کے تحت الماس کے والد خورشید عالم کو آفیس کا وقت ختم ہونے کے بعد اکثر اپنے ساتھ اپنے گھر لاتے ہیں تا کہ الماس اور خورشید عالم میں گفتگو ہوں اور دونوں ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔لیکن خورشید عالم پیروجا کے عشق میں مبتلا تھا۔جو کہ کم سین تھی خوبصورت تھی اور اس کی ہم خیال تھی۔الماس میں اسے کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی کیونکہ الماس ایک بری

عمر کی بدصورت لڑکی تھی ۔وہ جب گھر آتا تو الماس سے گفتگو کرنے کی بجائے بالکونی میں ٹھہر کر سمندر کا نظارہ کرتا تھا۔وہ اپنی محبوبہ کی یاد میں کھو جاتا جو بہت جلد سمندری جہاز سے ہندوستان آنے والی تھی۔

خورشید عالم کے والد شدید بیمار ہونے کی خبر آجاتی ہے۔وہ دفتر سے رخصت لے کر پرتاپ گڑھ چلا جاتا ہے ۔اور رخصت بڑھانے کی درخوست کرتا ہے ۔درخوست کے جواب میں الماس ایک خط لکھتی ہے۔کہتی ہے کہ وہ اپنے والد کو لے کر بمبئی آئیں اور ان کا علاج کرائینگے دواخانے میں شریک ہونے کا پورا انتظار وہ کر چکے ہیں۔

ادھر کورس ختم ہونے کے بعد پیرو جا بھی ہندوستان آتی ہے ۔اپنی آنٹی ،انکل کے پاس آکر رہتی ہے۔ملازمت کے سلسلے میں وہ بھی دوڑ دھوپ کرتی ہے۔میوزک کے ایک پروگرام میں اس کی ملاقات الماس سے ہوتی ہے۔الماس باتوں باتوں میں معلومات حاصل کر لیتی ہے۔اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیرو جا ہی وہی لڑکی ہے جس کے عشق میں خورشید عالم گرفتار ہے۔اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنچانے کے لئے پیرو جا سے تعلقات بڑھاتی ہے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دیتی ہے۔ملاقات کے سلسلے میں جب بڑھتے ہیں تو ایک مرتبہ دورانِ گفتگو میں الماس کو مکمل طور پر اس بات کا پتہ

چلتا ہے کہ پیرو جا ہی خورشید عالم کی منگیتر ہے تو وہ بڑے چالاکی سے کام لیتی ہے۔

ایک طرف تو خورشید عالم اقتصادی طور پر پریشان تھے ۔ والد کی بیماری اس طرح سے معاشی پریشانیوں سے مجبور ہو کر وہ الماس سے منگنی کر لیتا ہے۔منگنی کی خبر سن کر وہ بہت بیمار ہو جاتی ہے وہ ڈاکٹر سے کہتی ہے کہ اس کی آنکھیں اس کے محبوب کی بہت پسند تھیں۔اتفاق سے اس کی آنکھیں ایک ایسی لڑکی کے حلقہ ہائے چشم میں بٹھائی جاتی ہے جو بعد میں الماس کے گھر مین ملازمہ بن کر آتی ہے جب خورشید عالم کو یہ بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس کی محبوبہ کی آنکھیں اس ملازمہ بن کر بٹھائی گئی ہیں خورشید عالم سوچتا ہے کہ میں پیرو جا کے موت کا ذمہ دار وہ تھی اس کی مکار حرکتوں کی بدولت آخری وقت میں بھی خورشید عالم پیرو جا سے نہیں مل پاتا۔لیکن قدرت کے ہاتھوں الماس شکست کھا جاتی ہے۔خورشید عالم کو پیرو جا سے دور رکھنے کی اس کی تمام تدبیریں الٹی ہو جاتی ہیں اور آخر میں پیرو جا کی خلل اندازی نہ کرنے کے باوجود بھی پیرو جا کی آنکھیں خورشید عالم اور الماس کے درمیان خلل کے باعث بنتی ہے۔

5.7 فرہنگ

معانی	الفاظ
قابلِ احترام ماں	والدۂ ماجدہ
مشہور	معروف
ملکوں اور شہروں کی سیر	سیاحت
ترکے میں آنا۔	ورثہ میں ملنا
دُنیا بھر میں مشہور	شہرۂ آفاق
جھگڑا	تنازعہ
زیادہ محسوس کرنے والا	حساس
ٹیس، ہلکا درد	کسک
دُکھ، مصیبت	کرب
امید، آشا	آس

5.8 مشقی سوالات

(ا) قرۃ العین حیدر کے حالاتِ زندگی بیان کیجیے۔

(۲) افسانہ ''نظارہ درمیاں ہے'' کا خاکہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

(۳) قرۃ العین حیدر کی ادبی خدمات کو بیان کیجیے۔

5.9 مزید مطالعہ کے لیے کتب

قرۃ العین حیدر کا فن	:	پروفیسر عبدالمغنی
قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری	:	شہنشاہ مرزا
قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ	:	پروفیسر محی الدین بمبئی
اُردو ادب کو خواتین کی دین	:	اردو اکادمی دہلی
اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	:	ڈاکٹر سنبل نگار

اکائی 6۔ چوتھی کا جوڑا

عصمت چغتائی

اکائی کے اجزاء:

6.1 مقصد

6.2 تمہید

6.3 مصنف کا تعارف

6.4 عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری

6.5 افسانہ ''چوتھی کا جوڑا''

6..6 خلاصہ

6.7 فرہنگ

6.8 مشقی سوالات

6.9 مزید مطالعہ کے لئے کتب

6.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' کا مطالعہ کرنا اور اس کے افسانہ نگار عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری سے متعارف کرانا ہے اس اکائی کے بعد آپ کو درج ذیل نکات سے واقفیت ہو جائے گی۔

۱)۔افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' سے متعلق معلومات فراہم کرنا۔

۲)۔متوسط طبقہ میں لڑکیوں کی شادی کے مسئلہ کو کس طرح اجاگر کیا گیا ہے؟

۳)۔اردو افسانہ نگاری میں عصمت چغتائی کا مقام و مرتبہ متعین کیجئے؟

6.2 تمہید

''چوتھی کا جوڑا''عصمت چغتائی کا شاہکار افسانہ ہے۔ یہ افسانہ حقیقت نگاری کا عمدہ نمونہ

ہے۔لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ نچلے اور متوسط کے لئے ہر دور میں اہم رہا ہے۔عصمت چغتائی نے اس اہم مسئلہ کو اس کے ساتھ جڑی ہوئی قباحتوں کے ساتھ فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

عصمت چغتائی نے اپنے ہر افسانہ میں کسی نہ کسی معاشری مسئلہ کو پیش کیا ہے۔اگر چہ ان کے بے باکانہ انداز اور فحش نگاری کی وجہ سے انھیں تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا لیکن ان کے تحریر کردہ سماجی مسائل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ان کے افسانہ مواد،فن،تکنیک اور انداز بیان کی وجہ سے اردو افسانوی ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔افسانہ''چوتھی کا جوڑا'' میں انھوں نے نچلے اور متوسط طبقہ کے لئے شادی مسئلہ کو موضوع بنایا ہے۔

6.3 مصنف کا تعارف

عصمت چغتائی اردو افسانہ نگاری میں اپنا ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتی ہیں۔وہ اردو کی باغی اور روایت شکن افسانہ نگار ہیں۔وہ ۳۱/ اگست/ ۱۹۱۵ء کو بدایوں میں پیدا ہوئیں۔انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیور سٹی سے ایف۔اے پاس کیا

اور لکھنو کے آئی ٹی کالج سے بی اے کی ڈگری لی۔وہ اسلامیہ گرلس ہائی اسکول بریلی کے صدر معلّمہ کے عہدے پر فائز رہیں۔۱۹۴۲ء کو ممبئی مین ان کا اسکول انسپکٹر کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔وہ فلم انڈسٹری سے بھی وابستہ رہیں۔۱۹۷۵ء کو انھیں''پدم شری''اعزاز سے نوازا گیا۔۲۴/ اکتوبر/ ۱۹۹۱ء کو ممبئی میں ان کا انتقال ہوا۔ان کے افسانوی مجموعے میں''کلیاں''اہم ہیں۔ان کا افسانہ''بچپن'' ہے جو ماہنامہ ساقی میں شائع ہوا تھا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ''کلیاں'' ہے۔

عصمت نے اپنے افسانوں میں متوسط طبقہ کے مسلم گھرانوں کی نہایت کامیاب عکاسی کی ہے۔انھوں نے عورتوں کی زندگی اور نفسیاتی مطالعہ کو اپنا افسانہ نگاری کا محوار اور مرکز بنایا ہے۔ان کے افسانوں کا موضوع نوجوان لڑکیاں ہے۔عصمت چغتائی کے افسانے اردو ادب میں اپنے اسلوب کی وجہ سے بھی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی نثر اپنے اندر بے ساختگی اور تیکھے پن کے علاوہ ایک تخلیقی جوہر بھی رکھتی ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں میں بے شمار نئے الفاظ محاورات،تشبیہات اور علامات کا اضافہ کیا۔عصمت نے ہندوستانی گھریلو زندگی کی جس سچائی، گہرائی اور باکی کے ساتھ:عکاسی کی ہے وہ انھیں اردو افسانہ نگاری

میں ایک اعلیٰ مقام عطا کرتی ہے۔

6.4 عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری

عصمت چغتائی کا نام آتے ہی ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ ایسا کیا رہ باقی رہ گیا جس پر قلم اٹھا کر عصمت کی تخلیق کے مانند ہی لوگوں کو چونکا دیا جائے۔ یہ کوئی آسان عمل نہیں ہے کہ قلم اُٹھایا اور کام ہو گیا۔اردو افسانے کے اُفق پر جس مانند عصمت کا نام جھگمگا رہا ہے اُس کی پھیلی ہوئی روشنی کو سمیٹنا ایک طالبِ علم کے لئے بے حد مشکل عمل ہے۔لیکن راہ میں آئی اس دشواری کا جواب بھی خود عصمت بتاتی نظر آتی ہیں۔بقول عصمت:۔

''لکھئے... ضرور لکھئے.... جو کچھ آپ دیکھتے ہیں.... سنتے ہیں، سوچتے ہیں وہ ضرور لکھئے۔نہ زبان کی غلطیوں سے ڈریئے نہ اس بات سے کہ کوئی آپ کو ادیب نہیں مانتا''۔یہ چند سطریں پڑھ کر میں نے اپنے اندر ایک الگ ہی spark محسوس کیا اور سمجھ آیا کہ دراصل عصمت کی یہ جُرآت ہی ان کی تحریروں میں ڈھل کر سامنے آتی ہے جس سے بے شک متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

عصمت کی اس جُرآت مندی کا سبب ان کے بچپن کی وہ تربیت بتائی جاتی ہے جس میں نہ ملنے والے special attention نے انھیں اس قدر بے باک اور باغی بنا دیا، شاید یہ وجہ رہی ہو لیکن احساس کمتری میں رہنے اور پلنے والا شخص نفسیاتی اور ذہنی مریض بھی بن کر رہ جاتا ہے ساتھ ہی عصمت کی شخصیت پر غور کریں تو وہ کبھی کسی طرح کے complex کا شکار نظر نہیں آتیں۔جس طرح بچہ انفرادی صفات لے کر دنیا میں قدم رکھتا ہے اُسی طرح عصمت کی بھی بے باکی اور باغیانہ صفات ابتدا ہی سے اُن کے مزاج کا حصّہ تھیں۔

عصمت کی افسانہ نگاری پر غور کریں تو ابتدا میں آپ حجاب امتیاز علی سے کافی متاثر نظر آتی ہیں لیکن انگارے کی اشاعت کے ساتھ ہی اردو افسانے کی دنیا میں ایک نیا باب کھلا اور ایک ایسی عورت کا نام سامنے آیا جس نے انسانی استحصال کے خلاف میدان میں آ کر اپنی روشن خیالی کا مظاہرہ کیا یعنی ''رشید جہاں''۔آپ

کی آنکھوں میں پلنے والا وہ خواب عصمت نے اپنی آنکھوں میں بسا لیا اور آخر کار اُسے ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوکر حقیقت کا چولا پہنا کر ہی دم لیا۔

اردو افسانے کی دنیا میں عصمت نے ایک ایسے موضوع کی طرف سب کی توجہ دلائی جہاں سماج کا ایک فرد دوسرے فرد کا متواتر استحصال کرتا نظر آتا ہے۔دراصل یہاں مُراد مرد کے ذریعے عورت پر کئے جانے والے ظلم سے ہے جسے عصمت نے ایک فرد کی نظر سے دیکھا اور محسوس کیا۔لہٰذا عصمت کے تمام افسانوی موضوعات کا مرکز ومحور وہ فرد یعنی کہ عورت رہی جس کا استحصال ایک بڑا مسئلہ تھا اور وہ بھی متوسط طبقے کی گھریلو مسلم خواتین۔دراصل عصمت نے گھر کی چہار دیواری میں پائے جانے والے بے شمار موضوعات اور کردار، جو کہ سماج میں ایک فرد کی حیثیت تو رکھتے ہیں لیکن اہمیت نہیں، اُن عورتوں کی زندگی کے تمام تر معاملات، پریشانیوں اور ذہنی اور جنسی گھٹن کو اپنا موضوع بنایا جنھیں اب تک نظر انداز کیا جارہا تھا۔ان افسانوں میں عورت کے تمام تر روپ جلوہ گر ہیں جس میں، بچپن سے لے کر جوانی تک کی دستک اور ادھیڑ عمر سے لے کر زندگی کے اخری سفر تک کا بیان ہے۔افسانہ چوتھی کا جوڑا، روشن، چھوٹی آپا ایسے افسانے ہیں جہاں شادی میں کھڑے ہونے والے مسائل ان کی زندگی بدتر کر دیتے ہیں۔ یہاں ایک بات اور قابلِ توجہ ہے، وہ یہ کہ مرد کے جذبات کو بھی آپ نے نظر انداز نہیں کیا، جس کا ثبوت افسانہ ''نفرت'' میں بخولی دیکھنے ملتا ہے، جس میں بغیر مرضی مرد پر عورت تھوپ دی جاتی ہے جس سے وہ مرنے کے بعد بھی آزاد نہیں ہو پاتا۔افسانے کے ہیرو ''منو'' جس کی شادی زبردستی فخر النسا سے کردی جاتی ہے اپنے جذبات دل ہی دل میں یوں بیان کرتا ہے ...

''کہیں دل کی گہرائیوں میں یہ آرزو چھپی ہوئی تھی کہ..... کہ وہ بھی کسی پھول جیسی ہلکی پھلکی تیتری کو یوں بازوؤں میں اُٹھالے جیسے.... مگر وہ اس آرزو کو دماغ سے آگے بڑھنے نہیں دیتا''۔

حالانکہ عصمت نے اپنے افسانوں میں عورت کی مظلومی کا ذکر کیا ہے لیکن ان کے نزدیک مرد بھی کئی دفعہ بے حد مظلوم ہوتا ہے۔اس طرح افسانے میں مزاح کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ جیسے افسانہ ''شوہر کی خاطر'' میں ریل کے سفر کے دوران شوہر کو لے کر کئے سوالات کا انبار ہمیں لطف اندوز کر دیتا ہے اور ہمیں بھی

افسانے کے کردار کے ساتھ ساتھ عورتوں کے نزدیک شادی کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

جہاں ایک طرف عصمت نے چوتھی کا جوڑا، ننھی کی نانی اور مغل بچہ جیسے مختلف افسانوں میں عورت کی بے بسی کا بیان کیا ہے تو دوسری طرف اُن کے بیشتر افسانوں میں اُن کے کردار روایت سے بغاوت کرتے نظر آتے ہیں جو کہ ان کا خاصہ تھا۔ ننھی کی نانی میں نانی کا کردار ایک ایسی عورت کی گماڑی کرتا ہے جو زندگی کے ہزار تھپیڑے کھانے کے باوجود زندہ رہتی ہے اور ابتدا سے ہی ایسی بے بسی کی زندگی گزارنے پر مجبور نظر آتی ہے۔ دیکھئے یہ اقتباس:

''دنیا کا کوئی ایسا پیشہ نہ تھا جو زندگی میں ننھی کی نانی نے اختیار نہ کیا۔ کٹورا گلاس پکڑنے کی عمر سے وہ تیرے میرے گھر میں دو وقت کی روٹی اور پرانے کپڑوں کے عوض اوپر کے کام پر دھر لی گئیں۔ یہ اوپر کا کام کتنا نیچا ہوتا ہے۔ یہ کچھ کھیلنے کودنے کی عمر سے کام پر جوت دیے جانے والے ہی جانتے ہیں۔ ننھے میاں کے آگے جھنجھنا بجانے کی غیر دلچسپ ڈیوٹی سے لے کر بڑے سرکار کی سر کی مالش تک اوپر کے کام کی فہرست میں آ جاتی ہے''۔

سماج میں عورت کی اس حالت کو دیکھ کر عصمت کو رحم نہیں بلکہ غصّہ آتا تھا۔ جس کے بنا پر ان کے کرداروں کی زبان بھی ان کے قلم کی مانند قینچی کی طرح چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور منھ توڑ جواب دیتی نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں عورت وفا کا پیکر، حسن کا مجسمّہ یا محبت کی دیوی نہیں ہوتی بلکہ اپنے جذبات کو پیش کرنے کا دم خم رکھتی ہے۔ بقول عصمت ''اگر مرد چیخ سکتا ہے تو عورت کو بھی کراہنے کی اجازت ہونی چاہئے''۔ عصمت کے افسانے تل، گھر والی، لحاف، بھول بھولیاں اور کنواری وغیرہ میں عورت کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کرتی نظر آتی ہے۔

اس طرح ایک طرف عصمت کی عورت روتی بصورتی نظر آتی ہے تو دوسری طرف حالات کے آگے ڈٹ کر کھڑی رہتی ہے۔ عصمت چونکہ ترقی پسند تھیں لہٰذا حقیقت کی پیش کش کے ساتھ ہی نت نئے امکان پیدا کرنا جو انسان کی ترقی میں کارگر ہوں ان کا اہم مقصد تھا۔ بقول عصمت ''ترقی پسند ادب وہ ہے جو ہر انسان کو برابر کا حق دینے پر یقین رکھتا ہو۔ انسان کی زندگی کے عروج کا قائل ہو''۔ لہٰذا اپنے افسانوں کے ذریعے

عصمت نے اس خواب کو پورا کرنے کی کوشش کی جہاں ہر فرد اپنی ایک حیثیت رکھتا ہو۔اس کے ساتھ ہی سماجی حقیقت نگاری کا تصور بھی ان کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے، جہاں اپنے افسانوں میں سماج میں رائج گھناؤنے رسم و رواج کو پیش کیا اور اونچے طبقے میں نوابوں کے ذریعے باندیوں پر ہونے والے ظلم کو اپنا موضوع بنایا۔افسانہ''بدن کی خوشبو''اور''اپنا خون''اس کی عمدہ مثال ہے۔ان افسانوں میں باندیوں کا جنسی استحصال اور ناجائز تعلقات کا بیان ملتا ہے اوران کے حاملہ ہونے کے بعد ان کی طرف بے حسی اور بے توجہی کے معاملات کی بڑی صفائی سے تصویر پیش کی ہے۔اور ساتھ ہی نوابوں کی بیگموں کی تصویر کو بھی بخوبی پیش کیا ہے جو اپنی اولاد کو بہکنے سے بچانے کے لئے باندیوں کو ان کی خدمت میں پیش کرتی ہیں اور حاملہ ہو جانے کے بعد انھیں محل سے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ایک غریب عورت کس طرح مختلف سطح پر جبر و استحصال کا شکار ہوتی ہے عصمت نے اس موضوع پر بہترین افسانے لکھے ہیں۔ساتھ ہی افسانہ''بدن کی خوشبو''میں تعلیم یافتہ اور ذہین نواب کے بیٹے کا ایک باندی کی محبت میں ڈوب کر اس کے لئے سب کچھ چھوڑ دینا عصمت کے اسی ترقی پسند ذہن کی علامت ہے جو معاشرے کی تنقید کے ساتھ ساتھ اسے بدلنے کا بھی قائل ہو۔

عصمت کی اصل خوبی ان کا اسلوب ہے۔ان کا قلم باغی اور جارحانہ طرز رکھتا تھا۔دراصل عصمت نے جس ماحول میں پرورش پائی، اُس کا مشاہدہ اور مطالعہ اتنی باریکی سے کیا کہ اس زندگی کا ہر پہلو اُنھیں کے انداز میں ہو بہو ہمارے سامنے پیش کر دیا اور لوگوں کو اس قدر چونکا دیا کہ گھر کی چار دیواری میں چھپے لاتعداد موضوعات ادب میں ایک نئی راہ قائم کرتے نظر آتے ہیں۔

کئی دفعہ عصمت کے افسانوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک محدود میدان میں اپنے قلم کی زور آزمائی کی لیکن ایک اہم سوال یہ ہے کہ عورتوں کے متعلق، ان پر ہونے والے ظلم و استحصال، ذہنی و جسمانی تکلیفوں کو پیش کرنے کے باوجود ہمارے سماج میں عورت آج بھی انھیں تمام مسائل سے دوچار ہوتی نظر آتی ہے جس پر عصمت نے لکھا۔آج بھی افسانہ''ننھی کی نانی''جیسی کئی ننھی ہوس کا شکار ہوتی ہیں۔افسانہ''بیکار''کی کردار جیسی کئی بیویاں گھر کی ذمہ داری اٹھانے پر مخالفت جھیلتی ہیں، آج بھی''امربیل''کے کردار جیسی کئی رخسانہ بے جوڑ شادی کے بنا پر اپنی زندگی برباد ہونے سے نہیں بچا پاتیں۔غرض کہ عصمت کا ہر ایک

کردار ہمیں آج بھی اپنے پاس کھڑا نظر آتا ہے لہٰذا جن لوگوں کو آپ کے افسانوں میں سوائے لذت اور فحش نگاری کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تو یہ ان کے اذہان کا قصور ہے ورنہ تو آج بھی عصمت کی کہانیاں سماج میں موجود تمام تر حقیقت کی روداد بیان کرتی ہے، جہاں آج بھی تانیثیت اور عورت کے مسائل کھڑے نظر آتے ہیں اور جہاں آج بھی برابری کے حق کا وہی خواب جو عصمت کی آنکھوں میں تھا ہمارے سامنے آنکھیں پھاڑیں نظر آتا ہے جس پر ''نئی لہر'' کا لیبل لگا کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا عصمت کے افسانے آج بھی بھرپور معنویت کے حامل ہیں اور وقت کے ساتھ اُن کی معنویت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

6.5 افسانہ ''چوتھی کا جوڑا''

سردی کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ محلے ٹولے کی عورتیں خاموش سہمی ہوئی سی بیٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچّے چھاتیوں سے لگائے تھے۔ کبھی کبھی کوئی مختنی سا چڑ چڑا بچہ رصد کی کمی کی دہائی دے کر چلّا اٹھتا۔

''ٹائیں ٹائیں میرے لال''! دبلی پتلی ماں اپنے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان ملے چاول دھوپ میں پھٹک رہی ہو۔ اور پھر ہنکارے بھر کر خاموش ہو جاتا۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں تفکر چہرے کو تک رہی تھیں چھوٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑے گئے تھے، ابھی سفید گزی کا نشان بیونتنے کی کسی کو ہمت نہ پڑی تھی۔ کاٹ چھانٹ کے معاملے میں کبریٰ کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ ان کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے کتنے چھٹی چھوچھک تیار کئے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلّہ میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی، کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبریٰ کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں، کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں، جو کھنٹا بناتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

''آستین کے لئے گھیر تو نکل آئے گا، گریبان کے لئے کترن میری بقچی سے لے لو'، اور مشکل آسان

ہوجاتی۔ کپڑا تراش کروہ کترنوں کی بنڈی بنا کر پکڑادیتی۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا اور سب کو یقین تھا کے آج تو کبریٰ کی ماں ہی ناپ تول ہا رجائے گی، جب ہی تو سب دم سادھے ان کا منہ تک رہی تھیں۔ کبریٰ کی ماں کو پُراا ستقلال چہرا پر فکر کی کوئی شکل نہیں، چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں۔ لال ٹول کا عکس ان کی نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اداس گہری جھریاں اندھیری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اجاگر ہوگئیں، جیسے گھنے جنگل میں آگ اُبھر اُٹھی ہو،اور انھوں نے مسکرا کر قینچی اُٹھالی۔

محلّہ والیوں کے جمگھٹے سے ایک لمبی اطمینان کی سانس اُبھری۔ گود کے بچے بھی ٹھسک دئے گئے ۔چیل جیسی نگاہوں والی کنوایوں نے حمپا چمپ سوئی کی ناکوں میں دورے پُروے، نئی بیاہی دلہنوں نے انگشتانے پہن لئے۔ کبریٰ کی ماں کی قینچی چل پڑی تھی۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پر لٹکائے ہتھیلی پر تھوڑی رکھے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی ہیں اور بقچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈھی کے پاس بیٹھی مانجھتی ہوئی کبریٰ کن انکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرک جھپکی اس کے زردی مائل مٹائے رنگ میں لپک اُٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پو لے پولے ہاتھوں سے کھول کر وپنے زانوؤں پر پھیلاتی تو ان کا مرجھایا ہوا چہرا ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا۔ گہری کی صدوقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا۔ ہر تانکے پر زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اٹھتیں۔

یاد نہیں کب شبنمی دوپٹے بنے، ٹکے تیار ہوئے اور گاڑی کی قبر جیسی صندوق کی تہہ میں ڈوب گئے ۔کٹوریوں کے جال دھندلا گئے۔ گنگا جمنی کرنیں ماند پڑ گئیں۔ طولی کے لچھے اداس ہو گئے مگر کبریٰ کی برات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا ہوجاتا تو اسے چالے کا جوڑا کہہ کر سی دیا جاتا اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہوجاتا۔ بڑی چھان بین

کے بعد نئی دلہن چھانٹی جاتی۔ سہ دری کے چوکے پر صاف ستھری چادر بچھی۔ محلّہ کی عورتیں ہاتھ میں پاندان

اور بغلوں میں بچے دبائے جھانجھیں بجاتی پہنچتیں۔

''چھوٹے کپڑے کی گونٹ تو اتر آئے گی، پر بچیوں کا کپرا نہ نکلے گا۔''

''بولو بوا، لو، اور سنو۔ تو کیا نگوڑ ماری چول کی چولیں پڑیں گی؟'' اور فرسب کے چہرے فکر مند ہو جاتے۔ کبریٰ کی ماں خاموش کیمیا گر کی طرح آنکھوں کے فیتے سے طول وعرض ناپتی اور بیویاں آپس میں چھوٹے کپڑے کے متعلق کھسر پھسر کر کے قہقہہ لگا تیں۔ ایسے میں کوئی من چلی کوئی سہاگ یا بنا چھیڑ دیتی۔ کوئی اور چار ہاتھ آگے والی سمدھنوں کو گالیاں سنانے لگتی۔ بیہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہو جاتیں۔ ایسے موقوں پر کنواری بالیوں کو سہ دری سے دور سر ڈھانک کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دے دیا جاتا اور جب کوئی نیا قہقہہ سہ دری سے اُبھرتا تو بے چاریاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں۔ اللہ! قہقہے انھیں خود کب نصیب ہوں گے ؟''

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کے ماری مچھروں والی کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلے پر پہنچ جاتی اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازہ کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی۔ کوئی جو اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا۔ جو کلی الٹی کٹ جائے تو لونائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی آڑ نگا لگے گا۔ یہ تو دولھا کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا آڑ نگا باندھے گی۔ جو گوٹ میں کان آ جائے تو سمجھ لو یا تو مہر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کی پلنگ پر جھگڑا ہوگا۔ چوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جاتا ہے۔ نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا ہے کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔ بسم اللہ کے زور سے سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ ذرا سی کترن بھی بچتی تو تیلے دانی یا شیشی کا غلاف سی کر دھنک گوکھرو سے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا ہے کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے۔ جو برات آ گئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابّا گزرے۔ سلیقہ کا بھی پھول گیا۔ حمیدہ کو ایک دم ابّا یاد آ گئے۔ ابّا کتنے پتلے دبلے جیسے محرم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح نیم کے مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو

گھٹنے پر بٹھا کرنا جانے کیا سوچا کرتے۔ پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا اور وہ کھانستے ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگڑ کران کی گود سے اتر آتی۔ کھانسی کے دھکوں سے یوں ہل ہل جانا اسے قطعی پسند نہ تھا۔ اس کے ننھے غصے پر وہ ہنستے اور کھانسی سینے میں بے طرف الجھتی جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑ پھڑا رہے ہوں۔ پھر بھی اماں آ کرانھیں سہلا دیتیں۔ پیٹھ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

''تو یہ ایسی بھی کیا ہنسی؟''

اچھو کے دباؤ سے سرک آنکھیں اوپر اٹھا کرابّا بے کسی سے مسکراتے۔ کھانسی تو رُک جاتی مگر وہ دیر تک بیٹھے ہانپا کرتے۔

'' کچھ دوا دوا رو کیوں نہیں کرتے کتنی بار کہا تم سے؟''

''بڑے شفا خانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ اور روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹاک مکھّن۔''

''اے خاک پڑے ان کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی ہے اور پر سے چکنائی بلغم نہ پیدا کرے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی کو۔''

''دکھاؤں گا۔'' ابّا حقہ گڑ گڑاتے اور پھر اُچھو لگتا۔''

''آگ لگے اس موئے حقّے کو۔ اس نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اُٹھا کر۔''

اور ابّا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ کبریٰ جوان تھی۔ کون کہتا تھا کہ جوان تھی۔ وہ جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناؤنی سن کر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسے جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں نہ اس کے سینے پر طوفان اٹھے اور نہ کبھی ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

ابّا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور انھیں اٹھانے کے لئے کسی حکیم اور ڈاکٹر کا نسخہ نہ آسکا۔

اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لئے ضد کرنی چھوڑ دی ،اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے، جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے۔اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اٹھ رہی ہے۔

مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا، وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگ پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شبرات کے مہینے میں کریب کا ڈوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی اسی تھی کہ بغیر خریدے گزارا نہ تھا، منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولس کی ٹریننگ کے سلسلے میں آ رہا ہے بی اماں کو بس جیسے ایک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا جانو چوکھٹ پر بارات آن کھڑی ہوئی۔اور انہوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری۔ ہول سے تو ان کے چھکّے چھوٹ گئے۔جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ ''بہن میری مری کا منھ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آو۔''

اور پھر دونوں میں کھسر پھسر ہوئی۔بیچ میں ایک نظروں دونوں کبریٰ پر بھی ڈال لیتیں۔جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔وہ اس کا ناپھسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اسی طرح بی اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منھ بالی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھرو چھ ماشہ سلمہ ستارا اور پاؤ گز نیفے کے لئے ٹول لا دیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ و پونچھ کر تیار کیا۔تھوڑا سا چونا

منگا کر کبریٰ نے کمرہ اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کال اڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکّر کھا کر دوہری ہو گئی۔ساری رات کروٹیں بدلتی گزری۔ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے،دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آرہے تھے۔

''اللہ! میرے اللہ میاں !اب کہ تو میری آپا کا نصیبہ کھُل جائے۔میرے اللہ میں سو رکعت تیری درگاہ میں بڑھوں گی۔''حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔

صبح راحت بھائی آئے تو کبریٰ پہلے ہی سے مچھروں والی کوٹھری میں جا چھپی تھی۔ جب سویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبریٰ کوٹھری سے نکلی

اور جھوٹے برتن اٹھا لئے۔''لاؤ میں دھوؤں بی آپا' حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

''نہیں''۔وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی، بی اماں مسکارتی رہیں اور کریب کے دوپٹہ میں لپاٹانکتی رہیں۔

جس راستہ کان کی لونگیں گئی تھیں اسی راستے پھول پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی پھر ہاتوں کی دو دو چوڑیاں بھی منجھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے دی تھیں۔روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لئے پراٹھے تلے جاتے،کوفتے،بھُنا پلاؤ مہکتے۔خود سوکھی سا نولہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

''زمانے بڑا خراب ہے بیٹی۔''وہ حمیدہ کو منھ پھیلاتے دیکھ کر کہا کرتیں۔اور وہ سوچا کرتی۔ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔بی آپا صبح سویرے اٹھ کر جادو کی مشین کی طرح جٹ جاتی ہے۔نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لئے پراٹھے تلتی ہے دودھ اوٹاتی ہے تاکہ موٹی سی ملائی پڑے۔اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے۔اور کیوں نہ بھرے۔آخر کو وہ ایک دن اس کا اپنا ہو جائے گا۔جو کچھ کمائے گا داس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھولوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے دی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا اور اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اٹھا۔کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں۔اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔ان کے کپڑوں کو پیار سے تہہ کرتیں۔جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں۔وہ ان کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں۔بساندی بنیان اور ناک سے لتھڑے ہوئے رومال صاف کرتیں ان کے تیل میں چپچہاتے ہوئے تکیئے کے غلاف پر سوئٹ ڈریم کاڑتیں۔پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔راحت صبح انڈے پراٹھے ڈٹ کر کھاتا۔اور شام کو آ کر کوفتے کھا کر سوجاتا۔اور بی اماں کی منہ بولی بہن چکمانہ انداز میں گھسر پھسر کرتیں۔

''بڑا شرمیلا ہے بے چارہ''۔بی اماں تاویلین پیش کرتیں۔''ہاں یہ تو ٹھیک یہ پر بھئی کچھ تو پتہ چلے رنگ ڈھنگ سے، کچھ آنکھوں سے۔''

''اسے فوج، خدا نہ کرے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے۔ اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے۔'' بی اماں فخر سے کہتیں۔

''اسے تو پردہ اتروانے کو کون کہے ہے''۔ بی آپا کے پکے مہاسوں کو دیکھ کر انہیں بی اماں کی دور اندیشی کی داد دینی پڑی۔

''اے بہن، تم تو سچ بہت بھولی ہو۔ یہ میں کب کہوں ہوں۔ یہ چھوٹے نگوڑی کون سی بکرید کو کام آئے گی؟'' وہ مے ری طرف دیکھ ہنسی۔

''اری ادنک چڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت، کوئی ہنسی مذاق، اونہہ واری چل دیوانی۔''

''اے تو میں کیا کروں خالہ؟''

''راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟''

''بھئی ہمیں تو شرم آتی ہے۔''

''اے ہے، وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا۔'' بی اماں چڑ کر بولیں۔

''نہیں تو۔ مگر............'' میں لاجواب ہوگئی اور پھر مسکوٹ ہوئی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد کھل کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار مسکرا کر بڑیں چپکے سے بولیں۔

''دیکھو ہنسنا نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔''

''نہیں ہنسوں گی۔'' میں نے وعدہ کیا۔

''کھانا کھا لیجئے۔'' میں چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر جو پٹی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا میں بھاگی وہاں سے۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اللہ توبہ کیا خنّاس آنکھیں ہے۔'' جانگواڑی ماری اری دیکھ تو سہی وہ کیسا منہ بناتا ہے۔ اے ہے سارا مزا کرکرا کر دیا ہو جائے گا۔''

آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔ لوٹی ہوئی براتوں کا غبارہ تھا اور چوتھی کے پانے جوروں کے مانند اداسی میں سر جھکائے پھر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے، میری طرف نہ دیکھا کھلی کہ کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہیے تھا کہ مذاک اڑاؤں۔قہقہہ لگاؤں کہ واہ جی واہ دولھا بھائی! کھلی کے کباب کھا رہے ہو۔'' مگر جانو کسی نے میرا نرخرہ دبوچ لو۔

بی اماں نے جل کے مجھے واپس بلا لیا۔اور منھ ہی منھ میں مجھے کوسنے لگیں۔اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ مزے سے کھا رہا ہے کم بخت۔

''راحت بھائی! کوفتے پسند آئے؟'' بی اماں کو سکھانے پر میں نے پوچھا۔

جواب ندارد۔

''بتایئے نا؟''

''اری ٹھیک سے جا کر پوچھ۔'' بی اماں نے ٹھوکا دیا۔

''آپ نے لا کر دیئے۔اور ہم نے کھائے۔مزیدار ہی ہوں گے۔''

''ارے واہ رے جنگلی۔'' بی اماں سے نہ رہا گیا۔

''تمہیں پتہ بھی نہ چلا کیا مزے سے کھلی کباب کھا گئے۔''

''کھلی کے؟ ارے تو راز کا ہے کے ہوتا ہیں؟ میں تو عادی ہو چکا ہوں کھلی اور بھوسا کھانے کا۔''

بی اماں کا منہ اتر گیا۔بی آپا کی جھکی ہوئیں پلکیں اوپر نہ اٹھ سکیں۔دوسرے روز بی آپا نے دوگنی سلائی کی۔اور پھر شام کو جب میں کھانا لے کر گئی تو بولے

''کہئے آج کیا لائے ہیں؟ آج تو لکڑی کے برادے کی باری ہے۔''

''کیا ہمارے یہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟'' میں نے جل کر کہا۔

''یہ بات نہیں ہے۔کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔کبھی کبھی کی کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری۔''

''میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ہم سوکھی راٹی کھا کے اسے ہاتھی کی خوارک دیں۔گھی ٹپکتے پراٹھے ٹھسائیں۔میری بی آپا کو جوشاندہ نصیب نہیں اور دودھ ملائی نگلوائیں''

میں بھنّا کر چلی آئی۔

بی اماں کی منہ بولی بہن کا نسخہ کام آ گیا اور راحت دن کا زیادہ حصہ گھر ہی میں گزارنا شروع کر دیا۔ بی اماں چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں۔ اور راحت کی غلطیاں آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چُبھا کر تین۔ بابے بات چھیڑنا۔ کھاتے وقت کبھی کھانا تو کبھی نمک کے بہانے سے اور ساتھ ساتھ جملہ بازی میں گھسیا کر بی آپا کے پاس جا کر بیٹھتی۔ جی چاہتا کے کسی دن صاف صاف جا کر کہہ دوں کے کس کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی مجھ سے تمہارا یہ بیل ناتھا جائے گا مگر بی آپا کے الجھے ہوئے بالوں ہر چولہے کی اڑتی ہوئی راکھ..........نہیں میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے چھپا دیئے۔ ناس جائے اس کم بخت نزلہ کا بے چاری کے بال پکنے شروع ہو گئے۔

راحت نے پھر کسی بہانے سے مجھ پکارا۔ ''اونہہ!'' میں جل گئی۔ پر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پلیٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

''آپ ہم خفا ہو گئیں؟'' راحت نے پانی کا کٹورا لے میری کلائی پکڑ لی میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔''

''کیا کہہ رہے تھے؟'' بی آپا نے شرم وحیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی۔

''کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ! جی چاہتا ہے کھاتا ہی چلا جاؤں۔ پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں..........اوہ نہیں..........کھانہیں بلکہ چوم لوں۔''

میں جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھردری ہلدی دھنیا کی بساندی میں سڑا ہو ہاتھ سے لگا لیا میرے آنسو نکل آئے۔ ''یہ ہاتھ۔'' میں نے سوچا جو صبح سے شام مسالہ پیتے ہیں، پانی بھرتے ہیں، پیاز کاٹتے ہیں، بستر بچھاتے ہیں، جاتے صاف کرتے ہیں۔ یہ کس غلام سے صبح سے شام تک جتے ہی رہتے ہیں ان کی بیگار کب ختم ہو گئی؟ کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انھیں کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انھیں کبھی کوئی پیار سے نہیں چومے گا؟ کیا ان کبھی مہندی نہ رچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا؟ جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

''اور کیا کہہ رہے تھے؟'' بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھر درے تھے، آواز اتنی میٹھی اور سیلی تھی کہ راحت کے کان ہوتے تو............مگر راحت کے نہ کان تھے نے ناک بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

''اور کہہ رہے تھے کہ اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جوشاندہ پیاہ کریں۔''

''چل جھوٹی''۔

''ارے واہ چھوٹے ہوگے آپ کروہ............''

''اری چپ مردار!'' انھوں نے میرا منھ بند کر دیا۔

''دیکھ تو سُئٹر بن گیا ہے انھیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لی جو۔''

''نہیں لی آپا۔ انھیں نہ دو وہ سوئٹر۔ تمہاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سوئٹر کی کتنی ضرورت ہے؟'' میں نے کہنا چاہا پر کہہ نہ سکی۔

''آپا بی تم خود کیا پہنو گی۔؟

''ارے مجھے کیا ضرورت؟ چولہے کے پاس ویسے ہی جھلسی رہتی ہے۔'' سوئٹر دیکھ کے راحت نے اپنی ایک ابرا وشرارت سے اوپر تان کر کہا۔

''کیا یہ سوئٹر آپ نے بنا ہے؟''

''نہیں تو''

''تو بھئی ہم نہیں پہنے گے۔''

''میرا چاہا کے اس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے۔ مٹی کے تھودے۔ یہ سوئٹر ان ہاتھوں نے بنا ہے جو جیتے جا گتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کی ارمانوں کی گردمیں پھنسی ہوئی ہیں، یہ ان ہا تھوں کا بنا ہوا ہے جو

ننھے پنگورے میں جھلانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لوگدھے کہیں کے۔ اور یہ دو پتوار بڑے بڑے سے طوفان کے تھپڑوں سے تمھاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کے گیت نہ بجا سکیں گے۔ منی پور اور بھارت ناٹیم کے مدرانہ دکھا سکیں گے۔ انھیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا۔ انہیں پھولوں سے کھیلنا

نہیں نصیب ہوا۔مگر یہ ہاتھ تمھارے جسم پر چربی چڑھانے کے لئے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں ۔صابن اور ب سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں ۔چولہے کی آنچ سہتے ہیں۔تمھارے غلاظتمیں سہتے ہیں ۔تمہارے غلاظتمیں دھوتے ہیں تا کہ تم اجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔محنت نے ان سے زخم ڈال دئے ہیں ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکتی ہیں۔انھیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔

مگر میں چپ رہی بی اماں کہتی ہے کہ میرا دماغ تو میری نئی نئی سہلیوں خراب کر دیا ہے۔وہ مجھے کیسے نئی نئی باتیں ہیں۔کسی ڈرادنی موت کی باتیں، بھوک اور کال کی باتیں۔دھڑکتے ہوئے دل کے ایک دم چپ چاپ ہو جانے کی باتیں۔

''یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجئے۔دیکھئے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے؟''

جنگلی بلی کی طرح میں نے اس کا منھ، ناک، گریبان اور بال نوچ ڈالے۔اور اپنی پلنگڑی پر جا گری ۔بی آپا نے آخری روتی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے۔اور آنچل سے پونچھتی میری پاس آ بیٹھی۔

''وہ بولے؟'' ان سے نہ رہا گیا۔تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

''بی آپا۔یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں۔''میں نے سوچا کہ میں آج سب کچھ بتا دوں گی

''کیوں؟' وہ مسکرائیں۔

''مجھے اچھے نہیں لگتے......دیکھئے میری ساری چوڑیاں چورا ہوگیں۔'میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

''بڑے شریر ہیں۔''انھوں نے رومانٹک آواز میں شرما کے کہا۔

''بی آپا............سنو بی آپا۔راحت اچھے آدمی نہیں ہیں۔''میں نے سلگ کر کہا۔

''کیا ہوا؟''بی اماں نے جانماز بچھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو میری چوڑیاں بی اماں۔''

''راحت نے توڑ ڈالیں۔''بی اماں مسرت سے بولیں۔

''ہاں!''

''خوب کیا۔تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے۔اے ہے تو دم کاہے کو نکل گیا۔بڑی موملی بنی ہوئی ہو کہ

ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں۔'' پھر چمکار کر بولیں۔ ''خیر تو بھی میں بدلہ لجیو۔ وہ کسر نا کالیو یادہی کریں میاں جی۔ یہ کہہ کرانھوں نے نیت باندھ لی۔

منھ بولی بہن پھر کانفرنس ہوئی اور معملات کو امید افزا راستے پر گامزن دیکھ کراز حد خوشنودی سے مسکرا یا گیا۔

''اور وہ مجھے بہنوئیوں کے چھیڑ چھاڑ کے ہتھکنڈے بتانے لگیں۔ کہ اس طرح انھوں نے سرف چھیڑ چھاڑ کی تیر بہدف نسخے ان دونمبری بہنوں کی شادی کرائی جن کی ناؤ پار لگنے کر سارے مواقع ہاتھ نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے جہاں بے چارے کو لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں شرمانے لگتے اور شرماتے شرماتے اختلاف کے دورے پڑنے لگتے اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجئے۔ دوسرے وائسرے کے دفتر میں کلرک تھے جہاں سنا کے باہر آئے ہیں لڑکیاں چھیڑنا شروع کر دیتی تھیں۔ کبھی گلوریوں میں مرچیں بھر کے بھیج دیں۔ کبھی سوئیو میں نمک دال کر کھلا دیا۔

اے لو وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے، پانی آئے، کیا مجال جو وہ نہ آئے۔ آ کر ایک دن کہلوا دیا۔ اپنے ایک جان پہچان والے سے کہا۔ کہ ان کی یہاں شادی کرا ر دو۔ پوچھا کہ ''بھئی کس سے؟'' تو کہا ''کسی سے بھی کرادو''۔ اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو بڑی بہن کی صورت تھی۔ کہ دیکھو تو جیسے بیجا چلا آتا۔ چھوٹی تو بس سبحان اللہ۔ ایک آنکھ تو دوسری پچھّم۔ پندرہ تولے سونا دیا ہے باپ نے اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دلوائی۔''

''ہاں بھئی جس کے پاس پندرہ تولے سونا دیا ہو۔ اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری اسے لڑکا ملتے کیا دیر لگتی ہے؟ بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''یہ بات نہیں ہے بہن۔ آج کل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بیگن ہوتا ہے۔ جدھر جھکا دو ادھر ہی لڑھک جائے گا''۔

مگر راحت تو بیگن نہیں اچھا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکاؤ دینے میں کہیں میں ہی نہیں پس جاؤں۔ میں نے سوچا پھر میں نے راحت کی طرف دیکھا وہ خاموش دہلیز پر آبیٹھی، آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا

رہی تھی۔ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوارے پنے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتی۔

''کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟نہیں وہ بھوک کے احساس کے پہلے ہی سہم چکی ہے۔مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک امنگ بن کر نہیں ابھرا بلکہ راٹی کپڑوں کے سوال بن کر ابھرا ہے۔وہ ایک بیواہ کی چھاتی کا بوجھ ہے۔اس بوجھ کو ڈھکیلنا ہی ہوگا''۔

مگر اشاروں کنایوں کے با وجود راحت میاں نہ تو خود منہ سے پھوٹے اور نہ ہی ان کی گھر ہی سے پیغام آیا۔تھک ہار کر بی اماں نے پیروں کے توڑے گردی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی۔دو پہر بھر محلے ٹولے کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔بی آپا شرمائی لجائی مچھروں والی کوٹھری میں خون کی آخری بوندیں چسانے کو جا بیٹھی۔بی اماں کمزور میں اپنی چوکی پر بیٹھی چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔آج ان کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے۔آج مشکل کشائی ہوگئی۔بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔وہ بھی نکل جائیں گی آج ان کی جھریوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔بی آپا کی سہلیاں ان کو چھیڑ رہی تھی اور وہ خون کی بچی کھچی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔آج کئی روز سے ان کا غبارہ نہیں اترا تھا۔تھکے ہارے دئے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔اشارے سے انھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کے ملیدے کی طشتری مجھے تھما دی۔

''اس پر مولوں صاحب نے دم کیا ہے۔''ان کی بکاری سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لے کر میں نے سوچنے لگی۔مولوی صاحب نے دم کیا ہے یہ مقدّس ملیدہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا۔وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا۔یہ دم کیا ہوا ملیدہ مراد بر لائے گا۔میری کانوں میں شادیا بجنے لگے۔میں بھا گی بھا گی کوٹھے سے برات دیکھنے جا رہی ہوں۔دولھا کے منہ پر لمبا سا سہرا پڑا ہے جو گھوڑے کے ایالوں کے چوم رہا ہے۔چھوتھی کا شہابی جوڑا پہلے پھولوں سے لدی شرم سے نڈھال، آہستہ آہستہ قدم تولتی بی آپا چلی آ رہی ہیں......چوتھی کا جوڑا اور سلمہ سنگار کر رہا ہے بی اماں کا چہرا پھول کی طرح کھیلا ہوا ہے......بی آپا کی آنکھیں ایک بار او پر اٹھیں ہیں شکریہ کا آنسو جھلک کر

آسمان کے تاروں میں قہقہے کی طرح الجھ جا ہے۔

''یہ سب تیری ہی محنت کا پھل ہے بی آپا کی خاموشی کہے رہی ہے۔'' حمیدہ کا گلا بھر آیا......

''جاؤ نہ میری بہنو۔'' بی آپا نے اسے جگا دیا۔اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی دیوڑھی کی طرف بڑھی۔

''یہ............ یہ ملیدہ'' اس نے اچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا اس کے پر لرز رہے ۔جسے جو سانپ کی بابنی میں گھس آئی ہو۔اور پھر پہاڑ کھسکا......اور منہ کھول دیا۔وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی۔جیسے کوئی خون کا گلا گھونٹ رہا ہو۔کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدے کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھایا۔ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہار کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا نیچے تھان اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔

نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہوگئی۔باہر آنگن میں محلے کی بہو بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گس رہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہوگیا۔اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔

اس کے بعد اس کے گھر میں کبھی انڈے نا تلے گئے۔پراٹھے نہ سکے اور سوئیٹر نہ بنے گئے۔دق نے جو ایک عرصے سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آ رہی تھی ایک ہی جست میں انھیں دبوچ لیا اور انہوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کے آغوش میں سونپ دیا۔

اور پھر اس سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی محلے کی بہو بیٹیاں چڑیں۔کفن کا سفید سفید لٹھا۔موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا۔تحمل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا۔بائیں ابرو پھڑک رہی تھی۔گالوں کے سنسان جھریاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں۔جیسے ان میں لاکھوں اژدہے پھنکار رہے ہوں۔

لٹھے کی کان نکال کر انھوں نے چوپرتا تہ کیا اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں۔آج ان

کے چہرے پر بھیانک سکون اوران ہرا بھرا اطمینان تھا۔ جیسے انھیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا سینتا نہ جائے۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں، بالیاں میناؤں کی طرح چہکنے لگیں۔

حمیدہ ماضی کو دور جھٹک کران کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹول پر......سفید گزی کا نشان! اس کی سرخی میں نا جانے کتنی معصوم دلہنوں کا سہاگ رچا ہے۔ اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر ابھری ہے اور پھر سب ایکدم خاموش ہو گئے بی اماں نے آخر ٹانکا بھر کے ڈورہ توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسوان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلی۔ اور وہ مسکرادی جیسے آج انہیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبریٰ کا سوہا جوڑا بن کر تیار ہو گیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھے گی۔

6.6 خلاصہ

''چوتھی کا جوڑا'' عصمت چغتائی کا معرکتہ الدراء افسانہ ہے۔ یہ متوسط طبقہ کی کہانی ہے۔ جہاں لڑکی کی شادی ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔ یہ ایک ایسے خاندان کی کہانی ہے جس کی سربراہ ''بی اماں'' ہیں جو اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اپنے خاندان کی کفالت کر رہی ہیں۔ ان کی دو جوان لڑکیاں ''کبریٰ'' اور ''حمیدہ'' ہیں۔ بی اماں کا سب سے بڑا مسئلہ کبریٰ کی شادی ہے۔ وہ خاموش طبیعت اور کم سخن ہے۔ اس کے والد کے انتقال کے بعد سے اس کے پیامات آنا بند ہو گئے تھے۔ بی اماں کی ساری امیدیں اس وقت جاگ اٹھتی ہیں جب ان کے بھائی کا لڑکا راحت پولس ٹریننگ سلسلے میں ان کے گھر قیام کرتا ہے۔ وہ بی اماں کی آخری امید ہے۔ وہ کسی طرح راحت کو کبریٰ سے شادی کرنے کے لئے رضامند کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنا زیور بیچ کر اپنا گھر ٹھیک ٹھاک کراتی اور راحت کے رہنے کا معقول انتظام کراتی ہیں۔ اس کی خوب خاطر تواضع کرتی ہیں حلانکہ خود روکھا سوکھا کھاتی ہیں لیکن اسے لذیذ اور اس کے پسندیدہ کھانے کھلاتی ہیں۔

بی اماں اور اس کی منہ بولی بہن یہ لئے کرتے ہیں کہ حمیدہ کو راحت سے چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق کرنے کے لئے مامور کیا جائے۔ ان کے خیال میں کرنے سے راحت کی دل بہلائی ہو گی اور وہ اپنا زیادہ

وقت گھر پر گذارے گا چنانچہ اب یہی ہوتا ہے راحت بار بار حمیدہ کو چھیڑتا ہے اور اسے بری نیت سے دیکھتا ہے ۔حمیدہ اپنی بڑی بہن کی خاطر یہ سب برداشت کرتی ہے ہر روز راحت کی دست درازی بڑھتی جاتی ہیں ۔ بی اماں اور اس کی منہ بولی بہن یہ سمجھ خوش ہوتے ہیں کہ اب بات بن گئی اور راحت کبریٰ شادی کرنے کے لئے راضی ہو جائے گا لیکن نہ تو راحت خود کچھ کہتا ہے اور نہ ہی اس کے گھر سے کبریٰ کے لئے کوئی پیغام آتا ہے۔

بی اماں اپنے پیروں کو توڑے رہن رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز کرتی ہے۔اس نیاز میں جو لڑکیاں آتی ہیں وہ کبریٰ کو

چھیڑتی ہیں ۔ کبریٰ مولوی صاحب کا دم کیا ہوا ملیدہ کو دیتی ہے وہ اسے راحت کو کھلائے ۔حمیدہ اس ملیدہ کو لے کر راحت کے کمرے میں جاتی ہے اور اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسے ملیدہ کا نوالہ بنا کر کھلاتی ہے اسی وقت ایک بھونچال آجاتا ہے اور وہ (حمیدہ) راحت کی ہوس کا شکار بن جاتی ہے۔راحت صبح کی گاڑی سے اپنے گھر لوٹ جاتا ہے کیوں کے اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی ۔ کبریٰ یہ صدمہ برداشت نہیں کرتی اور وہ ٹی۔بی کے مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے اور آخر کار وہ مرجاتی ہے۔بی اماں جو چوتھی کا جوڑا بنانے میں ماہر تھیں ان کے سامنے کفن کا لٹھا پھیل جاتا ہے۔

6.6 فرہنگ

الفاظ	معنی
سہ دری	تین دروازوں کا کمرہ، تین دروں والی دالان
جازم	چھپا ہوا یا بیل بوٹے دار کپڑا، چھپا ہوا فرش
منحنی	دُبلا، لاغر، نحیف، جھکا ہوا
سفید گزی	موٹا سوتی سفید کپڑا، کفن
چھوچھک	زچّہ خانے کی ایک رسم، بچہ پیدا ہونے کے چھ دن بعد کی رسم
بیونتنا	کپڑے کو کاٹنا، تراشنا، کفن سینا

بقچی	چھوٹا بستہ، کپڑوں کی چھوٹی گھٹری
بیونت	اندازہ، ناپ، کفایت شعاری کا طریقہ
لباجھپ	پُھرتی، تیزی، جھٹ پٹ
انگشتانے	انگوٹھے کے چھلّے
کیمیا گر	انجینئر، زرساز
مشاقی	مہارت، تجربہ
پریتم	معشوق، خاوند، دل بر

6.7 مشقی سوالات

مختصر سوالات

۱)۔افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' کا موضوع کیا ہے؟

۲)۔''چوتھی کا جوڑا'' کس تحریر کا کردہ افسانہ ہے؟

۳)۔بی اماں کی دلی خواہش کیا تھی؟

۴)۔راحت کا بی اماں سے کیا رشتہ تھا؟

۵)۔کس کی شادی اس افسانہ کا موضوع ہے؟

۶)۔بی اماں کے پورے گھر کی تباہی کا باعث کون بنتا ہے؟

۷)۔بی اماں کی لڑکیوں کا نام بتلایئے؟

۸) کس کے انکار کے بعد کبریٰ کے لئے رشتے آنا بند ہو گئے؟

۹)۔راحت کے ہوس کا شکار کون بنتی ہے؟

۱۰)۔بی اماں کس چیز میں ماہر تھی؟

تفصیلی سوالات

۱)۔افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' پر اظہار خیال کیجئے۔

۲)۔''چوتھی کا جوڑا'' افسانہ کا تنقیدی جائزہ لیجئے؟

۳)۔عصمت چغتائی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالئے؟

۴)۔اردو افسانہ میں عصمت کا مقام و مرتبہ متعین کیجئے۔

۵)۔ذیل کے کرداروں پر نوٹ لکھئے۔

۱)۔بی اماں

۲)۔راحت

۳)۔کبریٰ

۴)۔حمیدہ

6.9 مزید مطالعہ کے لیے کتب

1۔ ڈاکٹر جمیل اختر — عصمت چغتائی نقد کی کسوٹی پر

2۔ جگدیش چندر ودھان — عصمت چغتائی شخصیت اور فن

3۔ پروفیسر عبدالسلام — عصمت چغتائی اور نفسیاتی ناول

4۔ سعادت حسن منٹو — عصمت چغتائی

5۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ — عصمت چغتائی کا فن

6۔ آصف نواز — کلیات عصمت چغتائی

7۔ ڈاکٹر فرزانہ اسلم — عصمت چغتائی بحیثیت ناول نگار

8۔ ڈاکٹر صغیر افراہیم — اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل

9۔ ڈاکٹر صغیر افراہیم — اردو فکشن، تنقید اور تجزیہ

10۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ — اردو افسانہ روایت اور مسائل

11۔ پروفیسر قمر رئیس — نیا افسانہ مسائل اور میلانات

اکائی 7۔اپنے دُکھ مجھے دے دو

راجندر سنگھ بیدی

اکائی کے اجزاء

7.1 مقاصد

7.2 تمہید

7.3 موضوع کی وضاحت

7.4 خصوصیات

7.5 افسانہ نگار کا تعارف

7.6 خلاصہ

7.7 مشقی سوالات

7.8 فرہنگ

7.9 مزید مطالعہ کے لیے کتب

7.1 مقاصد

اس کی کائی کا مقصد افسانہ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کا مطالعہ کرنا اور اس کے افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری سے متعارف کرانا ہے۔اس اکائی کی تکمیل کے بعد آپ کو درج ذیل نکات سے واقفیت ہو جائے گی۔

۱)۔افسانہ اپنے دکھ مجھے دے دو میں کس واقعہ کو پیش کیا گیا ہے؟

۲)۔مشرقی روایات کی پاسدار خاتون ''اندو'' کی فطرت اور اس کے جذبہ ایثار و قربانی کی عکاس کس طرح کی گئی ہے؟

۳)۔اردو افسانہ نگاری میں راجندر سنگھ بیدی کا کیا مقام و مرتبہ ہے؟

7.2 مقصد

''اپنے دکھ مجھے دے دو''، راجندر سنگھ بیدی کا ایک اعلیٰ افسانہ ہے۔جس میں انھوں نے اندو کے ذریعہ ہندوستانی خاتون کی دردمندانہ فطرت اور جذبہء ایثار وقربانی کونہایت ہی اثر انداز میں پیش کیا ہے ۔محبت مروت جذبہ ایثار وقربانی،مشرق تہذیب ومعاشرت اور دوسروں کے دکھ درد بانٹ لینا وغیرہ امور کواس افسانہ اردو کا شہکار افسانہ ہے۔

راجندر سنگھ بیدی اردو کے مشہورمعروف افسانہ نگار ہیں ۔زندگی کے گہرے مشاہدے اور انسانی فطرت ونفسیات کے عمیق مطالعہ نے ان کے افسانوں میں فنی پختگی پیدا کردی ۔یہ افسانہ فنی قدرت ،ذہانت اور سماجی شعور کی وجہ سے ذہن و دل کو بہت متاثر کرتے ہیں ۔بیدی کے افسانوں میں فکر وتخیل اور حقیقت نگاری کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے ان کے افسانے معیار ہیں۔بعض ناقدین انہیں منٹو اور کرشن چندر پرفوقیت دیتے ہیں۔

7.3 موضوع کی وضاحت

اپنے دکھ مجھے دے دو : راجندر سنگھ بیدی

شادی کی رات بالکل وہ نہ ہو جو مدن نے سوچا تھا۔

جب چکلی بھابی نے پھُسلا کر مدن کو بیچ والے کمرے میں دھکیل دیا تو اندو سامنے شالوں میں لپٹی ہوئی اندھیرے کا بھاگ بنی جارہی تھی ۔باہر چکلی بھابھی ،دریاباد والی پھوپھی اور دوسرے عورتوں کی ہنسی ،رات کے خاموش پایوں میں مصری کی طرح دھیرے دھیرے گھل رہی تھی،عورتیں سب ہی سمجھتی تھیں،اتنا بڑا ہوجانے پر بھی مدن کچھ نہیں جانتا کیونکہ جب اسے بیچ رات کی نیند سے جگایا گیا تو وہ ہڑبڑا رہا تھا......''کہاں،کہاں لئے جارہی ہو مجھے؟''

ان عورتوں کے اپنے دن بیت چکے تھے۔پہلی رات کے بارے میں ان کے شریر شوہروں نے جو کچھ کہا اور مانا تھا اس کی گونج تک ان کے کانوں میں باقی نہ رہی تھی وہ خود رس بس چکی تھی اور اب اپنی ایک بہن کو

بسانے پر تُلی ہوئی تھیں۔ دھرتی کی یہ بیٹیاں مرد کو یوں سمجھتی تھیں جیسے بادل کا ٹکڑا ہو، جس کی طرف بارش کے لئے منھ اٹھا کر دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ نہ برسے تو منتیں مانگنی پڑتی ہیں، چڑھاوے چڑھانے پڑتے ہیں، جادو ٹونے کرنے پڑتے ہیں۔ حالانکہ مدن کالکا جی کی اس نئی آبادی میں گھر کے سامنے کھلی جگہ پر پڑا اسی وقت کا منتظر تھا۔ پھر شامت اعمال پڑوسی طبقے کی بھینس اس کی کھاٹ ہی کے پاس بندھی تھی جو بار بار پھنکارتی ہوئی مدن کو سونگھ لیتی اور وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے دور رکھنے کی کوشش کرتا...... ایسے میں بھلا نیند کا سوال ہی کہاں تھا؟

سمندر کی لہروں اور عورتوں کے خون کا راستہ بتانے والا چاند، ایک کھڑکی کے راستے اندر چلا آیا تھا، دروازے کے اس طرف کھڑا مدن اگلا قدم کہاں رکھتا؟ مدن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی اور اسے اپنے آپ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بجلی کا کھمبا ہے، جیسے کان لگانے سے اسے اندر کی سنسناہٹ سنائی دے جائے گی۔ کچھ دیر یوں ہی کھڑے رہنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر پلنگ کو کھینچ کر چاندنی میں کر دیا تاکہ دلہن کا چہرا تو دیکھ سکے۔ پھر وہ ٹھٹھک گیا جبھی اس نے سوچا...... اندو میری بیوی ہے کوئی پرائی عورت تو نہیں جسے نہ چھونے کا سبق بچپن ہی سے پڑھتا آیا ہوں۔ شالوں میں لپٹی ہوئی دلہن کو دیکھتے ہوئے اس نے فرض کر لیا، یہاں اندو کا منہ ہوگا اور جب ہاتھ بڑھا کو اس نے پاس پڑی گھڑی کو چھوا تو وہیں اندو کا منہ تھا۔ مدن نے سوچا کہ وہ آسانی سے اپنے آپ نہ دیکھنے دے گی، لیکن اندو نے ایسا کچھ نہ کیا، جیسے پچھلے کئی سالوں سے وہ بھی اسی لمحے کی منتظر ہو، اور کسی خیالی بھینس کو سونگھتے رہنے سے اسے بھی نیند نہ آ رہی ہو۔ غائب نیند اور بند آنکھوں کا کرب، اندھیرے کے باوجود سامنے پھڑ پھڑاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ٹھوری تک پہنچے ہوئے عام طور چہرا لمبوترا ہو جاتا ہے بس یہاں تو سبھی گول تھا۔ شاید اسی لئے چاندنی کا طرف گال اور ہونٹ کے بیچ ایک سایا دار کھوہ سی بنی ہوئی تھی، جیسے دور سے سبز اور شاداب ٹیلوں کے بیچ ہوتی ہے۔ ماتھا کچھ تنگ تھا، لیکن اس پر سے ایکا ایکی اٹھنے والے گھنگھریالے بال............

جبھی اندو نے اپنا چہرا چھڑا لیا۔ جیسے وہ دیکھنے کی اجازت تو دیتی ہو لیکن اتنی دیر کے لئے نہیں۔ آخر شرم کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ مدن نے ذرا سخت ہاتھوں سے یوں ہی ہوں ہاں کرتے ہوئے دلہن کا چہرا پھر سے اوپر کو اٹھا لیا اور شرابی کی سی آواز میں کہا............ ''اندو!''

اندو کچھ ڈرسی گئی۔ زندگی میں پہلی با کسی نے اس کا نام اس انداز میں پکارا تھااور وہ اجنبی کسی خدائی حق سے رات کے اندھیرے میں آہستہ آہستہ اس اکیلی بے یار و مددگار عورت کا اپنا ہوتا جارہا تھا۔ اندو نے پہلی بار ایک نظر اوپر دیکھتے ہوئے پھر آنکھیں بند کرلیں اور اتنا سا کہا......''جی''......اسے خود اپنی آواز سے پاتال سے آتی سنائی دی۔

دیر تک کچھ ایسا ہی ہوتا رہا پھر ہولے ہولے بات چل نکلی۔ اب سو چلی وہ چلی وہ تھمنے ہی میں نہ آتی تھی۔ اندو کے پتا، اندو کے بھائی، مدن کی بہن، باپ، ان کے ریلوے میل سروس کی نوکری، ان کے مزاج، کپڑوں کی پسند، کھانے کی عادت، سبھی کچھ کا جائزہ لیا جانے لگا۔ بیچ بیچ میں بات چیت توڑ کر کچھ اور ہی کرنا چاہتا تھا، لیکن اندو طرح دے جاتی تھی انتہائی مجبوری اور لاچاری میں مدن نے اپنی ماں کا ذکر چھیڑ دیا، جو اسے سات سال کی عمر میں چھوڑ کر دق کے عارضے چلتی بنی تھی''جتنی دیر زندہ رہی بے چاری''مدن نے کہا......''بابو جی کے ہاتھ میں دوا کی شیشیاں ہی رہی۔ ہم اسپتال کی سیڑھیوں پر اور چھوٹا پاشی گھر میں چیونٹیوں کے بل پر سوتے رہے اور آخر ایک دن ....۲۸ مارچ کی شام ....''مدن چپ ہوگیا۔ چند ہی لمحوں میں رونے سے ذرا ادھر گھگھی سے ذرا ادھر سے پہنچ گیا۔ اندو نے گھبرا کر مدن کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اس رونے نے پل بھر میں اندو اندو کو بھی اپنے پن سے ادھر اور بیگانے پن سے ادھر پہنچا دیا تھا......مدن اندو کے بارے میں کچھ اور بھی جاننا چاہتا تھا لیکن اندو نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور کہا''میں تو پڑی لکھی نہیں ہوں جی ۔ پر میں نے ماں باپ دیکھے ہیں، بھائی اور بھابھیاں دیکھی ہیں، بیسیوں اور لوگ دیکھے ہیں۔ اس لئے میں کچھ سمجھتی بوجھتی ہوں......میں اب تمھاری ہوں۔ اپنے بدلے میں تم سے ایک چیز مانگتی ہوں۔''

روتے وقت اور اس کے بعد بھی ایک نشہ سا تھا۔ مدن نے کچھ بے صبری اور کچھ دیا دلی کے ملے جلے شبدوں میں کہا:

''کیا مانگتی ہو؟ تم جو بھی کہوگی میں دوں گا۔''

''پکی بات؟''اند بولی۔

مدن کچھ اُتاولے ہوکر کہا......''ہاں، ہاں......کہا جو پکی بات۔''

لیکن اس بیچ میں مدن کے من میں ایک وسوسہ آیا......میرا کاروبار پہلے ہی مندا ہے اگر اندو کوئی ایسی چیز مانگ لے جو میری پہنچ ہی سے باہر ہو تو پھر کیا ہوگا؟

لیکن اندو نے مدن کے سخت اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ملائم ہاتھ میں سمیٹ لیتے اوران پر اپنے گال ہاتھ رکھے ہوئے کہا............

''تم اپنے دکھ مجھے دے دو۔''

مدن سخت حیران ہوا۔ساتھ ہی اسے اپنے آپ پر ایک بوجھ بھی اترتا ہوا محسوس ہوا۔اس نے پھر چاندنی میں ایک بار اندو کا چہرا دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ جان پایا۔اس نے سوچا۔یہ ماں یا کسی سہیلی کا کارتا ہوا فقرہ ہوگیا جو اندو نے کہہ دیا۔جبھی ایک جلتا ہوا آنسو مدن کے ہاتھ کی پشت پر گرا۔اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹتے ہوئے کہا......''دیئے''لیکن ان سب باتوں نے سے اس کی بہمیت چھین لی تھی۔

مہمان ایک ایک کر کے سب رخصت ہوئے۔چکلی بھابھی دو بچوں کو انگلیوں سے لگائے سیڑھیوں کے اونچ نیچ سے تیسرا پیٹ سنبھالتی ہوئی چل دی۔دیا بادوالی پھوپھی جو اپنے''نو لکھے ہور''کے گم ہو جانے پر شور مچاتی،واویلا کرتی ہوئی بے ہوش ہوگئی تھی اور غسل خانے میں پڑا مل گیا،جہیز میں سے اپنے حصے کے تین کپڑے لے کر چلی گئی۔پھر چاچا گئے جن کو ان کے جے۔پی ہونے کی کبر تار کے ذریعے سے مل گئی تھی جو شاید بدھواسی میں مدن کی بجائے دلہن کا منہ چومنے چلے تھے......

گھر میں بوڑھا باپ رہ گیا تھا اور چھوٹے بہن بھائی اور چھوٹی دلاری تو ہر وقت بھابھی ہی کے بغل میں گھسی رہتی۔گلی محلے کی کون سی عورت دیکھے یا نہ دیکھے،اور دیکھے تو کتنی دیر دیکھے،یہ سب اس کے اختیار میں تھا۔آخر کار یہ سب ختم ہوا اندو آہستہ آہستہ پرانی ہونے لگی۔کالکاجی کی اس نئی آبادی کے لوگ آج بھی آتے جاتے مدن کے سامنے رک جاتے اور کسی بھی بہانے اندر چلے آتے۔اندو انھیں دیکھتے ہی گھونگھٹ کھینچ لیتی ،لیکن اس چھوٹے سے وقفے میں انہیں جو کچھ دکھائی دے جاتا وہ بنا گھونگھٹ کے دھئی نہ دے سکتا تھا۔

مدن کا کاروبار گندے بروزے کا تھا۔کہیں بڑی سپلائی والے دو تین جنگلوں میں چیز اور دیوار کے پیڑوں کو جنگل کی آگ نے آلیا تھا اور ڈھڑ دھڑ جلتے ہوئے خاک سیاہ ہوکر رہ گئے تھے۔میسوار اور آسام کی

طرف سے منگوایا ہوا بروزہ مہنگا پڑتا تھا اور لوگ اسے مہنگے دواموں پر خریدنے پر تیار نہ تھے ایک تو آمدنی کم ہوگئی تھی۔اس پر مدن جلدی ہی دکان اور اس کے ساتھ والا دفتر بند کر کے گھر چلا جاتا آتا......گھر پہنچ کر اس کی ساری کوشش یہی ہوتی کہ سب کھائیں پیئں اور اپنے اپنے بستروں میں دبک جائیں جبھی وہ کھاتے وقت تھالیاں اٹھا اٹھا کر باپ اور بہن کے سامنے رکھتا اور ان کے کھا چکنے کے بعد برتنوں کو سمیٹ کرنل کے نیچے رکھ دیتا۔سب سمجھتے بہو...... بھابھی نے مدن کے کان میں کچھ پھونکا ہے اور آج وہ گھر کے کام کاج میں دلچسپی لینے لگا ہے۔مدن سب سے بڑا تھا۔کندن اس سے چھوٹا تھا اور پاشی سب سے چھوٹا تھا۔جب کندن بھابھی کے سو اگت میں سب کے ایک ساتھ کھانے پر اصرار کرتا تو باپ دھنی رام وہیں ڈانٹ دیتا......''کھاؤ تم''......وہ کہتا......''وہ بھی کھالیں گے۔''اور پھر رسوئی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا اور جب بہو کھانے پینے سے فارغ ہو جاتی اور برتنوں کی طرف متوجہ ہوتی ،تو بابو دھنی رام،اسے روکتے ہوئے کہتے......''رہنے دو بہو برتن صبح صاف ہو جائیں گے۔''اندو کہتی......''نہیں بابو جی''میں کیے دیتی ہوں ، چھپا کے سے۔'' تب بابو دھنی رام ایک لرزتی ہوئی آواز سے کہتے......''مدن کی ماں ہوتی بہو تو یہ سب تمہیں کرنے دیتی ؟''......اور اندو ایک دم اپنے ہاتھ روک لیتی۔

چھوٹا پاشی بھابھی سے شرماتا تھا۔اس خیال سے کہ دلہن کی گود جھٹ سے ہری ہو،چکلی بھابھی اور دریا بادوالی پھوپھی نے ایک رسم میں پاشی ہی کو اندو کی گود مین دالا تھا۔جب سے اندو اسے نہ دیور بلکہ اپنا بچہ سمجھنے لگی تھی۔جب سے وہ پیار سے پاشی کو اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کرتی تو وہ گھبرا اٹھتا،اور اپنا آپ چھڑا کر دو ہاتھ کی دوری پر کھڑا ہو جاتا، دیکھتا اور ہنستا،پاس نہ آتا نہ دور ہٹتا،ایک عجیب اتفاق ہے،ایسے میں بابو جی ہمیشہ وہیں موجود ہوتے اور پاشی کو ڈانٹتے ہوئے کہتے......''ارے جانا...... بھابھی پیار کرتی ہے،ابھی سے مرد ہو گیا ہے تو......؟''اور دلاری تو پیچھا ہی نہ چھوڑتی۔اس کے......''میں تو بھابھی کے ساتھ ہی سوؤں گی۔''کے اصرار نے بابو جی کے اندر کوئی جنار دھن جگا دیا تھا۔ایک رات اسی بات پر دلاری کو زور سے چپٹ پڑی اور وہ گھر کی آدھی پکّی آدھی کچی نالی میں جا گری۔اندو نے لپکتے ہوئے پکڑا تو سر پر سے ڈوپٹہ اڑ گیا۔بالوں کے پھول اور چڑیاں،مانگ کر سیندور،کانوں کے کرن پھول سب ننگے ہو گئے۔''بابو جی!......اندو نے

سانس کھینچتے ہوئے کہا......ایک ساتھ دلاری کو پکڑنے اوراوڑھنے میں اندو کے پسینے چھوٹ گئے۔اس بے ماں کی بچی کو چھاتی سے لگاتے ہوئے اندو نے اسے ایک بستر میں سلا دیا جہاں سرہانے ہی سرہانے تکئے ہی تکئے تھے۔نہ کہیں پائیتی تھی نہ کاٹھ کے بازو۔چوٹ تو ایک طرف،کہیں کوئی چبھنے والی چیز بھی نہ تھی۔پھر اندو کی انگلیاں دلاری کے پھوڑے ایسے سر پر چلتی اسے دکھا بھی رہی تھی،اور مزا بھی دے رہی تھیں دلاری کے گالوں پر بڑے بڑے اور پیارے گڑھے پڑ رہے ہیں۔ تیرے گالوں پر......!منی نے منّی ہی کی طرح کہا......''گڑھے تمھارے بھی تو پڑتے ہیں بھابھی۔''

''ہاں مُنو!''اندو نے کہااور ایک ٹھنڈا سانس لیا۔

مدن کو سی بات پر غصہ تھا۔وہ پاس ہی کھڑا سب کچھ سن رہا تھا بولا......''میں تو کہتا ہوں ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔''

''کیوں،اچھا کیوں؟''اندو نے پوچھا۔

''ہاں۔نہ اُگے بانس نہ بجے بانسری......ساس نہ ہو تو کوئی جھگڑا ہی نہیں رہتا۔''

اندو نے ایکا یکی خفا ہوتے ہوئے کہا......''تم جاؤ جی سو رہو جا کے،بڑے آئے ہو......آدمی جیتا ہے تو لڑتا ہے نا؟مرگھٹ کی چپ چاپ سے جھگڑے بھلے۔جاؤنا،رسوائی میں تمہارا کیا کام ہے؟''

مدن کھسیانا ہو کر رہ گیا۔بابو دھنی رام کی ڈانٹ سے باقی بچّے تو پہلے ہی اپنے بستروں یوں جا پڑے تھے جیسے ڈاک گھر میں چھٹیاں سارٹ ہوئی ہیں لیکن مدن وہیں کھڑا رہا۔احتیاج نے اسے ڈھیٹ اور بے شرم بنا دیا تھا اس وقت جب اندو نے بھی اسے ڈانٹ دیا تو وہ روہانسا ہو کر اندر چلا گیا۔

دیر تک مدن بستر میں پڑا کسمساتا رہا لیکن بابو جی کے خیال سے اندو کو آواز دینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔اس کی بے صبری کی حد ہوگئی جب منی کو سلانے کے لئے اندو کو لوری سنائی دی......''تو آنندیارانی، بورائی مستانی......''

............وہی لوری جو دلاری منی کو سلا رہی تھی۔مدن کی نیند بھگا رہی تھی۔اپنے آپ سے بیزار ہو کر اس نے زور سے چادر کھینچ لی۔سفید چادر کے سر پر لینے اور سانس بند کر لینے سے خوامخواہ ایک مردے کا تصّور

پیدا ہو گیا۔ مدن کو یوں لگا جیسے وہ مر چکا ہے اور اس کی دلہن اندو اسکے پاس بیٹھی زور زور سے سر پیٹ رہی ہے، دیوار کے ساتھ کلائیاں مار مار کے چوڑیاں توڑ رہی ہے، روتی چلّاتی رسوئی میں جاتی ہے گئی۔ ''اب اسے دوپٹے کی پروانہیں قمیص کی پروانہیں، مانگ کا سیندور، بالوں کے پھول اور چوڑیاں سب ننگے ہو چکے ہیں، جذبات اور خیالات کے طوطے تک اُڑ چکے ہیں۔

مدن کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسوں بہہ رہے تھے حلانکہ رسوئی میں اندو ہنس رہی تھیں۔ پل بھر میں اپنے سہاگ کے اجڑنے اور پھر بس جانے سے بے خبر۔ مدن جب حقائق کی دنیا میں واپس آیا تو آنسو پانچھتے ہوئے اپنے اس رونے پر ہنسنے لگا......ادھر اندو ہنس تو رہی تھی لیکن اس کی ہنسی دبی دبی تھی۔ بابو جی کے خیال سے کبھی اونچی آواز میں نہ ہنستی تھی، جیسے کھلکھلاہٹ کوئی ننگا پن ہے، خاموشی، ڈوپٹہ اور دبی دبی ہنسی۔ ایک گھونگھٹ۔ پھر مدن نے اندو کا ایک خیالی بُت بنایا اور اس سے بیسوں باتیں کر ڈالیں۔ یوں اسے پیار کیا جیسے ابھی تک نہ کیا تھا......وہ پھر اپنی دنیا میں لوٹا جس سے ساتھ کا بستر خالی تھا۔ اس نے ہولے سے آواز دی...... ''اندو'' ......اور پھر چُپ ہو گیا۔ اس ادھیڑ بن میں وہ بورائی مستانی نندیا اس سے بھی لپٹ گئی۔ ایک اونگھ ہی آئی تھی لیکن ساتھ ہی یوں لگا جیسے شادی کی رات والی پڑوسی سبطے کی بھینس منھ کے پاس پھنکار نے لگی ہے۔ وہ ایک بے کلی کے عالم میں اُٹھا، پھر رسوائی کی طرف دیکھتے سر کھجاتے دو تین جمائیاں لے لیٹ گیا......سو گیا۔

مدن جیسے کانوں کو کوئی سندیسہ دے کر سویا تھا۔ جب اندو کی چوڑیاں بستر کی سلوٹیں درست کرنے کے لئے کھنک اٹھیں تو وہ بھی ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ یوں ایک دم جاگنے مین محبت کا جذبہ اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ پیار کی کروٹوں کو توڑے بغیر آدمی سو جائے اور ایکا ایکی اٹھے تو محبت دم توڑ دیتی ہے۔ مدن کا سارا بدن اندر کی آگ میں پھنک رہا تھا اور یہی اس کے غصے کا کارن بن گیا جب اس نے کچھ بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''سو تم............آ گئیں؟''

''ہاں!''

''منّی............سو مر گئی؟''

اندو جھکی جھکی ایک دم سیدھی کھڑی ہوگئی ....''ہائے رام!''اس نے ناک پر انگلی رکھتے ،ہاتھ ملتے ہوئے کہا.....''کیا کہہ رہے ہو؟............مرے کیوں بیچاری؟......ماں باپ کی ایک بیٹی ہے''

''ہاں!............''مدن نے کہا............بھابھی کی ایک ہی نند۔''اور پھر ایک دم تحکمانہ لہجہ اختیار کر تے ہوئے بالا............''زیادہ منھ مت لگاؤ اس چڑیل کو''۔

''کیوں،اس میں کیا پاپ ہے؟''

''یہی پاپ ہے۔''مدن نے اور چڑتے ہوئے کہا............''پیچھا ہی نہیں چھوڑ تی تمہارا۔جب دیکھو، جونک کی طرح چمٹی ہوئی ہے،وفان ہی نہیں ہوتی۔''

''ہاں ....''اندو نے مدن کی چار پائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔بہنوں اور بیٹیون کو یوں تو دھتکارنا نہیں چاہیے۔بے چاری دو دن کی مہمان آج نہیں تو کل،کل نہیں تو پرسوں،ایک دن چل ہی دے گی۔''اس کے بعد اندو کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ چُپ ہوگئی۔اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں،باپ، بھائی،بہن، چچا،تا یا سبھی گھوم گئے۔کبھی ہو بھی ان کی دلاری تھی جو پلک جھپکتے ہی نیاری ہوگئی اور پھر ایک دن رات اس کے نکالے جانے کی باتیں ہونے لگیں جیسے گھر میں کوئی بڑی سی ہابنی جس میں کوئی ناگن رہتی ہے اور جب تک وہ پکڑ کر پھنگوائی نہیں جاتی گھر کی لاگ آرام کی نیند نہیں سو سکتے۔دور سے کیلنے والے نتھن کرنے والے،دانت پھوڑ نے والے ماندری بُلائے گئے،بڑے بڑے دھنونتری اور موتی ساگر............آخر ایک دن اتّر پچھّم کی طرف سے لال آندھی آئی جو صاف ہوئی تو ایک لاری کھڑی تھی جس میں گوٹے کنارے میں لپٹی ہوئی ایک دلہن بیٹھی تھی، پیچھے گھر میں ایک سر پر بجتی ہوئی شہنائی بین کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔پھر ایک دھچکے کے ساتھ لاری چل دی............

مدن نے کچھ برافروختگی کے عالم میں کہا............''تم عورتیں بڑی چالاک ہوتی ہو۔ابھی کل ہی اس گھر مین آئی ہو اور یہاں کے سب لوگ تمہیں ہم سے زیادہ پیارے لگنے لگے۔؟''

''ہاں!''اندو نے اثبات سے کہا۔

''یہ سب جھوٹ ہے......یہ ہو ہی نہیں سکتا۔''

''تمہارے مطلب ہے میں..........''

''دکھوا ہے یہ سب.......... ہاں!''

''اچھا جی؟'' اندو نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا.........''یہ سب دکھاوا ہے میرا؟'' اور اندو اٹھ کر اپنے بستر پر چلی گئی اور سرہانے میں منھ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ مدن اسے منانے ہی والا تھا کہ اندو خود ہی اٹھ کر اس کے پاس آ گئی اور سختی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی..........''تم جو ہر وقت جلی کٹی کہتے ہو.......... ہوا کیا ہے تمہیں..........؟''

شوہرانہ رعب کے لئے مدن کے ہاتھ بہانے آ گیا..........''جاؤ جاؤ..........''سو جاؤ جا کے''.......... مدن نے کہا..........''مجھے تم سے کچھ نہیں لینا۔''

''تمہیں کچھ نہیں لینا، مجھے تو لینا ہے۔'' اندو بولی ''بھر لینا ہے۔'' اور وہ چھینا جھپٹی کرنا لگی۔ مدن اسے دھتکارتا تھا اور وہ لپٹ جاتی تھی۔ وہ اس طرح مچھلی کی طرح تھی جو بہاؤ میں بہہ جانے کی بجائے آبشار کے تیز دھارے کو کاٹتی ہوئی اوپر ہی اوپر پہنچنا چاہتی ہے۔ چٹکیاں لیتی، ہاتھ پکڑتی، روتی ہنستی وہ کہہ رہی تھی......

''پھر مجھے پھاپھا کٹنی کہو گے؟''

''وہ تو سبھی عورتیں ہوتی ہیں۔''

''ٹھہرو.......... تمہارے تو..........'' یوں معلوم ہوا جیسے اندو کوئی گالی دینے والی ہو۔ اور اس نے منھ میں کچھ منمنایا بھی، مدن نے مڑتے ہوئے کہا..........''کیا کہا؟'' اور اندو نے اب کے سنائی دینے والی آواز میں دہرایا۔

مدن کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اگلے ہی لمحے اندو مدن کے بازوؤں میں تھی اور کہہ رہی تھی..........

''تم مرد لوگ کیا جانو؟...... جس سے پیار ہوتا ہے اس کے سبھی چھوٹے بڑے پیار معلوم ہوتے ہیں۔ کیا باپ، کیا بھائی، کیا بہن'' .... اور پھر ایکا ایکی دور دیکھتی ہوئی بولی..........

''میں تو دلاری منّی کا بیاہ کروں گی۔''

''حد ہو گئی۔'' مدن نے کہا.....''ابھی ایک ہاتھ کی ہوئی نہیں اور بیاہ کی بھی سوچنے لگیں؟''

''تمہیں ایک ہاتھ کی دکھتی ہت نا؟'' اندو بولی اور پھر اپنے دونوں ہاتھ مدن کی آنکھوں پر رکھتی ہوئی کہنے لگی ....''ذرا آنکھیں بند کو اور پھر کھولو ....'' مدن نیسچ مچ ہی آنکھیں بند کر لیں تو اندو بولی ....''اب کھولو بھی، اتنی دیر میں تو میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔'' جبھی مدن نے آنکھیں کھولیں۔ لمحہ بھر کے لئے اسے یوں لگا جیسے سامنے اندو نہیں، کوئی اوڑھی ہے۔ وہ کھوسا گیا۔

''میں تو ابھی سے چار سوٹ اور کچھ برتن الگ کر ڈالے ہیں اس کے لئے۔'' اندو نے کہا اور جب مدن نے کوئی جواب نہ دیا تو اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی......''تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟...... یاد نہیں اپنا وچن؟......تم اپنے دکھ مجھے دے چکے ہو۔''

''ایں؟'' مدن نے چونکتے ہوئے کہا اور جیسے بے فکر سا ہو گیا لیکن اب جب اس نے اندو کو اپنے لپٹا یا تو وہ ایک جسم ہی نہیں رہ گیا تھا، ساتھ ساتھ ایک ردھ بھی شامل ہو گئی تھی۔

مدن کے لئے اندو روح ہی روح تھی۔ اندو کے جسم بھی تھا لیکن وہ ہمیشہ کسی کسی وجہ سے مدن کے نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ اک پردہ تھا۔ خواب کے تاروں سے بنا ہوا، آہوں کے دھوئیں سے رنگین قہقہوں کی زرتاری سے چکا چوند، جو ہر وقت اندو کو ڈھانپے رہتا تھا۔ مدن کی نگاہوں اور اس کی ہاتھوں کے دوشاشن صدیوں سے اسے دوپدی کا چیر ہرن کرتے آئے تھے جو کہ عرف عام میں بیوی کہلاتی ہے۔ لیکن ہمیشہ اسے آسمانوں سے تھانوں کے تھان، گزوں کے گز کپڑا ننگا پن ڈھانپنے کے لئے ننگا ملتا آیا تھا۔ دوشاشن تھک ہار کے یہاں وہاں گر پڑے تھے لیکن دوپدی وہیں کھڑی تھی۔ عزّت اور پاکیزگی کی سفید ساری میں ملبوس وہ دیوی لگ رہی تھی اور......

......مدن کے لوٹتے ہوئے ہاتھ خجالت کے پسینے سے تر ہوئے۔ جنھیں سکھانے کے لئے وہ انھیں اوپر ہوا میں بٹھا دیتا ہے اور پھر ہاتھ کے پنجوں کو پورے طور پر پھیلاتا ہوا ایک تشنجی کیفیت میں اپنی انکھوں کی پھٹتی ہوئی، پتلیوں کے سامنے رکھ دیتا اور پھر انگلیوں کے بیچ سے جھانکتا......اندو کا مرمریں جسم، خوش رنگ اور گداز سامنے پڑا ہوتا۔ استعمال کے لئے پاس، ابتذل کے دور......کبھی اندو کی نا کہ بندی ہو جاتی تو اس قسم کے فقرے ہوتے......

''ہائے جی! گھر میں چھوٹے بڑے سبھی ہیں، وہ کیا کہیں گے؟''

''مدن کہتا...... چھوٹے سمجھتے نہیں، بڑے سمجھ جاتے ہیں......''

اسی دوران میں بابودھنی رام کی تبدیلی سہارن پور ہوگئی۔ وہاں ریلوے میل سروس سلیکشن گریڈ کے ہیڈکلرک ہوگئے۔ اتنا بڑا کوارٹر ملا کہ اس میں آٹھ کنُبے رہ سکتے تھے لیکن بابودھنی رام اس میں اکیلے ہی ٹانگے پھیلائے پڑے رہتے۔ زندگی بھر وہ بال بچوں سے کبھی علیٰحدہ نہیں ہوئے تھے۔ سخت گھریلو قسم کے آدمی، آخری زندگی میں اس تنہائی نے ان کے دل میں دہشت پیدا کردی لیکن مجبوری تھی۔ بچے سب دلّی میں مدن اور اندو کے پاس تھے اور وہیں اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ سال کے خاتمے سے پہلے ہی انھیں بیچ میں اٹھانا ان کی پڑھائی کے لئے اچھا نہ تھا بابو جی کو دل کے دورے پڑنے لگے۔

بارے میں گرمی کی چھٹیاں ہوئی اور ان کے بار بار لکھنے پر مدن نے اندو کو کندن، پاشی اور دلاری کے ساتھ سہارن پور بھیج دیا۔ دھنی رام کی دنیا چہک اٹھی۔ کہاں ان ھیں دفتر کے کام کے بعد فرصت ہی فرصت تھی اور کہاں اب کام ہی کام تھا بچے بچّوں ہی کی طرح، جہاں کپڑے اتارتے وہیں پڑے رہنے دیتے اور بابو جی انھیں سمیٹتے پھرتے، اپنے مدن سے دور، السیائی ہوئی رتی، اندو تو اپنے پہناوے تک سے غافل ہوگئی تھی...... وہ یوں پھرتی تھی جیسے کانجی ہوؤس میں گائے باہر کی طرف منھ اٹھا اٹھا کر اپنے مالک کو ڈھونڈا کرتی ہے۔ کام دھام کرنے بعد وہ کبھی اندر ٹرنکوں پر لیٹ جاتی۔ کبھی باہر کنیر کے بوٹے کے پاس اور کبھی آم کے پیڑ کے تلے جو آنگن میں سیکڑوں ہزاروں دلوں کو تھامے کھڑا تھا۔

ساون بھادوں میں ڈھلنے لگا۔ آنگن میں سے باہر کا دریچہ کھُلتا تو کنواریاں، نئی بیاہی ہوئی لڑکیاں پینگ بڑھاتے ہوئے گاتیں...... ''جھولا کن میں ڈارو ایا مریاں'' اور پھر گیت کے بول کے مطابق دو جھولتیں اور دو جھلاتیں۔ اور کہیں چار مل جاتیں تو بھول بھلیاں ہوجاتیں...... ادھیڑ عمر کی اور بوڑھی عورتیں ایک طرف کھڑی تکا کرتیں۔ اندو کو معلوم ہوتا جیسے وہ کبھی ان میں شامل ہوگئی ہے جبھی وہ منھ پھیر لیتی ہے اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی سو جاتی۔ بابو جی پاس سے گذرتے تو اسے جگاتے اور اٹھانے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتے بلکہ موقع پا کر اس کی شلوار جو بہو دھوتی سے بدل آتی اور جسے ہمیشہ وہ اپنی ساس والے پرانے صندل

کے صندوق پر پھینک دیتی، اٹھا کر کھونٹی پر لٹکا دیتے ۔ ایسے میں انھیں سب سے نظریں بچانا پڑتیں ،لیکن ابھی شلوار کو سمیٹ کر مڑتے تو نگاہ نیچے کونے بہو کے مُکھ پر پڑتی تب ان کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ یوں شتابی کمرے سے نکل بھاگتے جیسے کہیں سانپ کا بچہ بل سے باہر آ گیا ہو۔ پھر برآمدے میں ان کی آواز سنائی دینے لگتی......''اوم نمو بھگوتے واسودیوا............''

اڑوس پڑوس کی عورتوں نے بابو جی کی بہو کی خوبصورتی کی داستانیں دور دور تک پہنچادی تھیں ۔ جب کوئی عورت بابو جی کے سامنے بہو کے پیارے پن اور سڈول جسم کی باتیں کرتی تو وہ خوشی سے پھول جاتے اور کہتے ......''ہم تو دھنیہ ہو گئے امی چند کی ماں ۔شکر ہے ہمارے گھر میں بھی کوئی صحت والا جیو آیا۔''اور یہ کہتے ہوئے ان کی نگاہیں کہیں دور پہنچ جاتیں جہاں دق کے عارضے تھے۔ دوائی کی شیشیاں، اسپتال کی سیڑھیاں یا چیونٹیوں کی بل ۔ نگاہ قریب آتی تو انھیں موٹے موٹے گدرائے جسم والے کئی بچے بغل میں، جانگھ پر، گردن پر چڑھتے اترتے محسوس ہوتے ایسا معلوم ہوتے ایسا معلوم ہوتا جیسے ابھی اور آرہے ہیں۔ پہلو پر لیٹی ہوئی بہو کی کمر زمین کے ساتھ اور کولھے چھت کے ساتھ لگ رہے ہیں اور وہ دھڑا دھڑ بچے جنتی جارہی ہے او ر ان بچوں کی عمر میں کوئی فرق نہیں ۔ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا ،سبھی ایک سے جڑواں ہے......توام......اوم نمو بھگوتے............

آس پاس کے سب لوگ جان گئے تھے اندو بابو جی کی چہتی بہو ہے۔ چنانچہ دودھ اور چھاچھ کے مٹکے دھنی رام کے گھر آنے لگے اور پھر ایک دن سلام دین گوجر نے فرمائش کردی۔ اندو سے کہا......''بی بی! میرا بیٹا آر۔ایم ۔ایس میں قلی رکھوا دو، اللہ تم کو اجر دے گا''......اندو کے اشارے کی دیر تھی کہ سلام دین کا بیٹا نوکر ہو گیا، اور بھی سارٹر۔ جو نہ ہو سکا اس کی قسمت، آسامیاں ہی زیادہ نہ تھیں۔

بہو کے کھانے پینے اور اس کی صحت کا بابو جی خاص خیال رکھتے تھے۔ دودھ پینے سے اندو چڑھتی تھی ۔ وہ رات کے وقت خود دودھ کو باٹی میں پھینٹ کر، گلاس میں ڈال کر بہو کو پلانے کے لئے اس کی کھٹیا کے پاس جاتے۔ اندو اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے اٹھتی اور کہتی......

''نہیں بابو جی! مجھ سے نہیں پیا جاتا۔''

''تیرا تو سسُر بھی پیے گا۔'' وہ مذاق سے کہتے۔

''تو پھر آپ پی لیجئے نا۔'' اندو ہنستی ہوئی جواب دیتی اور بابو جی مصنوعی غصے سے برس پڑتے ......''تو چاہتی ہے کہ بعد میں تیری بھی وہی حالت ہو جو تیری ساس کی ہوئی؟''

''ہوں......ہوں......'' اندو لاڈ سے روٹھنے لگتی۔ آخر کیوں نہ روٹھتی۔ وہ لوگ نہیں روٹھتے جنھیں منانے والا کوئی نہ ہو۔ لیکن یہاں تو منانے والے سب تھے، روٹھنے والا صرف ایک۔ جب اندو بابو جی کے ہاتھ سے گلاس نہ لیتی تو وہ اسے کھٹیا کے پاس سرہانے کے نیچے رکھ دیتے ......''اور لے، یہ پڑا ہے......تیری مرضی ہے پی......نہیں مرضی تو نہ پی۔'' کہتے ہوئے چل دیتے۔

اپنے بستر پر پہنچ کر دھنی رام، دلاری مّنی کے ساتھ کھیلنے لگتے۔ دلاری کی بابو جی کے ننگے پنڈے کے ساتھ پنڈا گھسانے اور پیٹ پر منھ رکھ کر پھٹکڑا پھیلانے کی عادت تھی۔ آج جب بابو جی اور مُنّی یہ کھیل کھیل رہے تھے، ہنس ہنسا رہے تھے تو منی نے بھابھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا......''دودھ تو خراب ہو جائے گا بابو جی...... بھابھی تو پیتی ہی نہیں۔''

''پیے گی، بیٹا ضرور پیے گی بیٹا!......'' بابو جی نے دوسرے ہاتھ سے پاشی کو لپٹاتے ہوئے کہا......''عورتیں گھر کی کسی چیز کو خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتیں۔'' ابھی یہ فقرہ بابو جی کے منھ ہی میں ہوتا کہ ایک طرف سے ''ہش...... ہے خصم کھانی'' کی آواز آنے لگتی۔ پتہ چلتا، بہو بلّی کو بھگا رہی ہے......اور پھر کوئی غٹ غٹ سی سنائی دیتی اور سب جان لیتے بہو...... بھابھی نے دودھ پی لیا۔ کچھ دیر بعد کندن، بابو جی کے پاس آتا اور کہتا......

''بابو جی...... بھابھی رو رہی ہے۔''

''ہائیں؟'' بابو جی کہتے اور پھر اندھیرے میں اس طرف دیکھنے لگتے جدھر بہو کی چارپائی پڑی ہوتی۔ کچھ دیر یوں ہی بیٹھے ہونے کے بعد وہ پھر لیٹ جاتے اور کچھ سمجھتے ہوئے کہتے ......''جا تو سو جا......وہ بھی سو جائے گی اپنے آپ......''

اور پھر سے لیٹتے ہوئے بابو دھنی رام آسمان پر کھلے ہوئے پرماتما کے گلزار کو دیکھنے لگتے اور اپنے من

کے بھگوان سے پوچھتے ...... ''چاندنی کے ان کھلتے بند ہوتے ہوئے پھولوں میں میرا پھول کہاں ہے؟'' اور پھر پورا آسمان انھیں درد کا ایک دریا دکھائی دینے لگتا اور کانوں میں ایک مسلسل ہاؤں کی آواز سنائی دیتی جسے سنتے ہوئے وہ کہتے ...... جب سے دنیا بنی ہے انسان کتنا رویا ہے!'' ......اور وہ روتے روتے سوجاتا ہے۔

اندو کے جانے کے بیس پچاس روز ہی میں مسن نے واویلا شروع کردیا۔اس نے لکھا۔ میں بازار کی روٹیاں کھاتے کھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ مجھے قبض ہوگئی ہے۔گردے کا درد شروع ہوگیا ہے۔ پھر جیسے دفتر کے لوگ چھٹّی کی عرضی کے ساتھ ڈاکٹر کا سرٹیفیکٹ بھیج دیتے ہیں، مدن نے بابو جی کے ایک دوست تصدیق کی ہوئی چھٹی لکھوا بھیجی۔اس پر بھی جب کچھ نہ ہوا تو ایک ڈبل تار...... جوابی۔

جوابی تار کے پیسے مارے گئے،لیکن بلا سے۔اندو اور بچے لوٹ آئے تھے مدن نے اندو سے سیدھے مُنھ بات ہی نہ کی۔ یہ دیکھ بھی اندو ہی کا تھا۔ایک دن مدن کو اکیلے میں پاکر وہ پکڑ بیٹھی اور بولی...... ''اتنا منھ پھیلائے بیٹھے ہو، میں نے کیا کیا ہے؟

مدن نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا...... ''چھوڑ...... دور ہو جا میری آنکھوں سے کمینی......''

''یہی کہنے کے لئے اتنی دور سے بُلوایا ہے؟''

''ہاں!''

''ہٹاؤ اب۔''

''خبردار...... یہ سب تمھارا کیا دھرا ہے۔تم جو آنا چاہتی تو بابو جی روک لیتے ؟''

اندو بے بسی سے کہا...... ''ہائے جی ......تم تو بچّوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میں بھلا انھیں کیسے کہہ سکتی تھی؟ سچ پوچھو تو تم نے مجھے بُلوا کر بابو جی پر بڑا ظلم کیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب کچھ نہیں ......ان کا جی بہت لگا ہوا تھا بال بچّوں میں۔''

''اور میرا جی......؟''

''تمھارا جی......؟ تم تو کہیں بھی لگا سکتے ہو۔'' اندو نے شرارت سے کہا کچھ اس طرح سے مدن نے

دیکھا کہ اس کی مدافعت کی ساری قوتیں ختم ہوگئیں۔ یوں بھی اسے کسی اچھے بہانے کی تلاش تھی۔ اس نے اندو کو پکڑ کر اپنے سینے سے لگایا اور بولا...... ''بابو جی تم سے بہت خوش تھے۔''

''ہاں!'' اندو بولی...... ''ایک دن میں جاگی تو دیکھا تو سرہانے کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔''

''یہ نہیں ہوسکتا۔''

''اپنی قسم!''

''اپنی نہیں میری قسم کھاؤ۔''

''تمہاری قسم تو میں نا کھاتی......کوئی کچھ بھی دے۔''

''ہاں!'' مدن نے سوچتے ہوئے کہا...... ''کتابوں اسے سیکس کہتے ہیں۔''

''سیکس؟'' اندو نے پوچھا...... ''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''ہائے رام!'' اندو نے ایک دم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا...... ''گندے کہیں کے......شرم نہیں آتی بابو جی کے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے؟''

''بابو جی کو شرم نہ آئی تجھے دیکھتے ہوئے؟''

''کیوں؟'' اندو نے بابو جی کی طرف داری کرتے ہوئے کہا...... ''وہ اپنی بہو کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔''

''تمھارا من گندا ہے۔'' اندو نے نفرت سے کہا...... ''اسی لئے تمھارا کاروبار بھی گندے بروزے کا ہے۔ تمھاری کتابیں سب گندی بھری پڑی ہیں۔ تمہیں اور تمھاری کتابوں کو اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے تو جب میں بڑی ہوگئی تھی تو میرے پتا جی نے مجھ سے ادھک پیار کرنا شروع کر دیا تھا تو کیا وہ بھی......وہ تھا نگوڑا......جس کا تم ابھی نام لے رہے تھے؟'' اور پھر اندو بولی............ ''بابو جی کو یہاں بلالو۔ ان کا وہاں جی بھی نہیں لگتا۔ وہ دکھی ہوں گے تو کیا تم دکھی نہیں ہاگے؟''

مدن اپنے باپ سے بہت پیار کرتا تھا گھر میں ماں کی موت نے مدن کے بڑا ہونے کے کارن سب سے زیادہ اثر اسی پر کیا تھا۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا۔ ماں کے بیمار رہنے کے باعث جب بھی اس کی موت

کا خیال مدن کے دل میں آتا تو وہ آنکھیں موند کر پراتھنا شروع کر دیتا............اور نمو بھگوتے واسو دیوا۔ اور نمو ....اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ چھتر چھایا بھی سر سے آٹھ جائے۔ خاصطو را ایسے میں جب کہ وہ اپنے کاروبار کو بھی جما نہیں پاتا تھا۔ اس نے غیر یقینی لہجے میں اندو سے صرف اتنا کہا......ابھی رہنے دو بابو جی کو۔ شادی کے بعد ہم دونوں پہلی بار آزادی سے مل سکیں ہیں۔''

تیسرے چوتھے بابو جی آنسوؤں میں ڈوبا خط آیا۔ میرے پیارے مدن کے تخاطب میں میری پیاری کے الفاظ شور پانیوں میں ڈُھل گئے تھے۔......''بہو کے یہاں ہونے پر میرے تو وہی پرانے دن لوٹ آئے تھے......تمہارے ماں کے دن، جب ہمارے نئی نئی شادی ہوئی تھی وہ بھی ایسی ہی الّھڑ تھی۔ ایسے ہی اتارے ہوئے کپڑے اِدھر اُدھر پھینک دیتی اور پتا جی سمیٹتے پھرتے۔ وہی صندوق......وہی بیسیوں خلجکن......میں بازار آ جا رہا ہوں، کچھ نہیں وہی بڑے یار بڑی لاہار ہوں۔ اب گھر میں کوئی نہیں۔ وہ جگہ جہاں صندوق پڑا تھا خلی ہے......اور پھر ایک آدھ سطر پھر ڈُھل گئی تھی۔ آخر میں لکھا تھا..................دفتر سے لاٹتے سمے، یہاں کے بڑے بڑے اندھے کمروں میں داخل ہوتے ہوئے میری من میں ایک ہول سا اُٹھتا......اور پھر......بہو کا خیال رکھنا، اسے کسی ایسی ویسی دایہ کے حوالے مت کرنا۔''

اندو نے دونوں ہاتھوں سے چھٹی پکڑ لی، سانس کھینچتی، آنکھیں پھیلاوتی، شرم سے پانی پانی ہوتے ہوئے بولی......''میں مرگئی، بابو جی کو کیسے پتہ چل گیا؟''

مدن نے چٹّھی چھراتے ہوئے کہا......''بالو جی کیا بچّے ہیں؟ دنیا دیکھی ہے۔ ہمیں پیدا کیا ہے۔''

''ہاں مگر۔''اندو بولی......''ابھی ان ہی کے ہوئے ہیں؟''

اور پھر اس نے ایک تیز سی نظر اپنے پیٹ پر ڈالی جس نے ابھی بڑھنا بھی شروع نہیں کیا تھا اور پھر بالو جی یا کوئی دیکھ رہا ہو، اس نے ساری کا پلّو اس پر کھینچ لیا کچھ سوچنے لگی۔ جبھی ایک سی اس کے چہرے پر آئی اور وہ بولی............''تمہاری سُسرال سے شیرینی آئے گی۔''

''میری سُسرال؟......اُوہاں''۔ مدن نے راستہ پاتے ہوئے کہا......''کتنی شرم کی بات ہے۔ ابھی چھ آٹھ مہینے شادی کو ہوئے اور چلا آیا ہے''اور اس نے ندو کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''چلا آیا ہے یا تم لائے ہو؟''

''تم ...... یہ سب قصور تمہارا ہے۔ کچھ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں''

''تمہیں پسند نہیں؟''

''ایک دم نہیں۔''

''کیوں؟''

''چار دن تو مزے لے لیتے زندگی کے۔''

''کیا یہ چندگی کا مجا نہیں؟'' اندو نے صدمہ زدہ لہجے میں کہا۔ مرد عورت شادی کس لئے کرتے ہیں ؟ بھگوان نے بن مانگے دے دیا؟ پوچھوان سے جن کے نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیا کچھ کرتی ہیں؟ پیروں فقیروں کے پاس جاتی ہیں۔ سمادھیوں، مجاروں پر چوٹیاں باندھتی شرم وحیا کو تج کر، دریاؤں کے کنارے ننگی ہوکر سر کنڈے کانٹی ......شمشانوں میں مسان جگاتی......''

''اچھا! ......اچھا۔'' مدن نے بولا ......تم نے بکھان ہی شروع کر دیا۔ اولاد کے لئے تھوڑی عمر پڑیتھی ؟''

''ہوگا تو!'' اندو نے سرزش کے انداز میں انگلی اُٹھاتے ہوئے کہا......''جب تم اسے ہاتھ بھی مت لگا نا۔ وہ تمہارے نہیں میرا ہوگا۔ تمہیں تو اس کی جرورت نہیں، پر اس کے دادا کو بہت ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔''

اور پھر کچھ خجل، کچھ صدمہ زدہ ہو کر اندو نے اپنا منھ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ وہ سوچتی تھی پیٹ میں اس ننّھی سی جان کو پالینے کو سلسلے میں ہوتا سوتا تھوڑی بہت تو کرے گا ہی لیکن مدن چُپ چاپ بیٹھا رہا ۔ایک لفظ بھی اس نے منھ سے نہ نکالا۔ اندو نے چہرے پر سے ہاتھ آٹھا کر مدن کی طرف دیکھا اور ہونے والی پہلوٹن کے کاص انداز میں بولی......''وہ تو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں سب پیچھے ہوگا پہلے تو میں بچوں گی ہی نہیں ....مجھے بچپن ہی سے وہم ہے اس بات کا۔'' مدن جیسے خائف ہو گیا ہے۔''یہ خوبصورت چیز۔'' جو حاملہ ہونے کے بعد اور بھی خوبصورت ہوگئی ہے مر جائے گی؟ اس نے پیٹھ کی طرف سے اندو کو تھام لیا اور پھر کھینچ کر اپنے بازوؤں میں لے آیا اور بالا ....''تجھے کچھ نہ ہوگا اندو............ میں تو موت کے منھ سے بھی

چھین کر لے آؤں گا تجھے............اب ساوتری کی نہیں، ستیہ وان کی باری ہے......''

مدن سے لپٹ کر اندو بھول گئی کہ اس کا اپنا بھی کوئی دکھ ہے......''

اس کے بعد بابو جی نے کچھ نہیں لکھا، البتہ سہارن پور سے ایک سارٹر آیا جس نے صرف اتنا بتایا کے بابو جی کو پھر سے دورے پڑنے لگے ہیں ایک دورے میں تو وہ قریب قریب چل ہی بسے تھے۔ مدن ڈر گیا، اندو رونے لگی، سارٹر کے چلیجانے کے بعد ہمیشہ کی طرح مدن نے آنکھیں موندلیں اور من ہی من پڑھنے لگا......''اوم نمو بھگوتے......''

دوسرے ہی روز مدن نے باپ کو چٹھی لکھی......''بابو جی! چلے آ ؤ......بچّے بہت یاد کرتے ہیں اور آپ کی بہو بھی......'' لیکن آخری نوکری تھی۔ اپنے بس کی بات تھوڑی ہی تھی۔ دھنی رام کے خط کے مطابق وہ چھٹی کا بندوبست کر رہے تھے......ان کے دن بہ دن مدن کا احساس جرم بڑھنے لگا......''اگر میں اندو کو وہیں رہنے دیتا تو میرا کیا بگڑتا......؟''

وجے دشمی سے ایک رات پہلے مدن اضطراب کی حالت میں بیچ والے کمرے کے باہر برآمدے میں ٹہل رہا تھا کہ اندر سے بچّے کے رونے کی آواز آئی اور وہ چونک کر دروازے کی طرف لپکا۔ بیگم دایہ باہر آئی اور بولی......''مبارک ہو بابو جی! لڑکا ہوا ہے۔''

''لڑکا؟'' مدن نے کہا اور پھر متفکرانہ لہجے میں بالا......بی بی کیسی ہے؟''

بیگم بولی......''خیر مہر ہے۔ میں نے ابھی تک اسے لڑکی ہی بتائی ہے...... زچہ خوش ہو جائے تو اس کی آنول نہیں گرتی نا؟''

''او......'' مدن نے بیوقوفوں کی طرح آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا اور پھر کمرے میں جانے کے لیے آگے بڑھا۔ بیگم نے اسے وہیں روک دیا اور کہنے لگی......''تمہارا اندر کیا کام ہے؟'' اور پھر ایکا ایکی دروازہ بھیڑ کے اندر لپک گئی۔

مدن کی ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی تھیں اس وقت خوف سے نہیں تسلی سے۔ یا شاید جب کوئی اس دنیا میں آتا ہے ارد گرد کے لوگوں یہی حالت ہوتی ہے۔ مدن نے سن رکھا تھا کہ جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو گھر کے در

و دیوار لرزنے لگتے ہیں۔ گویا ڈر رہے ہیں کہ بڑا ہو کر ہمیں بچّے گا یا رکھے گا۔ مدن نے محسوس کیا جیسے سچ مچ ہی دیواریں کانپ رہی تھیں...... زجکی کے لیے چکلی بھابھی تو نہ آئی تھی کیونکہ اس کا اپنا بچہ بہت چھوٹا تھا۔ البتہ دریاباد والی پھوپھی ضرور پہنچی تھی جس نے پیدائش کے وقت رام رام۔ رام رام کی رٹ لگا دی تھی اور اب اب وہی رٹ مدھم ہو رہی تھی۔

زندگی بھر مدن کو اپنا آپ اتنا فضول اور بیکار نہ لگا تھا۔ اتنے میں پھر دروازہ کھلا اور پھوپھی نکلی۔ برآمدے کی بجلی کی مدھم سی روشنی میں اس کا چہرہ بھوت کے چہرے کی طرح ایک دم دودھیا سفید نظر آرہا تھا۔ مدن نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا......

''اندو ٹھیک ہے نہ پھوپھی؟''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' پھوپھی نے تین چار بار کہا اور پھر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ مدن کے سر پر رکھ کر اسے نیچا کیا، چوما اور باہر لپک گئی۔

پھوپھی برآمدے کے دروازہ میں سے باہر جاتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ وہ بیٹھک میں پہنچی جہاں بچّے سو رہے تھے۔ پھوپھی نے ایک ایک کر کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر چھت کی طرف آنکھیں اٹھا کر منھ میں کچھ بالی اور نڈھال سی ہو کر منّی کے پاس لیٹ گئی۔ اوندھی۔ اس کے پھڑکتے ہوئے شانوں سے پتہ چل رہا تھا جیسے رو رہی ہے۔ مدن حیران ہوا...... پھوپھی تو کئی زچگیوں سے گذر رہے، پھر کیوں اس کی روح تک کانپ اٹھی ہے......؟

پھر ادھر کے کمرے سے ہرمل کی بو باہر لپکی۔ دھوئیں کا ایک غبار سا یا باہر آیا جس نے مدن کا احاطہ کر لیا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ جبھی بیگم دایہ کپڑے میں کچھ لپیٹے ہوئے باہر نکلی۔ کپڑے پر خون ہی خون تھا جس میں کچھ قطرے نکل کر فرش گر گئے۔ مدن کے ہوش اڑ گئے۔ اسے معلوم نہ تھا وہ کہاں ہے۔ آنکھیں کھلی تھیں پر کچھ دیکھائی نہ دے رہا تھا۔ بیچ میں اندو کی مرگھلی سی آواز آئی......''ہا......ئے'' اور پھر بچے کی رونے کی آواز آئی............

تین چار دن میں بہت کچھ ہوا۔ مدن نے گھر کے ایک طرف گڑھا کھود کر آنول

کودیا۔ کتوں کواندر آنے سے روکا لیکن اسے کچھ یاد نہ تھا۔اسے یوں لگا جیسے ہرمل کی بو دماغ بس جانے کے بعد آج ہی اسے ہوش آیا ہے کمرے میں وہ اکیلا ہی اندو......نندا اورجسودھا......اوردوسری طرف نندلال......اندو نے بچّے کی طرف دیکھا اور کچھ ٹٹو لینے کے انداز میں بولی......''بالکل تم ہی پر گیا ہے۔''

''ہوگا۔'' مدن نے ایک اچٹتی ہوئی سی نظر بچّے پر ڈالتے ہوئے کہا......میں تا کہتا ہوں ''شکر ہے بھگوان کا تم بچ گئیں۔''

''ہاں!'' اندو بولی......''میں تو سمجھتی تھی......''

''شبھ شبھ بولو!'' مدن نے ایک دم اندو کی بات کاٹتے ہوئے کہا......''یہاں تو جو کچھ ہوا ہے......میں تو اب تمہارے پاس بھی نہیں پھٹکوں گا'' اور مدن نے زبان دانتوں دبائی۔

''توبہ کرو۔'' اندو بولی۔

مدن نے اسی دم کان اپنے ہاتھوں سے پکڑ لئے......اور اندو نحیف سے آواز میں ہنسنے لگی۔

بچّہ پیدا ہونے بعد کئی روز تک اندو کی ناف ٹھکانے پر نہ آئی۔ وہ گھوم گھوم کر اس بچّے کو تلاش کر رہی تھی جواب اس سے پرے باہر کی دنیا میں جا کر اپنی ماں کو بھول گیا تھا۔

اب سب کچھ ٹھک تھا اور اندو شانتی سے اس دنیا بھر کے گناہ گاروں کے گناہ معاف کر دئے ہیں اور اب دیوی بن کر دیا اور کرونا کے پرساد بانٹ رہی ہے......مدن نے اندو کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا......اس سارے خون خرابے کے بعد کچھ دبلی ہو کر اندو اور بھی اچھی لگنے لگی......جبھی ایکا ایکی اندو نے دونوں ہاتھ اپنی چھاتیوں پر رکھ لئے۔

''کیا ہوا؟'' مدن نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اندو تھوڑا سا کوشش کر کے بولی......''اسے بھوک لگی ہے۔'' اور اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

''اسے؟ ......بھوک؟ ...... مدن نے پہلے بچے کی طرف دیکھا اور پھر اندو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ......''تمہیں کیسے پتہ چلا......؟''

''دیکھتے نہیں؟'' اندو نیچے کی طرف نگاہ کرتے ہوئے بولی...... ''سب گیلا ہوگیا ہے۔''

مدن نے غور سے اندو کے ڈھیلے ڈھالے دگلے کی طرف دیکھا۔ جھر جھر دودھ بہہ رہا تھا اور ایک خاص قسم کی بُو آ رہی تھی۔ پھر اندو نے بچے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا...... ''اسے مجھے دے دو!''

مدن نے ہاتھ پنگوڑے کی طرف بڑھایا اور اسی دم کھینچ لیا۔ پھر کچھ ہمت سے کام لیتے ہوئے اس نے بچے کو یوں اُٹھایا جیسے وہ مرا ہوا چوہا ہو' آخر اس نے اندو کی گود میں بچے کو دے دیا۔ اندوٗ مدن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی...... ''تم جاؤ...... باہر۔''

''کیوں؟ ......باہر کیوں جاؤں؟'' مدن نے پوچھا۔

''جاؤ نا......'' اندو نے کچھ مچلتے' کچھ شرماتے ہوئے کہا...... ''تمہارے سامنے مَیں دودھ نہیں پلا سکوں گی۔''

''ارے؟'' مدن حیرت سے بولا...... میرے سامنے......نہیں پلا سکے گی؟'' اور پھر نا سمجھی کے انداز میں سر کو جھٹکا دے کر باہر کی طرف چل نکلا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر مُڑتے ہوئے اس نے اندو پر ایک نگاہ ڈالی ......اتنی خوبصورت اندو آج تک نہ لگی تھی۔

بابو دھنی رام چھٹی پر گھر لوٹے تو وہ پہلے سے آدھے دکھائی پڑتے تھے۔ جب اندو نے پوتا ان کی گود میں دیا تو وہ کھل اُٹھے۔ ان کے پیٹ کے اندر کوئی پھوڑا نکل آیا تھا جو چوبیس گھنٹے انہیں سولی پر لٹکائے رکھتا۔ اگر منا نہ ہوتا تو بابو جی کی اس سے دس گنا بُری حالت ہوتی۔

کئی علاج کیے گئے۔ بابو جی کے آخر علاج میں ڈاکٹر نے ادھنّی کے برابر کی گولی پندرہ بیس کی تعداد میں روز کھانے کو دیں' پہلے ہی دن کپڑے اُتار کر اتنا پسینہ آیا کہ تین تین چار چار بار کپڑے بدلنے پڑے۔ ہر بار مدن کپڑے اُتار کر بالٹی میں نچوڑتا۔ صرف پسینے ہی سے بالٹی ایک چوتھائی ہوگئی تھی۔ رات انہیں متلی سی ہونے لگی تھی اور انھوں نے پکارا......

''بہو! ذرا داتن تو دینا' ذائقہ بہت خراب ہو رہا ہے۔'' بہو بھاگی ہوئی گئی اور داتن لے آئی۔ بابو جی اُٹھ کر داتن چبا رہے تھے کہ ایک اُبکائی کیا آئی' ساتھ ہی خون کا پرنالہ لے آئی۔ بیٹے نے واپس سرہانے کی

طرف لٹایا تو اس کی پتلیاں پھر چکی تھیں اور کوئی ہی دم میں وہ آسمان کے گلزار میں پہنچ چکے تھے، جہاں انھوں نے اپنا پھول پہچان لیا تھا۔

مُنّے کو پیدا ہوئے کل بیس پچیس دِن ہوئے تھے۔ اندو نے منہ نوچ نوچ کر، سر اور چھاتی کو پیٹ پیٹ کر خود کو نیلا کر لیا تھا۔ مدن کے سامنے وہی منظر تھا جو اس نے تصور میں اپنے مرنے پر دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اندو نے چوڑیاں توڑنے کی بجائے اُتار کر رکھ دی تھیں۔ سر پر راکھ انہیں ڈالی لیکن زمین پر مٹی لگ جانے اور بالوں کے بکھر جانے سے چہرہ بھیانک ہو گیا تھا...... ''لوگو! ہم لُٹ گئے......''

گھر بار کا کتنا بوجھ مدن پر آ پڑا تھا، اس کا ابھی مدن کو پوری طرح اندازہ نہ تھا۔ صبح ہونے تک اس کا دل لپک کر منہ میں آ گیا تھا۔ وہ شاید بچ نہ پاتا اگر وہ گھر کے باہر بدرو کے کنارے سیل چڑھتی مٹی پر اوندھا لیٹ کر اپنے دِل کو ٹھکانے پر نہ لاتا...... دھرتی ماں نے چھاتی سے لگا کر اپنے بچے کو بچا لیا تھا۔ چھوٹے بچے کندن، دلاری منّی اور پاشی یوں چلّا رہے تھے جیسے گھونسلے پر شکرے کے حملے پر چڑیا کے بونٹ چونچیں اُٹھا اُٹھا کر چیں چیں کرتے ہیں۔ انہیں اگر کوئی پرون کے نیچے سمیٹتی تھی تو اندو......۔

نالی کے کنارے پڑے پڑے مدن نے سوچا، اب تو یہ دُنیا میرے لیے ختم ہو گئی کیا مَیں جی سکوں گا؟ زندگی میں کبھی ہنس سکوں گا؟ اُٹھا اور اُٹھ کر گھر کے اندر چلا آیا۔

سیڑھیوں کے نیچے غسل خانہ تھا جس میں گھس کر اندر سے کواڑ بند کرتے ہوئے مدن نے ایک بار پھر اس سوال کو دُہرایا، مَیں کبھی ہنس سکوں گا؟ ......اور کھلکھلا کر ہنس رہا تھا، حالانکہ اس کے باپ کی لاش ابھی پاس بیٹھک میں پڑی تھی۔

باپ کو آگ کے حوالے کرنے سے پہلے مدن، ارتھی پر پڑے ہوئے جسم کے سامنے ڈنڈوت کے انداز میں لیٹ گیا۔ یہ اس کا اپنے جنم داتا کو آخری پرنام تھا۔ جس پر بھی وہ رو نہ رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ماتم میں شریک ہونے والے رشتہ دار، محلے والے سُن سے رہ گئے۔

پھر ہندو رواج کے مطابق سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے مدن کو چتا جلانی پڑی۔ جلتی ہوئی کھوپڑی میں کپال کرایا کی لاٹھی مارنی پڑی......عورتیں باہر ہی شمشان کے کنویں پر نہا کر گھر لوٹ چکی تھیں۔

جب مدن گھر پہنچا تو وہ کانپ رہا تھا۔ دھرتی ماں نے تھوڑی دیر کیلئے جو طاقت اپنے بیٹے کو دی تھی۔ رات کے گھر آنے پر پھر سے ہوس میں ڈھل گئی......اسے کوئی سہارا چاہیے تھا۔ کسی ایسے جذبے کا سہارا جو موت سے بھی بڑا ہو۔ اس وقت دھرتی ماں کی بیٹی' جنک' دلاری اندو نے کسی گھڑے میں پیدا ہو کر اس رام کو اپنی بانہوں میں لے لیا......اس رات اندوا گر اپنا آپ یوں مدن پر نہ وار دیتی تو اتنا دُکھ مدن کو لے ڈوبتا۔

دس ہی مہینے کے اندر اندو کا دوسرا بچہ چلا آیا۔ بیوی کو اس دوزخ کی آگ میں ڈھکیل کر مدن خود اپنا دُکھ بھول گیا تھا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ اگر مَیں شادی کے بعد بابو جی کے پاس گئی ہوئی اندو کو نہ بلا لیتا تو شاید وہ اتنی جلدی نہ چل دیتے، لیکن پھر وہ باپ کی موت سے پیدا ہونے والے خسارے کو پورا کرنے میں لگ جاتا ......کاروبار جو پہلے بے توجہی کی وجہ سے بند ہو گیا تھا......مجبوراً چل نکلا۔

ان دنوں بڑے بچے کو مدن کے پاس چھوڑ کر چھوٹے کو چھاتی سے لگائے اندو میکے چلی گئی تھی۔ پیچھے منا طرح طرح کی ضد کرتا جو کبھی مانی جاتی اور کبھی نہیں بھی۔ میکے سے اندو کا خط آیا......''مجھے یہاں اپنے بیٹے کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ اسے کوئی مارتا تو نہیں؟''...... مدن کو بڑی حیرت ہوئی۔ ایک جاہل اَن پڑھ عورت......ایسی باتیں کیسے لکھ سکتی ہے؟......پھر اس نے اپنے آپ سے پوچھا......''کیا یہ بھی کوئی رَٹا ہوا فقرہ ہے؟''

سال گذر گئے۔ پیسے بھی اتنے نہ تھے کہ ان سے کچھ عیش ہو سکے، لیکن گزارے کے مطابق آمدنی ضرور ہو جاتی تھی۔ دِقت اس وقت ہوتی جب کوئی بڑا خرچ سامنے آ جاتا......کندن کا داخلہ دینا ہے۔ دلاری کا شگون بھجوانا ہے۔ اس وقت مدن منہ لٹکا کر بیٹھ جاتا اور پھر اندو ایک طرف سے آتی' مسکراتی ہوئی اور کہتی...... ''کیوں دُکھی ہو رہے ہو؟'' مدن اس کی طرف اُمید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتا......''دُکھی نہ ہوں؟ کندن کا بی۔اے کا داخلہ دینا ہے......منّی''...... اندو پھر ہنستی اور کہتی...... ''چلو میرے ساتھ'' اور مدن بھیڑ کے بچے کی طرح اندو کے پیچھے چل دیتا۔ اندو صندل کے صندوق کے پاس پہنچتی جسے کسی کو مدن سمیت ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ کبھی کبھی اس بات پر خفا ہو کر مدن کہتا...... ''مرو گی تو اسے بھی چھاتی پر ڈال کر لے جانا۔'' اور اندو کہتی......''ہاں لے جاؤں گی۔'' پھر اندو وہاں سے مطلوبہ رقم نکال کر سامنے رکھ دیتی۔

''یہ کہاں سے آ گئے؟''

''کہیں سے بھی آئے......تمھیں آم کھانے سے مطلب ہے کہ......''

''پھر بھی؟''

''تم جاؤ اپنا کام چلاؤ۔''

اور جب مدن زیادہ اصرار کرتا تو اندو کہتی......''مَیں نے ایک سیٹھ کو دوست بنایا ہے۔'' اور پھر ہنسنے لگتی۔ جھوٹ جانتے ہوئے بھی مدن کو یہ مذاق اچھا نہ لگتا۔ پھر اندو کہتی......''مَیں چور لٹیرا ہوں......تم نہیں جانتے؟......سخی لٹیرا......جو ایک ہاتھ سے لوٹتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے غریب غرباء کو دے دیتا ہے۔''......اسی طرح منّی کی شادی ہوئی جس پر ایسے ہی لوٹ کر زیور بکے۔ قرض چڑھا اور پھر اُتر بھی گیا......ایسے ہی کندن کا بھی بیاہ ہو گیا۔ ان شادیوں میں اندو ہی ''ہتھ بھرا'' کرتی اور ماں کی جگہ کھڑی ہو جاتی۔ آسمان سے بابو جی اور ماں دیکھا کرتے اور پھول برساتے جو کسی کو نظر آتے۔ پھر ایسا ہوا، اوپر ماں جی اور بابو جی میں جھگڑا چل گیا۔ ماں نے بابو جی سے کہا......''تم بہو کے ہاتھ کی پکی ہوئی کھا آئے ہو، اس کا سکھ بھی دیکھا ہے، پر مَیں نصیبوں کی جلی نے کچھ بھی نہیں دیکھا''......یہ جھگڑا وشنو مہیش اور شیو تک پہنچا۔ انھوں نے ماں کے حق میں فیصلہ دیا......اور یوں ماں، مات لوک میں آ کر بہو کی کوکھ میں پڑی......اور اندو کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی......

پھر اندو ایسی بھی نہ تھی۔ جب کوئی اُصول کی بات ہوتی تو نند دیور تو کیا خود مدن سے بھی بھڑ پڑ جاتی......مدن راست بازی کی اس پتلی کو خفا ہو کر ہریش چندر کی بیٹی کہا کرتا تھا۔ چونکہ اندو کی بات میں اُلجھاؤ ہونے کے باوجود سچائی اور دھرم قائم رہتے تھے، اس لیے مدن اور کنبے کے باقی سب لوگوں کی آنکھیں اندو کے سامنے ہی رہتی تھیں......جھگڑا کتنا بھی بڑھ جائے مدن اپنی شوہری زعم میں کتنا بھی اندو کی بات کو ردّ کر دے لیکن آخر سبھی سر جھکائے ہوئے اندو ہی کے شرن میں آتے اور اسی سے چھما مانگتے تھے۔

نئی بھابھی آئی۔ کہنے کو تو وہ بھی بیوی تھی لیکن اندو ایک عورت تھی جسے بیوی کہتے ہیں۔ اس کے اُلٹ چھوٹی بھابھی رانی ایک بیوی تھی جسے عورت کہتے ہیں۔ رانی کے کارن بھائیوں میں جھگڑا ہوا اور جے پی چاچا

کی معرفت جائیداد تقسیم ہوئی جس میں ماں باپ کی جائیداد تو ایک طرف، اندو کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں تقسیم کی زَد میں آ گئیں اور اندو کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔

جہاں سب کچھ مل جانے کے بعد اور الگ ہو کر بھی کندن اور رانی ٹھیک سے نہیں بس سکے تھے، وہاں اندو کا اپنا گھر نوں میں جگ مگ جگ مگ کرنے لگا۔

بچی کی پیدائش کے بعد اندو کی صحت وہ نہ رہی۔ بچی ہر وقت اندو کی چھاتیوں سے چمٹی رہتی تھی۔ جہاں سبھی گوشت کے لوتھڑے پر تھو تھو کرتے تھے وہاں ایک اندو تھی جو اسے کلیجے سے لگائے پھرتی لیکن کبھی خود بھی پریشان ہو اُٹھتی اور بچی کو سامنے جھلنگے میں پھینکتے ہوئے کہہ اُٹھتی...... ''تو مجھے جینے بھی دے گی...... ماں؟''

اور بچی چلاّ چلاّ کر رونے لگتی۔

مدن اندو سے کٹنے لگا۔ شادی سے لے کر اس وقت تک اسے وہ عورت نہ ملی تھی جس کا وہ متلاشی تھا۔ بروز بکنے لگا اور مدن نے بہت سارا روپیہ اندو سے بالا ہی بالا خرچ کرنا شروع کر دیا۔ بابو جی کے چلے جانے پر کوئی پوچھنے والا بھی تو نہ تھا۔ پوری آزادی تھی۔ گویا پڑوسی سبطے کی بھینس پھر مدن کے منہ کے پاس پھنکارنے لگی بلکہ بار بار پھنکارنے لگی۔ شادی کی رات والی بھینس تو بک چکی تھی لیکن اس کا مالک زندہ تھا۔ مدن اس کے ساتھ ایسی جگہوں پر جانے لگا روشنی اور سائے عجیب بے قاعدہ سی شکلیں بناتے ہیں۔ نکڑ پر کبھی اندھیرے کی تکون بنتی ہے کبھی اوپر کھٹ سے روشنی کی ایک چوکور آ کر اسے کاٹ دیتی ہے۔ کوئی تصویر نہیں بنتی۔ معلوم ہوتا ہے بغل سے ایک پاجامہ نکلا اور آسمان کی طرف اُڑ گیا۔ کسی کوت نے دیکھنے والے کا منہ ڈھانپ لیا اور کوئی سانس کے لیے تڑپنے لگا۔ جبھی روشنی کی ایک چوکور ایک چوکھٹا سی بن گئی اور اس میں ایک صورت آ کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھنے والے نے ہاتھ بڑھایا اور وہ آر پار چلا گیا اور وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پیچھے کوئی کتا رونے لگا اور طبل نے اس کی آواز ڈبو دی......

مدن کو اس تصور سے وکال ملے لیکن ہر جگہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آرٹسٹ سے ایک غلط خط لگ گیا ہے۔ یا ہنسی کی آواز ضرورت سے زیادہ بلند تھی اور مدن بے داغ صناعی اور متوازن ہنسی کی تلاش میں کھو گیا۔

سبطے نے اس وقت اپنی بیوی سے بات کی جب اس کی بیگم نے مدن کو مثالی شوہر کی حیثیت سے سبطے

کے سامنے پیش کیا' پیش ہی نہیں بلکہ منہ میں مارا۔اس کو اٹھا کر سطے نے بیگم کے منہ پر مارا۔معلوم ہوتا تھا کسی خونی تربوزہ کا گودا ہے جس کی رگ و ریشے بیگم کی ناک ، اس کی آنکھوں اور کانوں پر لگے ہوئے ہیں ۔ کروڑ کروڑ گالی بکتی ہوئی بیگم نے حافظے کی ٹوکری میں اسے گودا اور بیج اُٹھائے اور اندو کے صاف ستھرے صحن میں بکھیر دیئے۔

ایک اندو کی بجائے دو اندو ہو گئیں۔ ایک تو اندو خود تھی اور دوسرین کانپتا ہوا خط جو اندو کے پورے جسم کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور جو نظر آ رہا تھا۔

مدن کہیں جاتا بھی تھا تو گھر سے ہوکر...... نہا دھو کر اچھے کپڑے پہن کر، مگھئی کی ایک جوڑی جس میں خوشبو دار قوام لگا ہوا تھا، منہ میں رکھ کر'...... لیکن اس دن مدن جو گھر آیا تو اندو کی شکل ہی دوسری تھی ۔ اس نے چہرے پر پاؤڈر تھوپ رکھا تھا۔ گالوں پر روج لگا رکھی تھی ۔ لِپ اسٹک کے نہ ہونے پر ماتھے کی بندی سے رنگ لیے تھے اور بال کچھ اس طریقے سے بنائے تھے کہ مدن کی نظریں ان میں الجھ کر رہ گئیں ۔

''کیا بات ہے آج ؟'' مدن نے حیرت سے پوچھا۔

''کچھ نہیں ۔'' اندو نے مدن سے بچاتے ہوئے کہا......''آج فرصت ملی ہے ۔''

شادی کے پندرہ برس گزر جانے کے بعد اندو کو آج فرصت ملی تھی ! اور وہ بھی اس وقت جب کہ چہرے پر جھائیاں چلی آئیں تھیں ۔ ناک پر ایک سیاہ سے کاٹھی بن گئی تھی اور بلاؤز کے نیچے ننگے پیٹ کے پاس کمر پر چربی کی دو تین تہیں دکھائی دینے لگی تھیں ۔ آج اندو نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ ان عیوب میں سے ایک بھی چیز نظر نہ آتی تھی ۔ یوں بنی ٹھنی، کسی کسائی و بے حد حسین لگ رہی تھی ۔...... ''نہیں نہیں ہو سکتا''...... مدن نے سوچا اور اسے ایک دھچکا سا لگا۔ اس نے پھر

ایک بار مڑ کر اندو کی طرف دیکھا...... جیسے گھوڑوں کے بیوپاری کسی نامی گھوڑی کی طرف دیکھتے ہیں، وہاں گھوڑی بھی تھی اور لال لگام بھی...... یہاں جو غلط خط لگے تھے، شرابی کی آنکھوں کو نہ دیکھ سکے تھے...... اندو سچ مچ خوبصورت تھی ۔ آج بھی پندرہ سال بعد، پھولاں' رشیدہ، مسز رابٹ اور ان کی بہن اس کے سامنے پانی بھرتی تھیں...... پھر مدن کو رحم آنے لگا اور ایک ڈر!

آسمان پر کوئی بادل بھی نہ تھے، لیکن پانی پڑنا شروع ہوگیا۔ گھر کی طغیانی پر تھی اور اس کا پانی کناروں سے نکل نکل کر پوری ترائی اور اس کے آس پاس بسنے والے گاؤں اور قصبوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ اسی رفتار سے پانی بہتا رہا تو اس میں کیلاش پربت بھی ڈوب جائے گا......ادھر بچی رونے لگی۔ ایسا رونا جو وہ آج تک نہ روئی تھی۔

مدن نے اسو کی آواز سن کر آنکھیں بند کرلیں۔ کھولیں تو بچی سامنے کھڑی تھی۔ جوان عورت بن کر۔ نہیں نہیں وہ اندو تھی۔ اپنی ماں بیٹی، اپنی بیٹی ماں جو اپنی آنکھوں کے دُنبالے سے مسکرائی اور ہونٹوں کو کونے سے دیکھنے لگی۔

اسی کمرے میں جہاں ایک دن ہرمل کی دھونی نے چکرا دیا تھا، آج خس کی خوشبو نے بوکھلا دیا۔ ہلکی بارش تیز بارش سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے اس لیے باہر کا پانی اوپر کسی کڑی میں سے ٹپکتا ہوا اندو اور مدن کے بیچ ٹپکنے لگا......لیکن مدن تو شرابی ہورہا تھا، اس نشے میں اس کی آنکھیں سمٹنے لگیں اور تنفس تیز ہو کر انسان کا تنفس نہ رہا۔

''اندو......! مدن نے کہا...... اور اس کی آواز شادی کی رات والی آواز سے دوسرا اوپر تھی......پھر آج چاندنی کی بجائے اماوس تھی......

اس سے پہلے کہ مدن، اندو کی طرف ہاتھ بڑھاتا، اندو خود ہی مدن سے لپٹ گئی۔ پھر مدن نے ہاتھ سے اندو کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور دیکھنے لگا، اس نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے؟ اندو نے ایک نظر مدن کے سیاہ ہوئے چہرے کی طرف پھینکی اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔

''یہ کیا؟'' مدن نے چونکتے ہوئے کہا......''تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔''

''یونہی۔'' اندو نے کہا اور بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی......رات بھر جگایا ہے اس چڑیل میا نے۔''

بچی اب تک خاموش ہو چکی تھی۔ گویا دَم سادھے دیکھ رہی تھی، اب کیا ہونے والا ہے؟ آسمان سے پانی پڑنا بند ہوگیا تھا۔ مدن نے پھر غور سے اندو کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا...... ''وہاں مگر...... یہ

آنسو......؟''

''خوشی کے ہیں۔'' اندو نے جواب دیا......آج کی رات میری ہے۔'' اور پھر ایک عجیب سی ہنسی ہنستی ہوئی چمٹ گئی۔ ایک تلذذ کے احساس نے کہا......'' آج برسوں کے بعد میرے من کی مراد پوری ہوئی ہے، اندو! مَیں نے ہمیشہ چاہا تھا......''

''لیکن تم نے کہا نہیں۔'' اندو بولی......'' یاد ہے شادی کی رات مَیں نے تم سے کچھ مانگا تھا؟''

''ہاں۔'' مدن بولا......'' اپنے دُکھ مجھے دے دو!''

''تم نے کچھ نہیں مانگا مجھ سے۔''

''مَیں نے؟'' مدن نے حیران ہوتے ہوئے کہا...... ''مَیں کیا مانگتا؟ مَیں تو جو کچھ مانگ سکتا تھا وہ سب تم نے دے دیا۔ میرے عزیزوں سے پیار......ان کی تعلیم،...... بیاہ،......شادی، یہ پیارے بچے...... یہ سب کچھ تو تم نے دے دیا۔''

''مَیں بھی یہی سمجھتی تھی۔'' اندو بولی......لیکن اب جا کر پتہ چلا، ایسا نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''کچھ نہیں۔'' پھر اندو نے رُک کر کہا......''مَیں نے پھر ایک چیز رکھ لی۔''

''کیا چیز رکھ لی؟''

اندو کچھ دیر چپ رہی اور پھر اپنا منہ پرے کرتے ہوئے بولی...... ''اپنی لاج...... اپنی خوشی...... اس وقت تم بھی کہہ دیتے...... اپنے سکھ مجھے دے دو۔...... تو مَیں ......اور اندو کا گلا رُندھ گیا۔

اور کچھ دیر بعد وہ بولی...... ''اب تو میرے پاس کچھ نہیں رہا۔'' مدن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ زمین میں گڑ گیا...... یہ اَن پڑھ عورت......؟ کوئی رَٹا ہوا فقرہ......؟

نہیں تو...... یہ تو ابھی سامنے ہی زندگی کی بھٹی نکلا ہے۔ ابھی تو اس پر برابر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں اور آتشیں بُرادہ چاروں طرف اُڑ رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد مدن کے ہوش ٹھکانے آئے اور بولا......''مَیں سمجھ

گیا اندو......!''

پھر روتے ہوئے مدن اور اندو ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اندو نے مدن کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایسی دُنیا میں لے گیا جہاں انسان مر کر ہی پہنچ سکتا ہے......

7.4 خصوصیات

(۱) پلاٹ اور تکنیک کے اعتبار سے ایک کامیاب افسانہ ہے۔

(۲) افسانہ میں مشرقی تہذیب وتمدن اور طرزِ معاشرت کی حقیقی تصویر پیش کی گئی ہے۔

(۳) یہ افسانہ کردار نگاری اور جذبات نگاری کے لحاظ سے بھی کامیاب ہے۔

(۴) بیدی عورت کے نفسیات سے بہت زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔

(۵) اندو اپنی تمام تر پریشانیوں کے باوجود دوسرے کے دُکھ دَرد کو محسوس کرتی ہیں اور ان میں شریک ہونے کی کوشش کرتی ہے۔

(۶) مکالموں میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

(۷) زبان وبیان میں بھی قابلِ تعریف ہے۔

(۸) محبت، خلوص اور دَردمندی کے عناصر سے اس افسانہ کی تشکیل ہوئی ہے۔

(۹) منظر کشی بھی بہت عمدہ ہے۔ اندو اور مدن کی پہلی ملاقات کا منظر نہایت ہی تکلف اور فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

(۱۰) اندو کا اپنے شوہر سے اس کے دُکھ لینے کا مطالبہ محض جذباتی نہیں تھا بلکہ اس نے عملی طور پر اپنے اس مطالبہ کو صحیح ثابت کر دکھایا۔

(۱۱) مشرقی گھرانوں میں رائج ادب واحترام، شرم وحیا، حدِ مراتب وغیرہ کو بڑی عمدگی سے اس افسانہ میں پیش کیا گیا ہے۔

(۱۲) یہ راجندر سنگھ بیدی کا شاہکار افسانہ ہے۔

7.5 افسانہ نگار کا تعارف

راجندر سنگھ بیدی

راجندر سنگھ بیدی یکم ستمبر ۱۹۱۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے، انھوں نے میٹرک میں درجۂ اوّل سے کامیابی حاصل کیا اور انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا، لیکن معاشی بحران کی وجہ سے پوسٹ آفس میں بحیثیتِ کلرک مامور ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء میں وہ جموں ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۴۹ء میں وہ ممبئی آ کر فلم انڈسٹری سے وابستہ ہو گئے، ۱۲/نومبر ۱۹۸۴ء کو ممبئی میں ان کا انتقال ہوا۔

راجندر سنگھ بیدی اُردو افسانہ نگاری کا ایک درخشاں ستارہ ہیں۔ انھوں نے ابتداء میں محسن لاہوری کے قلمی نام سے افسانے تحریر کیے۔ ان کا پہلا افسانہ ''مہارانی کا تحفہ'' ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''داناودہ'' کے نام سے شائع ہوا۔ ''گرہن'' ''کوکھ جلی'' ''اپنے دُکھ مجھے دے دو' ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'' ''مکتی بادھ'' وغیرہ ان کے اہم افسانے ہیں۔ بیدی نے ہندو سماجی عکاسی نہایت صداقت کے ساتھ کی ہے۔ ان کے افسانوں میں ہندوستان کا مفلس طبقہ سسکیاں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس کی بہترین مثال ان کا افسانہ ''گرم کوٹ'' ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں ادبیت' حق گوئی اور بے باکی ہے۔ ہندوستانیت' مساوات' قومی یکجہتی اور انسان دوستی کا پیغام انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے دیا ہے۔ ان کے افسانوں کا ماحول زیادہ تر دیہاتی ہے۔ انھوں نے دیہی

رسم و رواج' طرزِ معاشرت' نظریات اور اعتقاد کی سچی اور مؤثر عکاسی کی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں گھریلو زندگی کے نشیب و فراز اس کی چھوٹی چھوٹی اُلجھنوں اور اس کے دُوررس نتائج کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے تحریر کیا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کی تخلیقات میں فکر و تخیل اور حقیقت نگاری کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔

7.6 خلاصہ

''اپنے دُکھ مجھے دے دو'' راجندر سنگھ بیدی کا شاہکار افسانہ ہے۔ افسانہ کی کہانی متوسط افراد کے گرد گھومتی ہے۔ اس میں مرکزی کردار اندو ہے، جس کی شادی مدن سے ہوتی ہے جو ایک نا تجربہ کار اور زندگی کے نشیب و فراز سے نا آشنا نوجوان ہے۔ اندو ایک مسیحا کی شکل میں مدن کی زندگی میں داخل ہوتی ہے اور پہلی ہی ملاقات میں وہ شوہر کی ہمدرد اور غمگسار بن جاتی ہے۔ وہ اپنی خدمت اور ایثار سے تمام افرادِ خاندان کا دِل جیت لیتی ہے۔ وہ اپنے دیوروں اور نندوں کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آتی ہے۔ وہ اپنے ضر دھنی رام کی خدمت خلوصِ دل سے کرتی ہے، جس وقت اس کی صحت خراب رہتی ہے اس وقت وہ اپنے بچوں کے ہمراہ سہارنپور جا کر اس کی تیمارداری کرتی ہے۔ دھنی رام کی صحت روز بروز گرنے لگتی ہے اور کچھ دنوں بعد اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔

باپ کے مرنے کے بعد اب تمام تر ذمہ داریاں مدن پر آ جاتی ہیں۔ اندو ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتی ہے مدن کے بھائیوں اور بہنوں کی شادی میں وہ مکمل تعاون کرتی ہے۔ اپنے شوہر کی ناراضگی کے باوجود وہ ہمیشہ ایثار و قربانی سے کام لیتی ہے۔ جوانی ڈھل جانے کے بعد اندو اپنی کشش اور رعنائی کھو دیتی ہے۔ ایسے وقت مدن اپنا دِل بہلانے کیلئے فاحشہ عورتوں کے یہاں جانے لگتا ہے۔ اندو اسے سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لاتی ہے۔

7.7 مشقی سوالات

مختصر سوالات

۱)۔ افسانہ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کا موضوع کیا ہے؟

۲)۔ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کس تحریر کا کردہ افسانہ ہے؟

۳)۔ اندو کا مدن سے کیا رشتہ تھا؟

۴)۔ اندو نے کس سے کہا کہ اپنے دکھ مجھے دے دو؟

۵)۔ مدن کے چھوٹے بھائیوں کے نام بتایئے؟

۶)۔مدن کیا کاروبار کرتا تھا؟

۷)۔اندو کے خسر کا نام بتلایئے؟

۸)۔مدن کی ماں کس عارضے میں مبتلا تھی؟

۹)۔مدن کے چھوٹی بہن کا کیا نام تھا؟

۱۰)۔دھنی رام کا تبادلہ کس شہر میں ہوا تھا؟

۱۱)۔دھنی رام کی موت کے بعد گھر کی تمام ذمہ داری کس پر تھی؟

۱۲)۔مشکل حالات میں کس نے مدن کا ساتھ دیا؟

۱۳)۔مدن کس برائی میں مبتلا ہو گیا تھا؟

۱۴)۔اس افسانے کا انجام کس طرح ہوا؟

تفصیلی سوالات

۱)۔افسانہ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کا خلاصہ تحریر کیجئے۔

۲)۔''اپنے دکھ مجھے دے دو'' افسانہ کا تنقیدی جائزہ لیجئے؟

۳)۔راجندر سنگھ بیدی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالئے؟

۴)۔راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کیجئے۔

۵)۔ذیل کے کرداروں پر نوٹ لکھئے۔

۱)۔اندو **۲)۔مدن** ۳)۔دھنی رام

7.8 فرہنگ

الفاظ	**معنی**
کھاٹ	پلنگ
پاتال	تحت الثریٰ، زمین کا سب سے نچلا حصہ
شہد	الفاظ

روہان ہونا	رونے پر آمادہ ہونا
تحکمانہ	حاکمانہ
اتر پچھّم	شمال مغرب
خجالت	شرمندی، ندامت
ابتذال	اخلاقی پستی، گراوٹ
وحشت ہونا	شور مچانا
چھتر چھایا	سائے میں
سرزش	سزا
خائف ہونا	خوفزدہ ہونا
چتا لگانا	آگ جلانا
تلذز	مزہ، لطف

7.9 مزید مطالعہ کے لیے کتب

(۱) تاریخ ادب اردو (جلد چہارم) : سیدہ جعفر

(۲) ادب کا تنقیدی مطالبہ : ڈاکٹر سلام سندیلوی

(۳) تاریخ ادب اردو (جلد دوم) : ڈاکٹر وہاب اشرفی

(۴) انتخاب افسانہ : اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ

اکائی 8۔افسانہ ’’کالو بھنگی‘‘

کرشن چندر

اکائی کے اجزاء

8.1 مقاصد

8.2 تمہید

8.3 مصنف کا تعارف

8.4 خصوصیات

8.5 افسانہ ’’کالو بھنگی‘‘

8.6 خلاصہ

8.7 مشقی سوالات

8.8 فرہنگ

8.9 مزید مطالعہ کے لیے کتب

8.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد افسانہ ’’کالو بھنگی‘‘ کا مطالعہ کرنا ہے اور اس کے افسانے نگار کرشن چندر کی افسانہ نگاری سے متعارف کرانا۔اس اکائی کی تکمیل کے بعد آپ کو درج ذیل نکات سے واقفیت حاصل ہو جائے گی۔

(۱) افسانہ ’’کالو بھنگی‘‘ میں کس واقع کو پیش کیا گیا ہے؟

(۲) کالو بھنگی نچلے طبقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس سے اعلیٰ طبقہ کے افراد کی خود غرضی اور سنّاک ذہنیت کی کس طرح عکاسی کی گئی ہے۔

(۳) کرشن چندر کا اردو افسانہ میں کیا مقام و مرتبہ ہے؟

8.2 تمہید

''کالو بھنگی''، کرشن چندر کا بہت ہی اچھا افسانہ ہے۔ اس افسانہ میں انہوں نے تلخ حقیقت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے عدم ماورت اور طبقاطی کشمکش انسان کی ذات کی بنیاد پر ہے اور نچلی ذات کے شخص کی لوث خدمات اور اس کے اعلیٰ اور صاف کو ملحوظ رکھا جاتا۔ کالو بھنگی میں خدمت خلق کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہیں لیکن جب وہ خود بستر مرگ پر ہوتا ہے تو کوئی اس کی تیمارداری کرنے کے لئے نہیں آتا۔ یہ افسانہ طنز کے لطیف عنصر سے مزّین ہے۔

کرشن چندر اردو کے کامیاب اور صف اوّل کے افسانہ نگاروں میں سے تھے۔ ان کے افسانے فنی اور معنوی خوبیاں رکھتے ہیں اور اعلیٰ شخصیت، بلند کردار اور انسان دوستی کا ثبوت ہیں۔ سرمایہ داری مذہب پرستی، ناانصافی، خودغرضی اور فسادات وغیرہ موضوعات پر کرشن چندر نے متعدد افسانے تحریر کئے۔ زندگی کے متعلق ان کے واضح صحت منداور وسیع انسانی نقطۂ نظر ہے۔ ان کا افسانہ ''کالو بھنگی'' ہمارے سماج کی بے حسی، سفا کی اور احسان فراموشی پر ایک گہرا طنز ہے۔

8.3 مصنف کا تعارف: کرشن چندر

کرشن چندر ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء کو بھرت پور میں پیدا ہوئے۔ کرشن چندر کے والد کا نام گوری شنکر تھا۔ پیشے سے وہ ڈاکٹر تھے۔ پنجابی کھتری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں کسی قسم کا مذہبی تعصب نہیں تھا۔ ان کے والد کا انتقال ۱۹۵۱ء میں ہوا۔ کرشن چندر کی والدہ امدیوی مذہبی مزاج کی خاتون تھیں۔ بچوں کی پرورش کی زیادہ ذمہ داری انہیں کے کندھوں پر تھی۔ ان کا انتقال ۱۹۶۹ء میں ہوا۔

کرشن چندر کا بچپن آرام وآسائش کے ساتھ گزرا۔ انہوں نے کھیل کود میں دلچسپی لی۔ کرکٹ کھیل، ڈراموں میں کام کرنے کا بے حد شوخ تھا۔ موسیقی میں بھی دلچسپی تھی، پتنگ کا بے حد شوخ تھا۔ شاعری کرنے کا شوق چرایا پر ان کے استاد دینا ناتھ شوق نے ان کی شاعری کا خوب مذاق اڑایا اور ان کے دماغ سے شاعری کا خیال نکل گیا۔ ناولوں کے مطالعے کا بھی بے حد شوخ تھا۔ تیسری جماعت میں ''الف لیلہ'' پڑھی تھی۔ تعلیم کا

آغاز پانچ برس کی عمر میں ہوا مینڈھر جموں کے پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔آٹھویں جماعت سے وکٹوریہ جوبلی اسکول پونچھ میں تعلیم حاصل کی۔دسویں جماعت کا امتحان سیکنڈ ڈیویژن میں پاس کیا۔ایف ایس سی بھی سیکنڈ ڈیویژن میں پاس کیا۔۱۹۳۲ء میں بی۔اے۔پاس کیا۔ان مضامین انگریزی سیاسیات، تاریخ اور معاشیات تھے۔۱۹۳۴ء میں انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا۔اس باری بھی سکنڈ ڈویژن ہی ملا۔گورنمنٹ لا کالج لاہور سے ایل ایل بی کیا۔

کرشن چندر کی ماں چاہتی تھی کہ وہ بہت بڑے وکیل یا جج بنیں۔لیکن وہ وکیل یا جج نہیں بن پائے۔انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے قلم کو حصول معاش کا ذریعہ بنائیں گے۔وہ متواتر افسانے لکھنے لگے۔اپنا پہلا ناول ''شکست'' انہوں نے ۱۹۳۴ء میں لکھا جو ساقی بک ڈپو نے شائع کیا۔انہوں نے یہ ناول اکیس دس میں مکمل کیا۔دیورانی کے بلاوے پر ۱۹۴۴ء میں بمبئی چلے آئے۔اور فلم کمپنی بنائی اور فلم ''سرائے سے باہر'' بنائی جو ناکام ثابت ہوئی اس کے بعد اپنی ذاتی کمپنی ماڈرن تھیٹر کھولی۔جس کے ذریعہ انہوں نے ''دل کی آواز'' بنائی جو ناکام ثابت ہوئی۔۱۹۴۵ء میں اس کمپنی کے ٹوٹ جانے سے بہت نقصان ہوا۔جس کے چلتے انہوں نے پھر سے قلم کو ذریعہ معاش بنایا۔اس لئے وہ مشہور فلمی رسالے ''شمع'' اور نیم ادبی رسالے ۲۰ ویں صدی میں سنسنی خیز ناول اور افسانے لکھے۔

کرشن چندر نے ۱۹۳۹ء میں اپنی ماں کی پسند سے شریمتی ودیاوتی سے شادی کی اور ان سے تین بچے ہوئے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا وہ اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن نہیں تھے۔۱۹۵۳ء میں ان کی ملاقات سلمی صدیقی سے ہوئی۔انہیں ۱۹۶۹ء میں پدم بھوشن ایوارڈ سے نوازا گیا۔تین بار دل کے دورے پڑنے کی وجہ سے ان کا انتقال ہوا۔

افسانہ نگاری:

کرشند چندر نے جن دِنوں لکھنا شروع کیا اُردو افسانے پر رومانی اثرات باقی تھے، پریم چند اپنا تاریخی رول انجام دے کر اُردو افسانے کو عروج سے آشنا کروا چکے تھے۔''انگارے'' ایک انقلاب برپا کر چکا تھا۔کرشن چندر نے ۱۹۳۲ء میں باضابطہ لکھنا شروع کیا۔ترقی پسند تحریک اور کرشن چندر کی افسانہ نگاری کی ابتدا

تقریباً ایک ساتھ ہوئی۔ ان دنوں مقامی رنگ کی بہت اہمیت تھی۔ پریم چند نے دیہات کی زندگی کو حقیقت کے سہارے پیش کیا۔ کرشن چندر کا تعلق چوں کہ پنجاب اور جموں سے تھا اس لیے انہوں نے کشمیر کی رومان پرور فضا کی عکاسی کی۔ وہ پریم چند کی تقلید نہ کر سکے۔ پریم چند اتر پردیش اور بہار میں بے مقبول تھے۔ پنجاب میں لوگ ان سے واقف ضرور تھے لیکن ان کا اثر اس طرح قبول نہیں کیا تھا۔ کرشن چندر نے کسی کا اثر قبول کیے بغیر وہی لکھا جو کچھ انہوں نے محسوس کیا۔

کالج کے زمانے میں انہیں لاہور اور جموں کے درمیان سفر کرنا پڑتا تھا یہی سفر ان کے ابتدائی افسانوں کا موضوع بنا۔ انہوں نے کشمیر کے رومان پرور فضا کے پس منظر میں افسانے لکھنا شروع کیا۔ وہ لکھگتے ہیں:

''پہلی چار کہانیاں مینڈر میں لکھیں، ''جہلم میں ناؤ پر''، '' آنگی''، ''مصور کی موت''، ''یرقان'' میرے ایک ناول کا پس منظر بھی مینڈر رہے۔'' [مٹی کے صنم۔ص ۱۷۱]

ان کا پہلا افسانوں مجموعہ ''طلسم خیال'' ہے۔ اس میں شامل افسانوں کی فضا رومانی ہے۔ اس میں جھیلیں، جنگل، سرسراتی ہوائیں، لہلہاتے مرغ زار، دریا، شکارے، مہکتے پھول، چہکتے پرندے، شمشاد و صنوبر کے نرم و نازک سائے، اخروٹ، سیب، شفتالو اور ناسپاتی کے درخت، بادلوں کی آنکھ مچولی، پورے چاند کی رات، چری کے پھول اور زعفران کے شگوفے ہیں۔ اس پس منظر میں دو حسین دھڑکتے ہوئے دل، چاند کو چھونے اور پھول پی جانے کی باتیں، درد کسک غم ناک فضا، افسردگی کے ماحول میں آنگی، بگی، گومتی اور شیاما جیسی خوب صورت لڑکیاں جو کسی اجنبی پردیسی کی بے وفائی کا شکار ہیں۔ ان افسانوں میں مظاہر فطرت کو کرداروں جیسی حیثیت حاصل ہے۔ جہلم میں ناؤ پر، آنسوؤں والی، بندوالی، بچپن ٹوٹے ہوئے تارے وغیرہ ان کے اہم ابتدائی رومانی افسانے ہیں۔ کرشن چندر کی یہ رومانیت، رومانی افسانہ نگاروں سے یکسر مختلف تھی۔ اس رومانیت میں تصنع نہیں تھا۔ ان افسانوں میں انہوں نے بہترین منظر نگاری کی ہے۔

کرشن چندر نے علامتی افسانے بھی لکھے لیکن یہ ان معنوں مین علامتی افسانے نہیں ہیں جو ۱۹۶۰ء کے بعد کے افسانہ نگارون نے لکھے ان افسانوں کا پورا وجود علامی نہیں ہوتا۔ پانی کا درخت، غالیچہ، مردہ

سمندر، مہنجو داڑو کا خزانہ، ٹیڑھی میڑھی بیل اور پالنا علامتی افسانوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ کرشن چندر نے سائنس فکشن بھی لکھا۔ میں اور روبوٹ، ربڑ کی عورت، ہائیڈروجن بم کے بعد، ہوا کے بیٹے، کالا سورج، آسمان بنانے والے نوادر ایسے افسانے ہیں جن میں سائنسی ایجادات کو تخیل کے ساتھ برتا گیا لیکن وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔

کرشن چندر کے اسلوب میں دو دھارے ہیں۔ ایک رومانیت کا دوسرا اشترا کی حقیقت نگاری کا.....

وہ آخر تک رومان پسند رہے۔ خطابت، انشا پردازی، اور خیال آرائی ان کے فن کے ضروری جزو ہیں۔ وہ ایک ایسے فن کار ہیں جس کا دل گرد و پیش میں ہونے والی لوٹ کھسوٹ اور استحصال کو دیکھ کر رو پڑتا ہے۔ وہ پیچ و تاب کھاتے ہیں لیکن مایوس نہیں ہوتے وہ ایک دردمند دل رکھتے تھے اور روشن مستقبل پر ان کا یقین تھا۔ کرشن چندر کا اسلوب دلکشی رکھتا تھا۔ جہاں عورت اور فطرت کے حسن کی بات نکلتی ان کا قلم روانی سے چلنے لگتا۔ و حسین تشبیہات اور نادر استعارات کا ڈھیر لگا دیتے تھے۔ وہ بڑی خوب صورت پیکر تراشی کرتے تھے۔ ان کا قلم شاعری کی حدوں کو چھونے لگتا تھا۔ کرشند چندر کو زبان و بیان پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ وہ زبان کے خلاقانہ استعمال سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اپنے اسلوب کی وجہ سے سب سے منفرد دکھائی دیتے تھے۔

آخر دور میں کرشن چندر کی توجہ افسانوں کی بجائے ناولوں کی طرف ہوگئی تھی دل کا دورہ پڑنے کے بعد ڈاکٹروں نے انہیں فکر انگیز افسانے اور ناول لکھنے سے منع کر دیا تھا۔ لکھنا ان کی ضرورت بھی تھی اور مجبوری بھی وہ ہلکے پھلکے افسانے لکھنے لگے۔ اس کے باوجود انہوں نے ''آدھے گھنٹے کا خدا'' اور ''اشوک کی موت'' جیسے خوب صورت افسانے لکھے جس میں فلسفۂ وجودیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ کرشن چندر کے یہاں اعلیٰ معیاری اور پست دونوں طرح کے افسانے ملتے ہیں لیکن اپنے اسلوب، انسان دوستی، وسیع المشربی اور ہمہ گیر آفاقیت کی وجہ سے کرشن چندر کا شمار صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔

8.4 خصوصیات

ا)۔ اس افسانہ کا موضوع سماج کے نچلے طبقہ کے ساتھ اعلیٰ طبقہ کا غیر ہمدردانہ رویہ اور بے حسی اور سفا کی ہے۔

۲)۔ اس افسانہ میں طبقاتی فرق ذات پات اور اونچ نیچ کا نظریہ رکھنے والوں پر گہرا طنز ہے۔

۳)۔کرشن چندر کے افسانوں کے کردار عموماً نچلے طبقہ کے افراد ہوتے ہیں۔
۴)۔کالو بھنگی اپنی فعلی اور بے بسی کے باوجود دوسروں کے مخلصانہ اور بے لوث خدمت کرتا ہے۔
۵)۔انسانوں اور جانوروں سے بے انتہا محبت کرنے کی وجہ سے کالو بھنگی کا کردار بے مثال اور یادگار بن گیا ہے۔
۶)۔اس افسانہ کی تکنیک بہت عمدہ ہے یعنی راست مکاطبت کے بجائے شخصیت نگاری اور اینٹوں کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔
۷)۔اس افسانہ میں خوبصورت تشبیہات اور استعارات کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔
۸)۔انسانی جذبات واحساسات کا فطری اظہار اس افسانہ میں ملتا ہے۔
۹)۔کرشن چندر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ سماج کے اس بات کا احساس دلایا ہے کہ طبقاتی فرق، ذات پات اور اونچ نیچ کے نظریہ کے کاتمہ کے لئے سماج کے ہر فرد کو اپنا ذہن بدلنے کی اشد ضرورت ہے۔

8.5 افسانہ ''کالو بھنگی''

میں نے اس سے پہلے ہزار بار کالو بھنگی کے بارے میں لکھنا چاہا ہے، لیکن میرا قلم ہر بار سوچ کر رُک گیا ہے کہ کالو بھنگی کے متعلق لکھا ہی کیا جا سکتا ہے۔ مختلف زاویوں سے میں نے اس کی زندگی کو دیکھنے، پرکھنے، سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں وہ ٹیڑھی لکیر دیکھائی نہیں دیتی جس سے دلچسپ افسانہ مرتب ہوسکتا ہے۔ دلچسپ ہونا تو درکنار، کوئی سیدھا سادا افسانہ، بے کیف و بے رنگ، بے جان مرقع بھی تو نہیں لکھا جا سکتا، کالو بھنگی کے متعلق۔ پھر نا جانے کیا بات ہے، ہر افسانے کی شروع میں ذہن میں کالو بھنگی آن کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے مسکرا کر پوچھتا ہے۔ ''چھوٹے صاحب! مجھ پر کوئی کہانی نہیں لکھو گے؟ ۔۔۔ کتنے سال ہوگئے تمہین لکھتے ہوئے۔''

''آٹھ سال۔''

''کتنی کہانیاں لکھی تم نے؟''

''ساٹھ اور دو باسٹھ۔''

''مجھ میں کیا برائی ہے چھوٹے صاحب ۔تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے ؟ دیکھو کب سے میں اس کہانی کا انتظار میں کھڑا ہوں ۔تمہارے ذہن کے ایک کونے میں مدت سے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں چھوٹے صاحب، میں تو تمہارا پرانا حلال خور ہوں ۔کالو بھنگی، آخر تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے ؟''

اور میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔اس قدر سیدھی سپاٹ زندگی رہی ہے کالو بھنگی کی کہ میں کچھ بھی تو نہیں لکھ سکتا۔اس کے متعلق ۔ یہ نہیں کہ میں اس کے بارے مین کچھ لکھنا ہی نہیں چاہتا۔ دراصل کالو بھنگی کے متعلق لکھنے کا ارادا ایک مدّت سے کر رہا ہوں لیکن کبھی نہیں لکھ سکا۔ ہزار کوشش کے باوجود نہیں لکھ سکا۔اس لئے آج تک کالو بھنگی اپنی پرانی جھاڑو لئے ،اپنے پھٹے پھٹے بدہنیت پاؤں لئے اپنی سوکھی ٹانگوں پر اپنی سوکھی در پریں لیے،اپنے کولھوں کی ابھری ہڈیوں کے لئے ،اپنے بھوکے پیٹ اوراس کی خشک جلد سیاہ سلوٹیں لئے ، اپنے سکڑے ہونٹوں ، پھیلے پھیلے نتھنوں جھریوں والے گال اور اپنی آنکھوں سے نیم تاریک گڑھوں پر ننگی چندیا ابھرے میرے ذہن کو کونے میں کھڑا ہے اب تک ، کئی کردار آئے اور اپنی زندگی بتا کر اپنی اہمیت جتا کر، ڈرامائیت ذہن نشین کرا کے چلے گئے ۔حسین عورتیں اور، خوبصورت تخیلی ہیولے۔شیطان کے چہرے، اس کے ذہن کے رنگ وروغن سے آشنا ہوئے ۔اس کی چار دیوارای میں اپنے دیئے جلا کر چلے گئے ۔لیکن کالو بھنگی بدستور جھاڑو سنبھالے اسی طرح کھڑا ہے، اس نے اس گھر کے اندر آنے والے ہر کردار کو دیکھا ہے۔ اسے روتے ہوئے گڑگڑاتے ہوئے ، محبت کرتے ہوئے ، نفرت کرتے ہوئے ، سوتے ہوئے ، جاگتے ہوئے ، قہقہے لگاتے ہوئے ۔تقریر کرتے ہوئے ، زندگی کے رنگ میں ، ہر نج سے، ہر منزل میں دیکھا، بچپن سے، بڑھاپے سے ،موت تک اس نے ہر اجنبی کو ، اس کے دروازے کے گھر تک دیکھا ہے، اور اسے اندر آتے ہوئے دیکھکر اس کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ وہ خود پرے ہٹ گیا ہے۔ایک بھنگی کی طرح ہٹ کر کھڑا ہو گیا ہے۔حتیٰ کے داستان شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی ، حتیٰ کے کردار اور تماشائی دونوں رخصت ہو گئے ہیں لیکن کالو بھنگی اس کے بعد بھی وہی کھڑا ہے۔اب صرف ایک قدم اس میں آگے بڑھا لیا ہے، اور ذہن کے مرکز میں آ گیا ہے تا کہ میں اچھی طرح دیکھ لوں ۔اس کی ننگی چندیا چمک رہی ہے اور ہونٹوں پر ایک خاموش سوال ہے۔

ایک عرصہ سے سے میں دیکھ رہا ہوں سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں گا۔اس کے بارے میں لیکن یہ بھوت ایسے مانے گا نہیں ۔اسے کئی سالوں سے ٹالا ہے،آج اسے بھی الوداع کہہ دیں۔

میں سات برس کا تھا جب میں نے کالو بھنگی کو پہلی بار دیکھس ۔اس کے بیس برس بعد جب وہ مرا میں نے اسے اسی حالت میں دیکھا۔کوئی ذوق تھا۔وہی گھٹنے،وہی پاؤں ،وہی رنگت ،وہی چہرا،وہی چندیا،وہی ٹوٹے ہوئے دانت،وہی جھاڑو، جو ایسا معلوم ہوتا تھا،ماں کے پیٹ سے اٹھائے چلا آرہا ہے۔کالو بھنگی کی جھاڑو اس کے جسم کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی ۔وہ ہر روز مریضوں کا بول و براز صاف کرتا تھا۔ڈسپنسری میں فنائل چھڑ کتا تھا،پھر ڈاکٹر صاحب اور کمپوڈر صاحب کے بنگلوں میں صفائی کا کام کرتا تھا،کمپوڈر صاحب کی بکری اور ڈاکٹر صاحب کے گائے کو چرانے کے لئے جنگل لے جاتا ،اور دن ڈھلتے ہی انھیں واپس ہسپتال میں آتا اور مویشی خانہ میں باندھ کر اپنا کھانا تیار کرتا اور اسے کھا کر سو جاتا بیس سال سے اسے یہی کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ ہر روز بلا باغہ،اس عرصے میں وہ ایک بھی دن بیمار نہیں ہوا۔یہ امر تعجب خیز ز دور تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ محض اسی کے لئے ایک کہانی لکھی جائے ۔خیر یہ کہانی تو زبردستی لکھوائی جارہی ہے۔آٹھ سال سے میں اسے تالتا آیا ہوں ۔لیکن یہ شخص نہیں مانا۔زبردستی کام لے رہا ہے۔یہ ظلم مجھ پر بھی ہے اور آپ پر بھی۔مجھ پر اس لئے کہ مجھے لکھنا پڑ رہا ہے۔آپ پر اس لئے کہ آپ کو اسے پڑھنا پڑ رہا ہے۔دراصل اس میں کوئی ایسی بات ہے ہی نہیں جس کے لئے اسکے متعلق اتنی سردردی مول لی جائے ،مگر کیا کیا جائے کالو بھنگی کی خاموش نگاہوں کے اندر ایک ایسی کھنچی کھنچی ملتجیانہ کاہش ہے،ایک ایسی مجبور بے زبانی ہے،ایک ایسی محبوس گہرائی ہے کہ مجھے اس کے لئے لکھنا پڑھ رہا ہے اور لکھتے لکھتے یہ بھی سوچتا ہوں کہ اسی کی زندگی کے متعلق کیا لکھوں گا میں ۔کوئی پہلو بھی تو ایسا نہیں جو دلچسپ ہو۔کوئی نہ کوئی ایسا نہیں جو تاریک ہو،کوئی زادیہ ایسا نہیں جو مقناطیسی کشش کا حامل ہو،ہاں آٹھ سال سے میرے ذہن میں کھڑا ہے۔نہ جانے کیوں۔اس مین اس کی ہٹ دھری کے سوا اور تو مجھے کچھ نہیں آتا ۔ جب میں نے آنگی کے افسانے میں چاندنی کے کھلیان سجائے تھے۔اور برقانیت کے رومانی نظریہ سے دنیا کو دیکھا تھا۔اس وقت بھی یہ وہیں کھڑا تھا۔جب میں نے رومانیت سے آگے سفر اختیار کیا اور حسن اور حیوان کی بوقلمونی کیفیتیں دیکھتا ہوٹوٹے ہوئے تاروں کو چھونے لگا،اس وقت

بھی یہ وہیں تھا، جب میں نے بالکونی سے جھانک کران داتاؤں کی غربت دیکھی اور پنجاب کی سرزمین کی خون کی ندیاں بہتی دیکھ کر اپنے وحشی ہونے کا علم حاصل کیا اس وقت بھی یہ وہیں میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا تھا، صم ''بکم''۔ مگر یہ اب جائے گا ضرور۔ اب کے اسے جانا ہی پڑے گا، اب مین اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں اللہ اس کی بے کیفیت ، بے رنگ ، پھیکی ، میٹھی کہانی بھی سن لیجئے تا کہ یہ ہمارے سے دور دفنان ہو جائے ، اور مجھے اس کی غلیظ قرب سے نجات ملے ، اور اگر آج بھی میں نے اس کے بارے میں نہ لکھا اور نہ آپ نے اسے پڑھا تو یہ آٹھ سال بھی یہیں جما رہے گا اور ممکن ہے زندگی بھر یہیں کھڑا رہے۔

لیکن پریشانی تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں کیا لکھا جا سکتا ہے۔ کالو بھنگی کے ماں باپ بھنگی تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے سارے آباواجداد بھنگی تھے اور سینکڑوں برس پہلے سے یہیں رہتے چلے آئے تھے۔ اسی طرح اسی حالت میں۔ پھر کالو بھنگی نے شادی نہ کی تھی ، اس نے کبھی عشق نہ کیا تھا ، اس نے کبھی دور دراز کا سفر نہ کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا ، وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا اور صبح اٹھ کے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ بچپن ہی سے وہ اسی طرح کرتا چلا آیا تھا۔

ہاں کالو بھنگی مین ایک بات ضرور دلچسپ تھی اور وہ یہ کہ اسے اپنی ننگی چندیا پر کسی جانور مثلاً گائے یا بھینس کی زبان پھرانے سے بڑا لطف ہوتا تھا۔ اکثر دوپہر کے وقت میں نے اسے دیکھا ہے کہ نیلے آسمان تلے ، سبز گھاس کے مخملیں فرش پر کھلی دھوپ میں وہ ہسپتال کے قریب ایک کھیت کے مینڈھ پر اکڑوں بیٹھا ہے اور گائے اس کا سر چاٹ رہی ہے۔ بار بار اور وہ وہیں اپنا سر چٹواتا اونگھ اونگھ کر سو گیا ہے ، اسے اس طرح سوتے دیکھ کر میرے دل میں مسرت کا ایک عجیب سا احساس اجاگر ہونے لگتا تھا اور کائنات کے تھکے تھکے غنودگی آمیز آفاقی حسن کا گمان ہونے لگتا تھا ، میں نے اپنی چھوٹی زندگی میں دنیا کی حسین ترین عورتیں ، پھولوں کے تازہ ترین غنچے ، کائنات کے جو خوبصورت ترین مناظر دیکھے ہیں لیکن نا جانے کیوں ایسی معصومیت ، ایسا سکون کسی منظر میں نہیں دیکھا جتنا اس منظر میں کے جب میں سات برس کا تھا اور وہ کھیت بہت بڑا اور وسیع دکھائی دیتا تھا اور آسمان بہت نیلا اور صاف اور کالو بھنگی کی چندیا شیشے کی طرح چمکتی تھی اور گائے کی زبان آہستہ آہستہ اس کی چندیا چاٹتی ہوئی اسے گویا سہلاتی ہوئی کسر کسر کی خوابیدہ آواز پیدا کرتی جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا میں بھی

اسی طرح اپنا سر گھٹا کے اس گائے کے نیچے بیٹھ جاؤں۔ ایک دفعہ میں ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تو والد صاحب نے مجھ وہ پیٹا وہ پیٹا اور مجھ سے زیادہ غریب کالو بھنگی کو وہ پیٹا کہ میں خود کے مارے چیخنے لگا کے کالو بھنگی کہیں ان کی ٹھوکروں سے مرنا جائے لیکن کالو بھنگی کو اتنی مار کھا کے بھی کچھ نہ ہوا، دوسرے روز وہ بدستور جھاڑو دینے کے لئے ہمارے بنگلے میں موجود تھا۔

کالو بھنگی کو جانوروں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ہماری گائے تو اس پر جان چھڑکتی تھی اور کمپونڈر صاحب کی بکری بھی، حالانکہ بکری بڑی بے وفا ہوتی ہے، عورت سے بھی بڑھ کے، لیکن کالو بھنگی کی بات اور تھی۔ ان دونوں جانوروں کو پانی پلائے تو کالو بھنگی، چارہ دکھلائے تو کالو بھنگی، جنگل میں چرائے تو کالو بھنگی......اور روت کو مویشی خانے میں باندھے تو کالو بھنگی وہ اس کے اشارے کو اس طرح سمجھ جاتیں، جس طرح کوئی انسان کسی انسان کے بچے کی باتیں سمجھتا ہے۔ میں کئی بار کالو بھنگی کے پیچھے گیا ہوں، جنگل میں، راستے میں، وہ انھیں بالکل بھی کھلا نہیں چھوڑ دیتا تھا لیکن پھر بھی گائے اور بکری دونوں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چلے آتے تھے، گویا تین دوست سیر کرنے نکلے ہیں۔ راستے میں سبز گھاس دیکھ کر مُنھ مارا تو بکری بھی جھاڑی سے پتیاں کھانے لگتی ہے کے سنبلو توڑ توڑ کر کھا رہا ہے۔ اور بکری کے منہ میں ڈال رہا ہے، اور خود بھی کھا رہا ہے آپ ہی آپ برابر باتیں کئے جا رہا ہے اور وہ دونوں جانور بھی کبھی کبھی غرّا کر، کان پھٹپھٹا کر، کبھی پاؤں ہلا کر کبھی دم دبا کر، کبھی ناچ کر، کبھی گا کر، ہر طرح سے اس کی گفتگو میں شریک ہو رہے ہیں، اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ پھر چند لمحوں کے بعد کالو بھنگی آگے چلنے لگتا تو گائے بھی چرنا چھوڑ دیتی اور بکری بھی جھاڑی سے پرے ہٹ جاتی اور کالو بھنگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی۔ آگے کوئی چھوٹی سی ندی آتی یہ کوئی تھامنّا سا چشمہ، تو کالو بھنگی وہیں بیٹھ جاتا بلکہ لیٹ کر وہیں چشمے کی سطح سے اپنے ہونٹ ملا دیتا اور جانوروں کی طرح پانی پینے لگتا اور اسی طرح وہ دونوں جانور بھی پانی پینے لگتے۔ کیوں کے بچارے انسان تو نہیں تھے کہ اوک سے پی سکتے، اس کے بعد اگر کالو بھنگی سبزے پر لیٹ جاتا تو بکری بھی اس کی ٹانگوں کے پاس اپنی ٹانگیں سُکیڑ کر دعائیہ انداز میں بیٹھ جاتی اور گائے تو اس انداز اس کے قریب ہو بیٹھتی کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کالو بھنگی کی بیوی ہے اور ابھی ابھی کھانا پکا کے فارغ ہوئی ہے۔ اس کی ہر نگاہ میں اور چہرے ہر اتار

چڑھاؤ میں ایک سکون آمیز گرہستی انداز جھلکنے لگتا اور جب وہ جگالی کرنے لگتی تو مجھے معلوم ہوتا گویا کوئی بڑی سگھڑ بیوی کروشیا لیے سوزن کاری میں مصروف ہے اور یا کالو بھنگی کا سوئیٹر بُن رہی ہے۔

اس گائے اور بکری کے علاوہ ایک لنگڑا کتّا تھا، جو کالو بھنگی کا بڑا دوست تھا۔ وہ لنگڑا تھا اور اس لئے دوسرے کتّوں کے ساتھ زیادہ چل پھر نہیں سکتا تھا، اور اکثر اپنے لنگڑے ہونے کی وجہ سے دوسرے کتّوں سے پٹتا، بھوکا اور زخمی رہتا۔ کالو بھنگی اکثر اس کی تیمارداری اور خاطر تواضع میں لگا رہتا اور کبھی تو صابن سے اسے نہلاتا، کبھی اس کی چیچڑیاں دور کرتا، اس کے زخموں پر مرہم لگاتا، اسے مکّی کی روٹی کا سوکھا ٹکڑا دیتا، لیکن یہ کتّا بڑا خودغرض جانور تھا، دن میں صرف دو مرتبہ کالو بھنگی سے ملتا۔ دوپہر اور شام کو۔ اور کھانا کھانے کے اور زخموں پر مرہم لگوا کہ پھر گھومنے کے لئے چلا جاتا۔ کالو بھنگی اور اس کے لنگڑے کتے کی ملاقات بڑی مختصر ہوتی تھی، اور بڑی دلچسپ، مجھے تو وہ کتا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، لیکن کالو بھنگی اس سے ہمیشہ بڑے تپاک سے ملتا تھا۔

اس کے اعلاوہ کالو بھنگی کی جنگل کے ہر جانور، چرند اور پرند سے شناسائی تھی۔ راستے میں اس کے پاؤں میں کوئی کیڑا آجاتا تو وہ اسے اٹھا کر جھاڑی پر رکھ دیتا۔ کہیں کوئی بنولہ بولنے لگتا تو یہ اس کا جواب دیتا تیتر، ستگلہ، گٹاری، لالچڑا، سبز تخی، ہر پرندے کی زبان وہ جانتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ رائبل سنکراتائین سے بڑا پنڈت تھا۔ کم از کم میری جیسے سات برس کے بچے کی نظروں میں تو وہ مجھے اپنے ماں باپ سے بھی اچھا معلوم ہوتا تھا اور پھر وہ مکّی کا بھُٹّا ایسے مزے کا تیار کرتا تھا اور آگ پر اسے اس طرح مدھّم آنچ پر بونتا تھا کہ مکّی کا ہر دانا کندن بن جاتا اور ذائقے میں شہد کا مزہ دیتا، اور خوشبو بھی ایسی سوندھی، میٹھی میٹھی، جیسے دھرتی کی سانس، نہایت آہستہ آہستہ بڑے سکون سے، بڑی مشاقی سے وہ بھُٹّے کو ہر طرف سے دیکھ دیکھ کر اسے بھونتا تھا، جیسے برسوں سے وہ اس بھُٹّے کو جانتا تھا، ایک دوست کی طرح وہ بھُٹّے سے باتیں کرتا۔ اتنی نرم اور مہربانی اور شفقت سے اس سے پیش آتا، گویا وہ بھُٹّا اس کا اپنا رشتہ دار یا سگا بھائی تھا۔ اور لوگ بھی اپنا بھُٹّا بھنتے تھے مگر وہ بات کہاں۔ اس قدر کچے بدذائقہ اور معمولی سے بھُٹّے ہوتے تھے وہ کہ انھیں بس مکّی کا بھُٹّا ہی کہا جاسکتا ہے لیکن کالو بھنگی کے ہاتھوں میں پہنچ وہی کچھ کا کچھ ہو جاتا، اور جب آگ پر سینک کے بالکل تیا ہو جاتا تو بالکل ایک نئی نویلی دُلہن کی طرح عروسی لباس پہنے سنہرا سنہرا چمکتا نظر آتا۔ میری خیال میں خود بھُٹّے کو یہ انداز ہو جاتا کہ کالو

بھنگی اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ ورنہ محبت کے بغیر اس سے بے جان شئے میں رعنائی کیسے پیدا ہوسکتی تھی ۔ مجھے کالو بھنگی کے ہاتھ کے سینکے ہوئے بھُٹّے کھانے کا بڑا مزہ آتا تھا، اور میں انھیں بڑے مزے میں چھپ چھپ کے کھاتا تھا۔ ایک دفع پکڑا گیا تو بڑی ٹھکائی ہوئی۔ بُری طرح۔ بچارا کالو بھنگی بھی مگر دوسرے دن وہ پھر بنگلے پر جھاڑو لئے اسی طرح حاضر تھا۔

اور بس کالو بھنگی کے متعلق اور کوئی دلچسپ بات یاد نہیں آرہی۔ میں بچپن سے جوانی میں آیا اور کالو بھنگی اسی طرح رہا۔ میرے لئے اب وہ کم دلچسپ ہوگیا تھا بلکہ یوں کہیے کے مجھے اس سے کسی طرح کی دلچسپی نہ رہی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس کا کردار مجھے اس کی طرف کھینچتا۔ یہ ان دونوں کی بات ہے جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ میں مطالعہ کے لئے اس سے سوال پوچھتا اور نوٹ لینے کے لئے فائٹن پن اور پیڈ ساتھ رکھ لیتا۔

''اور بس کالو بھنگی تمہاری زندگی میں کوئی خاص بات ہے؟''

''کیسی چھوٹے صاحب''

''کوئی خاص بات، عجیب، انوکھی، نئی۔''

نہیں چھوٹے صاحب۔'' (یہاں تک تو مشاہدہ صفر رہا۔ اب آگے چلئے ممکن ہے............!)

''اچھا یہ تم بتاؤ بتاؤ تنخواہ لے کر کیا کرتے ہو؟ ہم نے دوسرا سوال پوچھا۔

''تنخواہ لے کر کیا کرتا ہوں'' ....وہ سوچنے لگتا۔ آٹھ روپئے ملتے ہیں مجھے، پھر وہ انگلیوں پر گننے لگتا ہے...... چار روپئے کا آٹا لاتا ہوں ....ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گُڑ، چار آنے کا مصالحہ، کتنے روپئے ہوگئے' چھوٹے صاحب؟''

''سات روپے''۔

''ہاں سات روپے۔ ہر مہینے ایک روپیہ بنیے کو دیتا ہوں۔ اس سے کپڑے سلوانے کے لئے روپے کرج لیتا ہوں نا۔ سال میں وہ جوڑے تا چاہئیں۔ کمبل تو میری پاس ہے۔ خیر، لیکن دو جوڑے تو چاہئیں اور چھوٹے صاحب، کہیں بڑے صاحب ایک روپیہ تنخواہ میں بڑھا دیں تو مجا آجائے۔''

''وہ کیسے؟''

''گھی لاؤں گا ایک روپے کا، اور مکّی کے پراٹھے کھاؤں گا، کبی پراٹھے نہیں کھائے مالک۔ بڑا جی چاہتا ہے۔''

اب بولئے ان آٹھ روپوں پر کوئی کیا افسانہ لکھے۔

پھر جب میری شادی ہوگئی، جب راتیں جوان اور چمک دار ہونے لگتیں اور قریب کے جنگل سے شہد اور کستوار اور جنگلی گلاب کی خوشبوئیں آنے لگتیں اور ہرن چوکڑیا بھرتے ہوئے دکھائے دیتے اور تارے جھکتے جھکتے کانوں میں سرگوشیاں

کرنے لگتے اور کسی کے رسیلے ہونٹ آنے والے بوسوں کا خیال کرکے کانپنے لگتے۔ اس وقت بھی کہیں کالو بھنگی کے متعلق لکھنا چاہتا اور پنسل کاغذ لے کر اس کے پاس جاتا۔

''کالو بھنگی تم نے بیاہ نہیں کیا؟''

''نہیں چھوٹے صاحب۔''

''کیوں؟''

''اس علاقے میں مَیں ہی ایک بھنگی ہوں اور دور دور تک کوئی بھنگی نہیں ہے چھوٹے صاحب۔ پھر ہماری شادی کیسے ہوسکتی ہے!'' (لیجئے یہ راستہ بھی بند ہوا۔)

''تمھارا جی چاہتا کالو بھنگی؟'' میں نے دوبارہ کوشش کرکے کچھ کریدنا چاہا۔

''کیا صاحب؟''

''عشق کرنے کے لئے جی چاہتا ہے تمھارا؟ شاید کسی سے محبت کی ہوگی تم نے، جبھی تم نے آج تک شادی نہیں کی۔''

''عشق کیا ہوتا ہے چھوٹے صاحب؟''

''عورت سے عشق کرتے ہیں لوگ۔''

''عشق کیسے کرتے ہیں صاحب؟'' شادی تو ضرور کرتے ہیں سب لوگ، بڑے لوگ بھی عشق کرتے

ہو گے چھوٹے صاحب ،مگر ہم نے نہیں سُنا وہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں ۔رہی شادی کی بات وہ میں نے آپ کو بتادی۔شادی کیوں نہیں کی میں نے ، کیسے ہوتی شادی میری،آپ بتایئے ؟''......(ہم کیا بتائیں خاک)

''تمہیں افسوس چھوٹے صاحب!''

میں نے ہار کر اس کے متعلق لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

آٹھ سال ہوئے کالو بھنگی مر گیا۔وہ جو کبھی بیمار نہیں ہوتا تھا اچانک ایسا بیمار پڑا کہ پھر کبھی بستر علالت سے نہ اٹھا۔اسے ہسپتال میں مریض رکھوادیا تھا۔وہ الگ وارڈ میں رہتا تھا۔کمپونڈر دور سے اس کے حلق میں دوا ڈال دیتا اور ایک چپراسی اس لئے کھانا رکھ آتا ، وہ اپنے برتن خود صاف کرتا ، اپنا بستر خود کرتا ، اور جب وہ مر گیا تو اس کی لاش کو پولس والوں نے ٹھکانے لگا دیا کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔وہ ہمارے ہاں بیس سال سے رہتا تھا لیکن ہم کوئی اس کے رشتہ دار تھوڑی تھے،اس لئے اس کی آخری تنخواہ بھی بحق سرکار ضبط ہو گئی ۔کیوں کہ کوئی اس کا روارث نہ تھا،اور جب وہ مرا اس روز بھی ہسپتال کھلا ، ڈاکٹر صاحب نے نسخے لکھے،کمپونڈر نے تیار کئے ۔مریضوں نے دوا لی اور گھر لوٹ گئے ۔ پھر روز کی طرح ہسپتال بھی بند ہوا اور گھر آ کر سب نے آرام سے کھانا کھایا اور ریڈیو سنا،اور لحاف اوڑھ کر سو گئے ۔صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ پولیس والوں نے از راہِ کرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوا دی ۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کی گائے نے اور کمپاونڈر صاحب کی بکری نے دور وز تک نہ کچھ کھایا نہ کچھ پیا،اور وارڈ کے باہر کھڑی چلاّتی رہیں۔ جانور کی ذات ہے نا آخر۔

''ارے تو پھر جھاڑو لے کر آ پہنچا! آخر کیا چاہتا ہے؟ بتادے ۔کالو بھنگی ابھی تک وہیں کھڑا ہے۔''

کیوں بھئی ، اب تو میں نے سب کچھ جو کچھ میں تمہاری بابت جانتا ہو۔اب بھی یہیں کھڑا ہو، پریشان کر رہے ہو، پریشان کر رہے ہو، اللہ چلے جاؤ ، کیا مجھ سے کچھ چھوٹ گیا ہے؟' کوئی بھول ہو گئی ہے؟ تمہارا ۔نام ۔کالو بھنگی ۔کام ۔بھنگی ۔اس کے علاقے سے کبھی باہر نہیں گئے ، شادی نہیں کی ، عشق نہیں لڑایا۔ زندگی میں کوئی ہنگامی بات نہیں ہوئی۔کوئی اچنبھا معجزہ نہیں ہوا۔ جیسے محبوبہ کے ہونٹوں میں ہوتا ہے۔اپنے بچے کے پیار میں ہوتا ہے غالب کے کلام میں ہوتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تمہاری زندگی میں ۔ پھر میں کیا لکھوں ،اور کیا لکھوں؟ تمہاری تنخواہ آٹھ روپے اور چار روپے کا آٹا ، ایک روپے کا نمک ، ایک روپے کا تمبا کو،

آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گُڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے، اور ایک روپے بنیئے کا، آٹھ روپے ہوگئے، مگر آٹھ روپے مین کہانی نہیں ہوتی۔ آج کل تو پچیس پچاس سو میں نہیں ہوسکتی۔ پھر میں کیا لکھ سکتا ہوں تمہارے بارے میں۔ اب خلجی ہی کو لو، ہسپتال میں کمپونڈر ہیں۔ بتیس روپے تنخواہ پاتا ہے۔ وراست سے نچلے متوسط طبقہ کے ماں باپ ملے تھے، جنھوں نے مڈل تک پڑھا دیا۔ پھر خلجی نے کمپونڈری کا امتحان پاس کرلیا، وہ جوں ہے، اس کے چہرے پر رنگت ہے۔ یہ جوانی، یہ رنگت کچھ چاہتی ہے۔ وہ سفید لٹھّے کی شلوار پہن سکتا ہے۔ سرکار نے اسے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا بنگلہ نما کوارٹر بھی دے رکھا ہے، ڈاکٹر چوک جائے تو فیس بھی جھاڑ لیتا ہے اور خوب صورت مریضاؤں سے عشق بھی کر لیتا ہے، وہ نوراں اور خلجی کا واقعہ تمہیں یاد ہوگا۔ نوراں نتھیاں سے آئی تھی۔ سولہ سترہ برس کی الڑھ جوانی، چار کوس سے سنیما کے رنگین اشتہار کی طرح نظر آجاتی تھی۔ بڑی بے وقوف تھی۔ وہ اپنے گاؤں کے دونو جوں کا عشق قبول کئے بیٹھی تھی۔ جب نمبر دار کا لڑکا سامنے آجائے تو اس کی ہوجاتی اور جب پٹواری لڑکا دیکھائی دیتا تو اس کا دل اس کی طرف مائل ہونے لگتا اور وہ کوئی فیصلہ ہی نہین کرسکتی تھی۔ بالعموم عشق کو لوگ ایک بالکل واضح، قاطع یقینی امر سمجھتے ہیں درآنحالیکہ یہ عشق بہت بڑا متذبذب، غیر یقینی گومگو حالت کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی اس سے بھی ہے، اس سے بھی ہے اور پھر شاید کہیں نہیں ہے اور ہے بھی تو اس قدر وقتی، گرگئی، ہنگامی، کہ ادھر نظر چوکی ادھر عشق غائب۔ سچائی ضرور ہوتی ہے، لیکن ابدیت مفقود ہوتی ہے اسی لئے تو نوراں کوئی فیصلہ نہیں کرپاتی تھی۔ اس کا دل نمبر دار کے بیٹے بھی دھڑکتا تھا، اور پٹواری کے پوت کے لئے بھی، اس کے ہونٹ نمبر دار کے بیٹے کے ہونٹوں سے مل جانے کے لئے بیتاب ہوا ٹھتے اور پٹواری کے پوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی اس کا دل یوں کانپنے لگتا جیسے چاروں طرف سمندر ہو، چاروں طرف لہریں ہوا اور ایک اکیلی کشتی ہو اور نازک سی پتوار ہو اور چاروں طرف کوئی نہ ہو، اور آنکھیں جھکتی جھکتی جھک سی جائیں اور زلفیں بکھرتی بکھرسی جائیں اور گھوم گھوم کر گھومتی ہوئی معلوم دیں، اور بڑے دائرے پھیلتے پھیلتے پھیل جائیں۔ اور پھر چاروں طرف سناٹا پھیل جائے اور دل ایک دم دھک سے رہِ جائے اور کوئی اپنی بانہوں میں بھینچ لے۔ ہائے پٹواری کے بیٹے کو دیکھنے سے ایسی حالت معلوم ہوتی تھی نوراں کی، اور کوئی فیصلہ نہ کرسکتی تھی...... نمبر دار کا بیٹا، پٹواری کا بیٹا، نمبر دار کا بیٹا، وہ دونوں کو زبان دے چکی

تھی۔دونوں سے شادی کا اقرار کر چکی تھی ، دونوں پر مرمٹی تھی ۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آپس میں لڑتے لڑتے لہولہان ہو گئے اور جب جوانی کا بہت سا لہو رگوں سے نکل گیا تو انھیں اپنی بے وقوفی پر بڑا غصہ آیا اور پہلے نمبر دار کا بیٹا نوراں کے پاس پہنچا اور اپنی چھری سے اسے ہلاک کرنا چاہا اور نوراں کے بازو پر زخم آ گئے ،مگر وہ بچ گئی ، کیوں کے وہ بروقت ہسپتال لائی گئی تھی اور یہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔آخر ہسپتال لائی گئی تھی اور یہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔آخر ہسپتال والے بھی انسان ہوتے ہیں......خوبصورتی دلوں پر اثر کرتی ہے انجیکشن کی طرح کمپونڈر پر زیادہ تھا۔نوراں کی تیمارداری میں خلجی دلوجان لگا رہا۔نوراں سے بیگماں ، بیگماں سے ریشماں ،اور ریشماں سے پہلے جانکی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا مگر وہ خلجی کا ناکام معاشقے تے کیوں کہ وہ عورتیں بیاہی ہوتی تھیں، ریشماں کا تو ایک بچہ بھی تھا۔بچوں کے علاوہ ماں باپ تھے،اور خاوند تھے اور خامند کی دشمن نگاہیں تھیں جو گویا خلجی کے سینے کے اندر گھس کے اس کی خواہشوں کے آخری کونے تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔خلجی کیا کر سکتا تھا مجبور ہو کے رہ جاتا،اس نے بیگماں سے عشق کیا، ریشماں سے اور جانکی سے بھی۔وہ ہر روز بیگماں کی بائی کو مٹھائی کھلاتا تھا، ریشماں کے ننھّے بچّے کو دن بھر اٹھائے پھرتا تھا، جانکی کو پھولوں سے بڑی محبت تھی ، وہ ہر روز صبح اُٹھ کے منہ اندھیرے جنگل کی طرف چلا جاتا اور خوب صورت لالہ کے گُنچھے توڑ کر اس کے لئے لاتا ۔بہترین دوئیں ، بہترین غذائیں ، بہترین تیمارداری لیکن وقت آنے پر جب بیگماں اچھی ہوئی تو روتے روتے اپنے خاوند ساتھ چلی گئی اور جب ریشماں اچھی ہوئی تو اپنے بیٹے کو لے کر چلے گئی اور جانکی اچھی ہوئی تو اس نے خلجی کے دئے ہوئے پھول اپنے سینے سے لگائے ،اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پھر اس نے اپنے خاوند کا ہاتھ تھام لیا اور چلتے چلتے گھاٹی کی واٹ میں غائب ہو گئی۔گھاٹی کے آخری کنارے پر پہنچ کر اس نے مُڑ کر خلجی کی طرف دیکھا اور خلجی منہ پھیر کر وارڈ کی دیوار سے لگ کر رونے لگا۔ریشماں کے رخصت ہوتے وقت بھی وہ اسی طرح رویا تھا۔بیگماں کے جاتے وقت بھی وہ اسی شدّت ،اسی خلوص ،اسی اذیّت کے کربناک احساس سے مجبور ہو کر رویا تھا،لیکن خلجی کے لئے نہ ریشماں رُکی ، نہ بیگماں ، نہ جانکی ،اور اب کتنے سالوں کے بعد نا راں آئی تھی اور اس کا دل اسی طرح دھڑکنے لگا تھا اور یہ ڈھڑکن روز بہ روز بڑھتی چلی جاتی تھی۔شروع شروع میں تو نوراں کی حالت غیر تھی ،اس کا بچنا محل تھا مگر خلجی کی انتھک کوششوں سے زخم بھرتے چلے گئے۔ پیپ کم

ہوتی گئی، سڑاند دوہوتی گئی، سوجن غضب ہوتی گئی، نوراں کی آنکھوں میں چمک اوراس کی سپید چہرے پر صحت کی سرخی آتی گئی اور جس روز خلجی نے اس کے بازوؤں کی پٹی اتاری نوراں بے اختیار ایک اظہار تشکر کے ساتھ اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی اوراس کے پاؤں کی پٹی اتری تو اس نے اپنے پاؤں میں مہندی رچائی اور ہاتھوں پر، اور آنکھوں پر کاجل لگایا اور بالوں پر زلفیں سنواری تو خلجی کا دل مسرّت سے چوکڑیاں بھرنے لگا۔ نوراں خلجی کو دل دے بیٹھی تھی۔ اس نے خلجی سے کا وعدہ کر لیا تھا۔ نمبر دار کا بیٹا اور پٹواری کا بیٹا دونوں باری باری کئی دفعہ اسے دیکھنے کے لئے، اس سے معافی مانگنے کے لئے، اس سے شادی کا پیمان کرنے کے لئے ہسپتال آئے تھے، اور نوراں انھیں دیکھ کر ہر بار گھبرا جاتی، کانپنے لگتی، مڑ مڑ کے دیکھنے لگتی اور اس وقت تک اسے چین نہ آتا جب تلک وہ لوگ چلے نہ جاتے، اور خلجی اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہ لے لیتا ۔اور جب وہ بالکل اچھی ہوگئی تو سارا گاؤں اس کو اپنا گاؤں اسے دیکھنے کے لئے امڈ پڑا۔ گاؤں کی چھوری اچھی ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کی مہربانی سے، اور نوراں کی ماں باپ بچھے جاتے تھے اور آج تو نمبردار بھی آیا تھا۔ اور پٹوری بھی اور وہ دونوں خردماغ لڑکے بھی جواب نوراں کو دیکھ دیکھ کر اپنے کئے پر پشیمان ہورہے تھے اور پھر نوراں نے اپنی ماں کا سہارا لیا کاجل میں تیرتی ہوئی ڈبڈبائی آنکھوں سے خلجی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ اپنے گاؤں چلی گئی......سارا گاؤں اسے لینے کے لئے آیا تھا اوراس کے قدموں کے پیچھے پیچھے نمبردار کے بیٹے اور پٹواری کے بیٹے کے قدم تھے اور یہ قدم اور دوسرے قدم اور سیکڑوں قدم جونوراں کے ساتھ چل رہے تھے، خلجی کے سینے کی گھاٹی پر سے گزر گئے، اور پیچھے ایک دھندلی گرد وغبار سے اٹی رہ گذر چھوڑ گئے۔

اورکوئی وارڈ کی دیوار سے لگ کر سسکیاں لینے لگا۔

بڑی خوبصورت رومانی زندگی تھی خلجی کی، خلجی جو مڈل پاس تھا، بتیس روپے تنخواہ پاتا تھا۔ پندرہ بیس اوپر سے کما لیتا تھا۔ خلجی جو جوان تھا، جو محبت کرتا تھا، جو ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا، جو اچھے ہوادیبوں کے افسانے پڑتا تھا اور عشق میں روتا تھا۔ کس قدر دل چسپ اور رومانی اور پُر کیف زندگی تھی خلجی کی لیکن کالو بھنگی کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں سوئے اس کہ:

۱۔کالو بھنگی نے بیگماں کی لہو اور پیپ سے بھری ہوئیں پٹیاں دھوئیں۔

۲۔کالو بھنگی نے بیگماں کا بول و براز صاف کیا۔

۳۔کالو بھنگی نے ریشماں کی غلیظ پٹیاں صاف کیں۔

۴۔کالو بھنگی ریشماں کے بیٹے کو مکئی کے بھُٹّے کھلاتا تھا۔

۵۔کالو بھنگی نے جانکی کی گندی دھویں اور ہر روز اس کے کمرے میں فینائل چھڑکتا رہا اور شام سے پہلے وارڈ کی کھڑکی بند کرتا رہا۔اور آتش دان میں لکڑیاں جلاتا رہا تا کہ جانکی کو سردی نہ لگے۔

۶۔کالو بھنگی نوراں کا پاخانہ اٹھاتا رہا۔تین ماہ دس روز تک۔

کالو بھنگی نے ریشماں کو جاتے ہوئے دیکھا،اس نے بیگماں کو جاتے ہوئے دیکھا،اس نے جانکی کو جاتے ہوئے دیکھا،اس نے نوراں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا وہ کبھی دیواروں سے لگ کر نہیں رویا۔وہ پہلے تو دو ایک لمحوں کے لئے حیران ہو جاتا، پھر اسی حیرت سے اپنا سر کھُجانے لگتا اور جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ ہسپتال کے نیچے کھیتوں میں چلا جاتا اور گائے سے اپنی چندیا چٹوانے لگتا لیکن اس کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں پھر اور کیا لکھوں تمہارے میں کالو بھنگی،سب کچھ تو کہہ دیا۔جو کچھ کہنا تھا۔جو کچھ تم رہے ہو۔تمہاری تنخواہ بتیس روپے ہوتی،تم مڈل پاس یا فیل ہوتے،تمہیں وراثت میں کچھ کلچر،تہذیب کچھ تھوڑی سی انسانی مسرت او راس کی مسرت کی بلندی ہوتی تو میں تمھارے متعلق کوئی کہانی لکھتا اب تمھارے آٹھ روپے میں کیا کہانی لکھوں۔ہر بار ان آٹھ روپوں کو الٹ پھیر کے دیکھتا ہوں۔چار روپے کا آٹا،ایک روپے کا نمک،ایک روپے کا تمباکو،آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گُڑ، چار آنے کا مصالحہ،سات روپے،اور ایک روپیہ بنیے کا۔آٹھ روپے ہو گئے۔کیسے کہانی بنے گی تمھاری کالو بھنگی،تمہارا افسانہ مجھ سے نہیں لکھا جائے گا۔چلے جاؤ۔دیکھو میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

مگر یہ منحوس ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔اپنے اکھڑے پیلے پیلے گندے دانت نکالے اپنی پھوٹی ہنسی ہنس رہا ہے۔

تو ایسے نہیں جائے گا۔اچھا بھئی اب میں پھر اپنی یادوں کی راکھ کرے دیتا ہوں،شاید اب تیرے

لئے مجھے بتیس روپوں سے نیچے اترنا پڑے گا اور بخت یار چپراسی کا آسرا لینا پڑے گا۔ بخت یار چپراسی کو پندرہ تنخواہ کو پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے اور جب کبھی وہ ڈاکٹر یا کمپاونڈر یا ویکسی نیٹر کے ہمراہ دورے پر جاتا ہے تو اسے ڈبل بھتہ اور سفر خرچ ملتا ہے۔ پھر گاؤں میں اس کی اپنی بھی ہے اور ایک چھوٹا سا مکان بھی ہے جس کے تین طرف چیل کے بلند و بالا درخت ہیں اور چوتھی طرف ایک خوبصورت سا باغیچہ ہے، جو اس کی بیوی نے لگایا ہے۔ اس میں اس نے کرم کا ساگ بویا ہے اور پالک اور مولیوں اور شلجم اور سبز مرچیں اور بڑی الیں اور کدّو، جو گرمیوں کی دھوپ میں سکھائے جاتے ہیں اور سردیوں میں جب برف پڑتی ہے اور سبز مر جاتا ہے تو کھے جاتے ہیں۔ بخت یار کی بیوی سب کچھ جانتی ہے، بخت یار کے تین بچے ہیں، اس کی بوڑھی ماں ہے جو ہمیشہ اپنی بہو سے جھگڑا کر کے چلی گئی تھی، گہرا ابر آسمان پر چھایا ہوا تھا، اور پالے کے مارے دانت بج رہے تھے، اور گھر سے بخت یار کا بڑا لڑکا اماں کے چلے جانے کی خبر لے کر دوڑتا دوڑتا ہسپتال آیا تھا اور بخت یار اسی وقت اپنی ماں کو واپس لانے کے لئے کالو بھنگی کو لے کر چل دیا تھا۔ وہ دن بھر جنگل میں اسے ڈھونڈتے رہے۔ وہ اور کالو بھنگی اور بخت یار کی بیوی جواب اپنے کئے پر پشیمان تھی اپنی ساس کو اونچی آوازیں دے دے کر روتی جاتی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا۔ اور سردی سے ہاتھ پاؤں شل ہوئے جاتے تھے پھر بارش شروع ہوگئی، پھر کر بڑی پڑنے لگی۔ اور صرف چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی، اور جیسے ایک گہری موت نے اپنے دروازے کھول دئے ہوں اور برف کی پوریوں کو قطار اندر قطار باہر زمین پر بھیج دیا ہو، برف کے گالے زمین پر گرتے گئے، ساکن، خاموش، بے آواز، سپید مخمل، گھاٹیوں، وادیوں، چوٹیوں پر پھیل گئی۔

''امّاں''...... بخت یار کی بیوی زور سے چلائی۔

''امّاں''...... بخت یار چلاّیا۔

''امّاں''......کالو بھنگی نے آواز دی۔

پھر کالو بھنگی نے کہا......''میرے خیال ہے وہ نکر گئی ہوگی تمھارے ماموں کے پاس۔''

نکّر کے دو کوس ادھر انھیں بخت یار کی امّاں ملی۔ برف گر رہی تھی اور وہ چلی جا رہی تھی۔ گرتی پڑتی، لڑھکتی، ہانپتی، کانپتی، آگے بڑھتی جا رہی تھی اور جب بخت یار نے اسے پکڑا تو اس نے ایک لمحے کے لئے

مزاحمت کی، پھر وہ اس کے بازوؤں میں گر کر بے ہوش ہوگئی۔ بخت یار کی بیوی نے اسے تھام لیا اور راستے بھر اسے باری باری اٹھاتے چلے آئے، بخت یار اور کالو بھنگی اور جب وہ لوگ واپس گھر پہنچے تو بالکل اندھیرا ہو چکا تھا اور انھیں واپس آتے دیکھ کر بچّے رونے لگے۔ اور کالو بھنگی ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا اور اپنا سر کھُجانے لگا، اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا، اور وہاں سے چلا آیا۔ ہاں بخت یار کی زندگی میں بھی افسانے ہیں، چھوٹے چھوٹے خوبصورت افسانے، مگر کالو بھنگی میں تمہارے متعلق اور کیا لکھ سکتا ہوں لیکن تمھارے متعلق اتنا کچھ کر دینے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھارا کیا کیا جائے، خدا کے لئے اب تو چلے جاؤ بہت ستالیا تم نے۔

لیکن مجھے معلوم ہے یہ نہیں جائے گا۔ اسی طرح میرے ذہن پر سوار رہے گا اور میرے افسانوں میں اپنی غلیظ جھاڑو لئے کھڑا رہے گا۔ اب میں سمجھتا ہوں تو کیا چاہتا ہے، تو وہ کہونی سننا چاہتا ہے جو ہوئی نہیں لیکن ہو سکتی تھی، میں تیرے پاؤں سے شوع کرتا ہوں سُن، تو چاہتا ہے تا کہ کوئی تیرے گندے کھر درے پاؤں دھو ڈالے۔ دھو دھو کر ان سے غلاظت دور کرے۔ ان کی بیائیوں پر مرہم لگائے، تو چاہتا ہے، تیرے گھٹنوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں گوشت میں چھپ جائے، تیری رانوں میں طاقت اور سختی آجائے، تیرے پیٹ کی مرجھائی ہوئی سلاٹیں غائب ہو جائے، تیرے کمزور سینے کے گرد غبار سے اٹے ہوئے بال غائب ہو جائیں۔ تو چاہتا ہے کوئی تیرے ہونٹوں مین رس ڈال دے، انھیں گویائی بخش دے۔ تیری آنکھوں میں چمک ڈال دے، تیرے گالوں میں لہو بھر دے، تیری چندیا کو گھنے بالوں کی زلفیں عطا کرے۔ تجھے ایک مصفّا لباس دے دے، تیرے ارد گرد ایک چھوٹی چار دیواری کھڑی کر دے، حسین، مصفا، پاکیزہ، اس میں تیری بیوی راج کرے۔ تیرے بچّے قہقہے لگاتے پھریں، تو کچھ تو چاہتا ہے وہ نہیں کر سکتا۔ میں تیرے ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی روتی ہوئی ہنسی پہچانتا ہوں۔ جب تو گائے سے اپنا سر چٹواتا ہے مجھے معلوم ہے تو اپنی تخیل میں اپنی بیوی دیکھتا ہے جو تیرے بالوں مین اپنی انگلیاں پھیر کر تیرا سر سہلا رہی ہے۔ حتیٰ کے تیری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، تیرا سر جھک جاتا ہے اور تو اس کی مہربان آغوش میں سو جاتا ہے اور جب تو آہستہ آہستہ آگ پر میرے لئے مکّی کا بھُٹّا سینکتا ہے اور مجھے جس محبت اور شفقت سے وہ بھٹا کھلاتا ہے تو اپنے ذہن کی پنہائی میں اس ننھے بچّے کو دیکھ

رہا ہوتا ہے جو تیرا بیٹا نہیں ہے جو ابھی آیا۔ جو تیری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا لیکن جس سے تو نے ایک شفیق باپ کی طرح پیار کیا ہے۔ تو نے اس ے گودیوں میں کھلایا ہے، اس کا منہ چوما ہے، اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر جہان بھر میں دیکھ لو یہ ہے میرا بیٹا...... یہ ہے میرا بیٹا، اور جب یہ سب کچھ نہیں ملا تو تُو سب سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا، اور حیرت سے اپنا سر کھُجانے لگا، اور تیری انگلیاں لاشعوری انداز مین گننے لگیں۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ۔ آٹھ روپے۔ میں تیری وہ کہانی جانتا ہوں جو ہو سکتی تھی، لیکن ہو نہ سکی، کیوں کہ میں افسانہ نگار اور اس کا پڑھنے والا، اور ڈاکٹر اور کمپونڈر اور بخت یار اور گاؤں کے پٹواری اور نمبر دار اور دکان دار حاکم اور سیاست دان اور مزدور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان ہر شخص کی، لاکھوں، کروڑوں، اربوں آومیں کی اکٹھی مدد چاہیے۔ میں اکیلا مجبور ہوں، کچھ نہیں کر سکوں گا۔ جب تک ہم سب مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے، یہ کام نہ ہوگا، اور تو اسی طرح جھاڑو لئے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا، اور میں کوئی عظیم افسانہ لکھ سکوں گا۔ جس میں انسانی روح کے مکمل مسرت جھلک اُٹھے اور کوئی معمار عظیم عمارت نہ تعمیر کر سکے گا جس میں ہماری قوم کی عظیم، اپنی بلندیاں چھو لے اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا جس کی پہنائیوں میں کائنات کی آفاقیت جھلک جائے۔

یہ پھر پوری زندگی ممکن نہیں جب تک تو جھاڑو لئے یہاں کھڑا رہے گا۔

اچھا ہے کھڑا رہ۔ پھر شاید وہ دن کبھی وہ دن آجائے کہ کوئی تجھ سے تیری جھاڑو چھڑا دے اور تیرے ہاتھوں کو نرمی سے تھام کر تجھے قوس قزح کے اس پار لے جائے۔

8.6 خلاصہ

افسانہ کا ہیرو کالو بھنگی ہے۔ لیکن وہ عام بھنگیوں سے مختلف ہے۔ وہ انتہائی شریف النفس ہے کیوں کہ وہ نہ تو شراب پیتا ہے اور نہ تو جوا کھیلتا ہے اور نہ ہی کسی لہولعب میں مبتلا ہے۔ وہ ہر ایک سے محبت کرتا ہے۔ وہ جذبہء ایثار و قربانی سے معمور ہے۔ جھوٹ اور مکر و فریب سے کوسوں دور ہے خدمت خلق اس کا فریضہ ہے، مریضوں کی پھیلائی ہوئی گندگی کو صاف کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی خدمت میں مصروف رہتا ہے۔ اگر چہ وہ ایک معمولی اور نیچ ذات انسان ہے۔ لیکن اس میں کشش، جاذبیت اور انسانیت ہے۔

کالو بھنگی صرف آٹھ روپئے ماہوار پاتا تھا۔اس نے شادی نہیں کی تھی اور نہ ہی اس نے کسی لڑکی سے محبت کی تھی۔ اسے جانوروں سے محبت تھی گائے بکری اور جنگل کے چرند پرند اس کے دوست تھے۔ وہ اپنی خارجی زندگی میں مشین کے پرزے کی طرح اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ وہ روزانہ مریضوں کا پیشاب و پاخانہ صاف کرتا۔ دواخانہ مین فنائل چھڑکتا۔ ڈاکٹر صاحب اور کمپاؤنڈ کی صفائی کرتا تھا۔ ریشماں، بیگماں، نوراں اور جانکی جیسی عورتیں کی پیپ سے بھری ہوئی پٹیاں کھولتا اوران کے زخم صاف کرتا۔ جانکی کے بچے کو بھٹا کھلاتا اوراس کے کمرے میں فنائیل چھڑکتا وہ آتش داں میں لکڑیاں جلاتا تا کہ مریضوں کو سردی نہ لگے۔

جب بختیار چپراسی کی ماں اور بیوی میں جھگڑا ہو جاتا اوراس کی ماں گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔تو ایسے وقت میں وہ بختیار کی ماں کو ڈھونڈ کر لاتا ہے۔لیکن جب وہ خود بیمار ہو جاتا ہے تو اس کے قریب کوئی نہیں جاتا۔ کمپاؤڈر دور سے اس کے حلق میں دوا ڈال دیتا ہے، چپراسی اس کو کھانا دور رکھ چلا جاتا ہے شدید بخار ہونے کے باوجود وہ اپنے برتن خود صاف کرتا ہے آخرکار جب وہ مر جاتا ہے تو کوئی اس کا پُرسانِ حال نہیں ہوتا یہاں تک کہ دواخانے کا عملہ بھی اس پر آنسو نہیں بہاتا۔ کالو بھنگی جو سب کی بے لوث اور مخلصانہ خدمت کرتا تھا لاوارث پڑا ہوا تھا۔اس کی موت پر جانور غمگین اور اشکبار تھے لیکن انسان نہیں۔ یہ سماج کی بے حسی اور سفا کی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

8.7 مشقی سوالات

۱)۔افسانہ ''کالو بھنگی'' کا موضوع کیا ہے؟

۲)۔کالو بھنگی افسانہ کو کس نے تحریر کیا؟

۳)۔جھاڑو کس کی زندگی کا حصہ تھی؟

۴)۔کالو بھنگی کو کس نے بے حد محبت کی تھی؟

۵)۔کالو بھنگی کو ماہوار کتنے روپے تنخواہ ملتی تھی؟

۶)۔کس کی موت پر جانور غمگین تھے؟

۷)۔کالو بھنگی کے ذمہ کون سے کام تھے؟

۸)۔کالو بھنگی کا کیا انجام ہوا؟

۸۔۵۔تفصیلی سوالات

ا)۔افسانہ ''کالو بھنگی'' کا خلاصہ تحریر کیجیے؟

۲)۔''کالو بھنگی کا تنقیدی جائزہ لیجیے؟

۳)۔کرشن چندر کے حلات زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں؟

۴)۔کرشن چندر کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کیجیے؟

8.8 فرہنگ

الفاظ	**معنی**
بھنگی	مہتر
مرقع	تصویروں کی کتاب،البم
تخیل	خیال،تصور
ہیولا	ہر چیز کا مادہ،ڈھیر،ڈھانچہ،خاکہ
بول و براز	پیشاب پاخانہ
ڈسپنری	اسپتال
ملتجیانہ	التجا کرنا،درخواست کرنا،منت سماجت کرنا
محبوس	قیدی،اسیر
بوقلمونی	رنگا رنگی،قسم قسم کا
ان داتا	آقا،مالک
شناسائی	جان پہچان
راعنائی	وضع داری،خوبصورتی،دورنگی

تذبذب	شک وشبہ، حیرانی، بےچینی
مفقود	غائب، ندارد، کھویا ہوا
کربناک	مصیبت، بےقراری، دُکھ
اُنڈ پڑنا	جوش پر آنا، گھر آنا
پشیمان ہونا	شرمندہ ہونا، نادم ہونا
آفاقیت	کائناتی
قوس قزح	دھنک

8.9 مزید مطالعہ کے لیے کتب

۱)۔تاریخ ادب اردو (جلد دوّم) : وہاب اشرفی

۲)۔ادب کا تنقیدی مطالعہ : ڈاکٹر سلام سندیلوی

۳)۔تاریخ ادب اردو (جلد چہارم) : سیدہ جعفر

۴)۔انتخاب افسانہ : مرتبہ اتر پردیش اردو اکیڈمی۔لکھنوء

Shivaji University, Kolhapur

.

رموزِ ادب

RUMOOZ-E-ADAB

اُردو (اختیاری)

URDU (OPTIONAL)

بی۔اے۔سال اوّل

B.A.FIRST YEAR

میقات دوم

SEMESTER SECOND

Edited By

Dr. Shiakh Maheboob (Mahboob Saqib)

(Associate Professor,Dept.of Urdu,Shivaji College,Udgir)

مرتب

ڈاکٹر شیخ محبوب (محبوب ثاقب)

(اسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو شیواجی کالج، اودگیر ضلع لاتور)

w.e.f. 2018-2019

فہرست

1.0 مقاصد

1.1 تمہید

1.2 موضوع کی وضاحت

1.2.1 مولوی عبدالحق

1.2.2 نام دیو مالی (متن)

1.3 مشقی سوالات

1.4 خلاصہ

1.5 اصطلاحات، الفاظ و معنی

1.6 مزید مطالعہ کے لیے کتب

1.0 مقاصد

اس باب کے مطالعہ کے بعد آپ ....

☆ خاکہ کے مفہوم، تعریف سے واقف ہو جائیں گے۔

☆ ڈپٹی نذیر احمد کی ادبی خدمات سے واقف ہوں گے۔

☆ خاکہ کی اہمیت کا اندازہ لگا سکیں گے۔

1.1 تمہید

خاکہ اردو کی نہایت اہم صنف ہے۔خاکہ میں کسی انسان کے عادات واطوار ،اسکی کمزوریاں اور خامیوں کوفن کار اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری کو خاکہ میں پیش کی گئی شخصیت سے ہمدردی ہوجاتی ہے اور لطف بھی حاصل ہوتا ہے۔اردو میں خاکہ نگاری کا آغاز ڈپٹی نزیر احمد پر لکھا ہوا مزرا فرحت اللہ کا خاکہ ''نزیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' سے ہوا۔لیکن خاکہ نگاری کو سمجھنے کے لیے اس کے مفہوم اور تعریف کا ادراک بھی ضروری ہوتا ہے۔اس لیے یہاں اردو خاکہ کے مفہوم اور تعریف پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔

1.2 موضوع کی وضاحت:

1.2 خاکہ کا مفہوم اور تعریف:

خاکہ غیر افسانوی ادب کی بے حد مشہور صنف ہے۔لفظ خاکہ کے لغوی معنی خدوخال ،تصویر کا ڈھانچا، کچا نقشہ،مسودہ تیار کرنا وغیرہ کے ہیں۔خاکہ کو انگریزی میں Sketch کہتے ہیں۔جبکہ ادبی نقطہ نظر سے خاکہ شخصیت کی ہو بہو عکاسی کا نام ہے،اس خاکہ نگاری میں نہ صرف شخصیت کی ظاہری تصویر کشی کی جاتی ہے بلکہ باطن کا بھی احاطہ کیا جاتا ہے۔خاکہ نگاری ایک ایسی صنف ہے جس میں کسی شخص کے حقیقی خدوخال قارئین کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔خاکہ نگاری میں ایک جیتی جاگتی حقیقی شخصیت کی دلکش اور دلچسپ پیرائے

میں تصویر کشی کی جاتی ہے۔ خاکہ نگار واقعات ومشاہدات کے ساتھ ساتھ اپنے تاثرات و قیاسات کو بھی شامل کرتا ہے۔ ایک کامیاب خاکہ نگار کی نگاہ اس مقام کو پا لیتی ہے جس مقام تک عام خاکہ نویسوں کی نگاہ نہیں پہنچتی۔

1.2.1 مولوی عبدالحق :

(۱۸۷۰ء۔۱۹۶۱ء) بابائے اردو، مولوی عبدالحق ایک عظیم خاکہ نگار محقق، ماہرلسانیات، معلم اردو اور انجمن ترقی اردو کے بانی تھے۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی اردو کے فروغ، ترویج اور اشاعت کے لیے وقف کردی۔ ۱۹۱۲ء میں مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری منتخب ہوئے تو انہوں نے انجمن کو ایک فعال ترین علمی ادارہ بنادیا۔ مولوی عبدالحق اورنگ آباد (دکن) میں ملازم تھے وہ انجمن کو اپنے ساتھ لے گئے اور اس طرح اورنگ آباد (دکن) اس کا مرکز بن گیا۔ انجمن کے زیراثر مولوی عبدالحق نے اردو کے نادر نسخے تلاش کر کے انہیں اپنے مقدمات کے ساتھ شائع کیا۔ دو سہ ماہی رسائل، اردو اور سائنس جاری کیے۔ ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا۔ حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی انجمن ہی کی کوششوں کی مرہون منت ہے۔ اس یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ انجمن نے ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا جہاں سینکڑوں علمی کتابیں تصنیف وترجمہ ہوئیں۔ مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری ہی نہیں مجسّم ترقّی اردو تھے۔ ان کا سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، پڑھنا لکھنا، آنا جانا، دوستی، تعلقات، روپیہ پیسہ غرض کہ سب کچھ انجمن کے لیے تھا۔ ۱۹۳۵ء میں جامعہ عثمانیہ کے ایک طالب علم محمد یوسف نے انہیں بابائے اردو کا خطاب دیا جس کے بعد یہ خطاب اتنا مقبول ہوا کہ ان کے نام کا جزو بن گیا۔

☆☆☆

☆مولوی عبدالحق

نام دیو مالی

نام دیو مقبرہ رابعہ دورانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ ذات کا ڈھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔قوموں کا امتیاز منصوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی ، نیکی، حُسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں۔

قیس ہو، کوہ کن ہو، یا حآلی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔ اُس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا۔ لکھتے لکھتے کبھی نظر اُٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اُس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھا پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوتی اور خوشی بھی۔ کام اُسی وقت ہوتا ہے جب اُس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام نہیں بیگار ہے۔ اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا۔ مگر

اسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اُس کے پاس کیا ہورہا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچے کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاش بیٹھتا، اُن کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کررہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے پھلتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا۔ اُن کو توانا اور ٹانٹا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہوجاتا تو اُسے بڑا فکر ہوتا۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے دارغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا۔ اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اُسے بچالیتا اور جب تک وہ تندرست نہ ہوجاتا اُسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اُسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہوگئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اُسے بڑی مہارت تھی۔ دُور دُور سے لوگ اُس کے پاس بچوں کے علاج کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنے باغ ہی میں سے جڑی بوٹیاں لاکر بڑی شفقت اور غور سے اُن کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی اُسے علاج کے لیے بُلا لے جاتے۔ بلا تامُل چلا جاتا۔ مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی چمن کو بھی رکھتا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھونس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ روِشیں باقاعدہ، تھانولے درست، سینچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر، جھاڑنا، بُہارنا صبح شام روزانہ۔ غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم خاں فینسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعِد شخص ہیں اور

دوسروں سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے یا بیڑی پینے لگے یا سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہوگئی ہے۔ لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باولیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے۔ جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے جیسے دِق کے بیمار۔ لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا۔ اور وہ دُور دُور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اَوسان خطا کر رکھے تھے اور انھیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اُس نے راتوں کو بھی ڈھو ڈھو کے لانا شروع کیا۔ پانی کی تھا، یوں سمجھیے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آبِ حیات تھا۔

میں نے اس بے مثل کارگزاری پر اُسے انعام دینا چاہا تو اُس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کے پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو وہ تو ہر حال میں کرنا ہی پرتا ہے۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظمِ تعلیمات کو تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغ بانی مشہور تھا۔ مقبرہ رابعہ دورانی اور اس کا باغ جو اپنی تربیت و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے، مدّت سے ویران اور سُنسان پڑا تھا، وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکاڑ سے پٹا پڑا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سرسبز شاداب اور آباد نظر

آ تا ہے۔ اب دُور دُور سے لوگ اُسے دیکھنے آتے اور سیر و تفریح سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا۔ وہ نام دیو کے بڑے قدر دان تھے۔ اُسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے گیے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگراں کار اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے کیسے، ٹوکیو سے جاپانی، طہران سے ایرانی اور شام سے شامی آئے تھے۔ اُن کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اُپج تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اُس نے نہ فنِ باغ بانی کی کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اُس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا۔ البتہ کام کی دُھن تھی۔ کام سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اُس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اسی کا کام مہا کاج رہا۔ دوسرے مالی لڑتے جھگڑتے، سیندھی شراب پیتے، یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ سیندھی شراب پیتا۔ یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اُس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں لگا رہا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضب ناک جھلڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں اسے شہادت نصیب ہوئی۔

وہ بہت سادہ مزاج، بھولا بھالا اور مُنکسِر المزاج تھا۔ اُس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کے ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی، اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ، وہ دن رات برابر کام کرتا رہا۔ اُسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لیے اُسے اپنے کام پر فخر یا

غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اُسے کسی سے بَیر تھا نہ جلاپا۔ وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام کرتا، آدمیوں، جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا، لیکن اُسے یہ کبھی احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اُس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی، وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو اِستعداد تجھ کو ودیعت کی تھی اُسے کمال تک پہچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔ تھا تو ذات کا ڈھیر پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔

☆☆☆

1.3 مشقی سوالات

۱) نام دیو مالی کو کن چیزوں محبت تھی؟

۲) مصنف نے نادیو کی شخصیت کی کون کون سی خوبیاں بیان کیں ہے۔

۳) نام دیو مالی کے کردار پر روشنی ڈالیے؟

1.4 خلاصہ:

باباۓ اردو مولوی عبدالحق کا شمار اردو کے بے لوث محسنین میں ہوتا ہے ۔انہوں نے اپنی ساری عمر اردو زبان وادب کی خدمت میں صرف کردی۔انہوں نے لکھے ہوۓ خاکہ کا ایک مجموعہ ''چند ہم عصر'' نام سے شائع ہو چکا ہے۔اسی مجموعے میں ایک خاکہ '' نام دیو مالی'' کے عنوان سے شامل ہے۔اس خاکہ میں نام دیو نام کا ایک مالی، جو اورنگ آباد کے مقبرہ رابعہ درانی میں مالی کی حیثیت سے ملازمت کرتا ہے۔مصنف یعنی باباۓ اردو کو اسی مقبرہ کی نگرانی کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ان کے زیرنگیں یہ پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والا مالی' بڑی محنت لگن اور ایمانداری سے اپنی ذمہ داریوں کو بہ حسن وخوبی نبھاتا ہے بلکہ وہ اپنے فرائض سے بڑھ کر کام کرتا ہے۔

باغ کی دیکھ بھال میں اور اس کے حسن کو برھانے میں نام دیو مالی کسی طرح کی کسر نہ چھوڑتا ہے۔اس کی اس بے لوث خدمت سے مصنف بے حد متاثر ہے۔اس لیے انہوں نے ایک معمولی انسان پر خاکہ لکھا ہے۔حالانکہ ہماری زبان میں اکثر خاکے امیروں اور نام چین لوگوں پر لکھنے کا رواج تھا۔باباۓ اردو مولوی عبدالحق نے اس روایت سے نہ صرف انحراف کیا بلکہ اردو خاکہ نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔اس خاکے میں باباۓ اردو نے نام دیو مالی کی شخصیت کے خوبیاں اور اس کی کمزوریوں کو بھی اس طرح ابھارا ہے کہ قاری پڑھتے ہی نام دیو مالی کی خدمات اور ایمانداری اپنے فرائض کو پورا کرنے کا قائل ہو جاتا ہے۔اس خاکہ میں مصنف نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ نیکی اور بھلائی صرف امیروں اور اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والوں کی میراث نہیں ہے بلکہ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے اس معمولی ملازم میں بھی اسی طرح پائی جاتی ہیں۔نام دیو مالی کا اپنے کام اور باغ کی پرورش میں اپنے آپ کو صرف کردینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔بلکہ اس کی قربانیوں کا بہترین مظہر ہے۔مصنف نے اس بات پر بھی ذور دیا ہے کہ کوئی بھی انسان اپنے کام سے محبت کرتا ہو اور بے لوث خدمت کرتا ہے تو وہ بھی عظیم انسانوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

1.5 اصطلاحات،الفاظ ومعنی

ادراک	جاننا، پہچاننا،علم رکھنا
یورش	حملہ کرنا، وار کرنا، مارنا
بیر	دشمنی
جلاپا	جلن
درجۂ کمال	کامیابی کی بلندی

1.6 مزید مطالعہ کے لیے کتب

۱) چند ہم عصر۔۔۔۔مولوی عبدالحق

۲) تاریخ ادب اردو۔۔۔۔نورالحسن نقوی

☆ میرامن باب 2 : سیر پہلے درویش کی۔۔(تلخیص)

فہرست

2.0 مقاصد

2.1 تمہید

2.2 موضوع کی وضاحت

2.2.1 میرامن

2.2.2 سیر پہلے درویش کی (اقتباس)

2.3 مشقی سوالات

2.4 خلاصہ

2.5 اصطلاحات، الفاظ و معنی

2.6 مزید مطالعہ کے لیے کتب

2.0 مقاصد

اس باب کے مطالعہ کے بعد آپ............

☆ داستان کے مفہوم، تعریف سے واقف ہو جائیں گے۔

☆ میرامن کی ادبی خدمات سے واقف ہوں گے۔

☆ داستان کی اہمیت و افادیت کا اندازہ لگا سکیں گے۔

2.1 تمہید

کہانی کہنا اور سننا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ بچہ رات کو سوتے وقت

کہانی سنانے کی ضد کرتا ہے۔اکثر والدین یا سرپرست اپنے بچوں کو چپ کرانے یا سلانے کے لیے کہانی کا سہارا لیتے ہیں۔اس طرح کہانی یا داستان سے ہماری وابستگی ازلی ہے۔داستان اردو کی اہم صنف ہے۔داستان میں ہمارے ماضی کی زندگی ماضی میں زندگی گزارنے والے لوگوں کی امنگیں آرزوئیں،حسرتیں جابہ جانظر آتی ہیں۔

لفظ داستان کے معنیٰ جھوٹا قصہ کے ہیں۔داستان میں طویل قصے ہوتے ہیں جوایک دوسرے میں ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ان میں خیالی باتوں اورناممکن واقعات اور حادثات کا ذکر زیادہ ہوتا ہے۔اس میں مافوق الفطرت عناصر،جیسے جن،پری،جادو،بھوت، دیو، وغیرہ عقل کو حیرت میں ڈالنے والے کرداراور حادثات بیان کئے جاتے ہیں۔جنھیں آج سائنس نہیں مانتا۔لیکن داستان نگاری کو سمجھنے کے لیےاس کے مفہوم اورتعریف کا ادراک بھی ضروری ہوتا ہے۔اس لیے یہاں اردو داستان کے مفہوم اورتعریف پرروشنی ڈالی جارہی ہے۔

2.2 موضوع کی وضاحت:

2.2 داستان کامفہوم اورتعریف:

داستان اردو افسانوی ادب کی بے حد مشہور صنف ہے۔لفظ داستان کےلغوی معنی،جھوٹ کے ہیں،ادبی اصطلاح میں داستان سے مراد ایسا قصہ جو طویل ہو،جس میں بہت سارے خیالی قصے ایک دوسرے میں پیوست کر کے بیان کئے جائیں،ان میں خیالی قصوں اورمعمولی حقیقت کواس انداز میں بیان کیا جائے کہ قاری کی دل بستگی اوردلچسپی کا سامان فراہم کیا گیا ہو۔جسے پڑھ کر وہ اپنے ناممکن خواہشات کوخوابوں میں یا خیالوں میں پورا ہوتے دیکھتا ہو۔داستان میں فوق فطری کرداراورعناصربھی پیش کئے جاتے ہیں۔جنھیں ہمارے دور کا سائنس نہیں مانتا۔اردو کی مشہور داستانیں باغ و بہار،فسانۂ عجائب،فسانۂ آزاد،طلسم ہوش ربا،

وغیرہ ہیں۔

2.2.1 میر امن :

میر امن (اصل نام میر محمد امان اور تخلص امن) فورٹ ولیم کالج سے وابستہ اور جدید اردو نثر کے بانیوں میں ہیں ۔آپ نے باقاعدہ شاعری کبھی نہیں کی ۔خود لکھتے ہیں ۔ ے

نہ شاعر ہوں میں اور نہ شاعر کا بھائی

میر امن کے بزرگ ہمایون کے عہد میں مغلیہ دربار سے وابستہ ہوئے ۔آپ دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں پروان چڑھے ۔مغلوں کے دور آخر میں جب دلی کو احمد شاہ ابدالی نے تاراج کیا اور سورج مل جاٹ نے لوٹا تو میر امن دلی کو خیر آباد کہہ کر عظیم آباد پہنچے ۔وہاں سے کلکتہ گئے کچھ دن بیکاری میں گزرے ۔بالاخر میر بہادر علی حسینی نے ان کا تعارف فورٹ ولیم کالج کے شعبہ ہندوستانی کے سربراہ ڈاکٹر گل کرائسٹ سے کرایا۔انہوں نے میر امن کو کالج میں ملازم رکھالیا۔اور قصہ چہار درویش (فارسی) سلیس نثر میں لکھنے پر مامور کیا۔ چنانچہ ان کی فرمائش پر 1801ء میں باغ و بہار لکھنی شروع کی ۔1802ء میں مکمل ہوئی اور 1803ء میں پہلی بار شائع ہوئی ۔میر امن کی دوسری کتاب گنج خوبی ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی (اخلاق محسنی) کا ترجمہ ہے ۔میر امن کی زندگی کے حالات کسی کتاب یا تذکرہ میں نہیں ملتے ،لہذا ان کی ولادت اور وفات کے بارے میں کسی کو صحت کے ساتھ معلوم نہیں ۔

☆ میر امن دہلوی

سیر پہلے درویش کی (تلخیص)

پہلا درویش دوزانو ہو بیٹھا اور اپنی سیر کا قصہ اس طرح سے کہنے لگا۔ یا معبود اللہ! ذرا ادھر متوجہ ہو، اور ماجرا اس بے سروپا کا سنو!

یہ سرگزشت میری ذرا کان دھر سُنو!
مجھ کو فلک نے کر دیا زیر و زبر سُنو!
جو کچھ کہ پیش آئی ہے شدت مری تئیں
اُس کا بیان کرتا ہوں تم سر بہ سرسُنو!

اے یاران! میری پیدایش اور وطن بزرگوں کا ملکِ یمن ہے۔ والد اس عاجز کا ملک التجار خواجہ احمد نام بڑا سوداگر تھا۔ اس وقت میں کوئی مہاجن یا بیپاری ان کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گُماشتے خرید وفروخت کے واسطے مقرر تھے، اور لاکھوں روپے نقد اور جنس ملک ملک کی گھر میں موجود تھی۔ اُن کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے، ایک تو یہی فقیر جو کفنی سیلی پہنے ہوئے مرشدوں کے حضوری میں حاضر اور بولتا ہے، دوسری ایک بہن جس کو قبلہ گاہ نے اپنے جیتے جی اور شہر کے سوداگر بچے سے شادی کر دی تھی۔ وہ اپنی سُسرال میں رہتی تھی۔ غرض جس کے گھر میں اتنی دولت اور ایک لڑکا ہو، اُس کا لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا ہے؟

مجھ فقیر نے بڑے چاؤ چوز سے ماں باپ کے سائے میں پرورش پائی اور پڑھنا لکھنا سپاہ گری کا کسب وفن، سوداگری کا بہی کھاتہ، روزنامہ، سیکھنے لگا۔ چودہ برس تک نہایت خوشی اور بے فکری میں گزرے، کچھ دُنیا کا اندیشہ دل میں نہ آیا۔ یک بہ یک ایک ہی سال میں والدین قضائے الٰہی سے مر گئے۔

عجب طرح کا غم ہوا، جس کا بیان نہیں کرسکتا۔ ایک بارگی یتیم ہوگیا۔

کوئی سر پر بوڑھا بڑا نہ رہا۔ اس مصیبتِ ناگہانی سے رات دن رویا کرتا، کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ چالیس دن جوں توں کر کٹے، چہلم میں اپنے بیگانے چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ سے فراغت ہوئی، سب نے فقیر کر باپ کی پگڑی بندھوائی، اور سمجھایا۔ دُنیا میں سب کے ماں باپ مرتے آئے ہیں، اور اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے۔ پس صبر کرو۔ اپنے گھر کو دیکھو، اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے، اپنے کاروبار لین دین سے ہوشیار رہو۔ تسلی دے کر وے رخصت ہوئے۔ گماشتے کاروباری نوکر چاکر جتنے تھے آن کر حاضر ہوئے، نذریں دیں اور بولے کوٹھی نقد و جنس کی اپنی نظرِ مبارک سے دیکھ لیجیئے۔ ایک بارگی جو اس دولتِ بے انتہا پر نگاہ پڑی، آنکھیں کھُل گئیں۔ دیوان خانے کی تیاری کو حکم کیا۔ فراشوں نے فرش فروش بچھا کر چھت پردے چلونیں تکلف کی لگا دیں، اور اچھے اچھے خدمت گار دیدار و نوکر رکھے۔ سرکار سے زرق برق کی پوشاکیں بنوا دیں۔ فقیر مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھا۔ ویسے ہی آدمی غنڈے بھانکڑے مفت پر کھانے پینے والے جھوٹے خوشامدی آ کر آشنا ہوئے اور مصاحب بنے۔ اُن سے آٹھ پہر کی صحبت رہنے لگی۔ ہر کہیں کی باتیں اور زٹلیں واہی تباہی ادھر اُدھر کی کرتے اور کہتے اس جوانی کے عالم میں کیتکی کی شراب یا گلِ گلاب کھنچوایئے، نازنین معشوقوں کو بلوا کر اُن کے ساتھ پیجیئے اور عیش کیجیئے۔

غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ ہر دم کے کہنے سُننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا۔شراب ناچ اور جوے کا چرچا شروع ہوا۔ پھر تو یہ نوبت پہنچی کہ سوداگری بھول کر تماش بینی کا اور دینے لینے کا سودا ہوا۔اپنے نوکراور رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی جو جس کے ہاتھ پڑا، الگ کیا گویا لوٹ مچا دی۔ کچھ خبر نہ تھی کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے، کہاں سے آتا اور کیدھر جاتا ہے؟ مالِ مفت دلِ بے رحم۔اس درخرچی کے آگے اگر گنج قارون کا ہوتا تو بھی وفا نہ کرتا۔کئی برس کے عرصے میں ایک بارگی یہ حالت ہوئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ دوست آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچا بھر خون اپنا ہر بات میں زبان سے نثار کرتے تھے، کافور ہو گئے۔ بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں بھینٹ ملاقات ہو جاتی تو آنکھیں چُرا کر منھ پھیر لیتے، اور نوکر چاکر خدمت گار بہلیے ڈھلیت خاص بردار ثابت خانی سب چھوڑ کر کنارے لگے۔کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا جو کہے یہ کیا تمھارا حال ہوا، سوائے غم اور افسوس کے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔

اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسر نہیں جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑاکے کھینچے، تاب بھوک کی نہ لا سکا۔لاچار بے حیائی کا برقعہ منھ پر ڈال کر قصد کیا۔ کہ بہن کے پاس چلیے۔لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد نہ بہن سے کچھ سلوک کیا، نہ خالی خط لکھا، بلکہ اس نے خط خطوط ماتم پُرسی اور اشتیاق کے جو لکھے، ان کا بھی جواب اِس خوابِ خرگوش میں نہ بھیجا۔ اِس شرمندگی سے جی تو نہ چاہتا تھا، پر سوائے اُس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھہرا۔ جوں توں پا پیادہ خالی ہاتھ گرتا پڑتا ہزار محنت سے وہ کئی منزلیں کاٹ کر ہمشیر کے شہر میں جا کر اُس کے مکان پر پہنچا۔ وہ ماں جائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لی اور گلے مِل کر بہت روئی۔ تیل ماش اور کالے ٹکے مجھ پر سے صدقے کیے۔ کہنے لگی "اگر چہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا، لیکن بھیا، تیری یہ کیا صورت بنی؟" اُس کا جواب میں کچھ نہ دے سکا۔آنکھوں میں آنسو، ڈبڈبا کر چُپکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی سے پوشاک سِلوا کر حمام میں بھیجا۔ نہا دھو کر وہ

کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس سے بہت اچھا تکلف کا میرے رہنے کو مقرر کیا۔ صبح کو شربت اور لوزیات حلوا سوہن پستہ مغزی ناشتے کو، اور تیسرے پہر میوے خشک و تر پھل پھلاری، اور رات دن دونوں وقت پلاؤ نان قلیے کباب تحفہ مزے دار منگوا کر اپنے روبرو کھلا کر جاتی۔ سب طرح خاطر داری کرتی۔ میں نے ویسی تصدیع کے بعد جو یہ آرام پایا۔ خدا کی درگاہ میں ہزار ہزار شکر بجالایا۔ کئی مہینے اس فراغت سے گزرے کہ پانو اس خلوت سے باہر نہ رکھا۔

ایک دن وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی، کہنے لگی، اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پُتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجا ٹھنڈھا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں، باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا، لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے گھر میں بیٹھے رہنا اُن کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے، اُس کو دُنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں، خصوصاً اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے بے سبب تمھارے رہنے پر کہیں گے، اپنے باپ کی دولتِ دُنیا کھو کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آپڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمہاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب یہ صلاح ہے کہ سفر کا قصد کرو۔ خدا چاہے تو دن پھریں اور اس حیرانی و مفلسی کے بدلے خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو۔ یہ بات سُن کر مجھے بھی غیرت آئی، اس کی نصیحت پسند کی۔ جواب دیا، اچھا اب تم ماں کی جگہ ہو، جو کہو سو کروں۔ یہ میری مرضی پا کر گھر میں جا کے پچاس توڑے اشرفی کے اصیل لونڈیوں کے ہاتھوں میں لوا کر میرے آگے لا رکھے اور بولی ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے، تم ان روپوں سے جنس تجارت کی خرید کرو۔ ایک تاجر ایماندار کے حوالے کر کے، دستاویز پکی لکھوا لو، اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو، اپنا مال مع منافع سمجھ بوجھ لیجیو یا آپ بیچیو۔ میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا، اسباب سوداگری کا خرید کر ایک بڑے

سوداگر کے سپرد کیا۔ نوشت وخواند سے خاطر جمع کرلی۔ وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر سوار ہوکر روانہ ہوا۔ فقیر نے خشکی کی راہ چلنے کی تیاری کی۔ جب رُخصت ہونے لگا، بہن نے ایک سری پاؤ بھاری اور ایک گھوڑا جڑاؤ ساز سے تواضع کیا، اور مٹھائی پکوان ایک خاص دان میں بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا، اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا، دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر آنسو پی کر بولی، سدھارو! تمھیں خدا کو سونپا، پیٹھ دکھائے جاتے ہو، اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو۔ میں نے فاتحہ خیر کی پڑھ کر کہا، تمھارا بھی اللہ حافظ ہے۔ میں نے قبول کیا۔ وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا، اور خدا کے توکل پر بھروسہ کر کے دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔

☆☆☆

2.3 مشقی سوالات

۱) پہلا درویش کہاں کا رہنے والا تھا، اس نے کس طرح اپنی دولت لٹائی؟

۲) پہلے درویش نے کون کون سے علوم وفنون میں مہارت حاصل کی تھی؟

۳) پہلے درویش کی بہن کے کردار پر روشنی ڈالیے؟

۴) میر امن کے حالاتِ زندگی پر اظہار خیال کیجئے۔؟

2.4 خلاصہ:

میر امن دہلوی دہلی کے رہنے والے تھے اس لیے اپنے نام کے آگے دہلوی لگاتے تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں وہ کلکتہ گئے۔ وہاں فورٹ ولیم کالج میں ترجمہ کا کام انھیں سونپا گیا، اسی دوران انہیں شعبہ ہندوستانی کے صدر ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ایک فارسی داستان 'قصہ ٔ چہار درویش' کا آسان اردو زبان میں ترجمہ کرنے کی ذمہ داری دی گئی۔ میر امن نے

اس قصے کونہایت آسان اور عام فہم اردو میں ترجمہ کیا اوراس داستان کا نام باغ و بہار رکھا۔ باغ و بہار میں چار شہزادوں اورایک بادشاہ کا قصہ ہے۔سیر پہلے درویش کی ، میں پہلے درویش کا قصہ درویش خود ہمیں سنا تا ہے۔کہ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہے اس کی ایک بہن ہے جو کسی دوسرے شہر کے امیر زادے سے بیاہی گئی ہے۔ایک دن اچانک اس کے والدین قضائے الٰہی سے مر گئے۔اور وہ بے پناہ دھن دولت کا مالک بن گیا۔لیکن کاروبار چلانے کا ہنر اس نے نہیں سیکھا تھا۔جس کی وجہ سے اس کی دولت چند ہی روز میں اپنے دوستوں کیساتھ رنگ رلیاں منانے میں لٹ گئی۔اب دولت نہ تھی تو اس کے وہ دوست واحباب جو اس کے منہ کی کاٹی روٹی بھی کھا جاتے تھے۔ایسے یار دوست بھی، کترا کر منہ موڑنے لگے۔وہ تنہا پریشان مارا مارا پھرنے لگا۔کچھ روز فاقے میں گزرے۔ایک دن خیال آیا۔کہ اس کی ایک بہن بھی ہے اور اچھے گھرانے میں بیاہی گئی ہے۔اس نے اپنی بہن کے گھر جا کر اس سے مدد مانگنے کا ارادہ کیا اور کئی دنوں کی مسافت کے بعد وہ بہن کے گھر پہنچا۔بہن نے بھائی کی یہ حالت دیکھی تو گلے سے لگا کر خوب روئی۔پھر اسے اپنے گھر میں جگہ دی چند دنوں میں اچھے دن پھر آئے۔تو بہن نے بھائی کو صلاح دی کہ تم خود سوداگر کے بچے ہو۔میں کچھ روپے تمہیں دیتی ہوں۔ان سے تم اپنا کاروبار شروع کرو۔بہن کی رائے پر عمل کرتے ہوئے پہلا درویش سوداگری کرنے ملک دمشق پہنچتا ہے۔کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی، جاری رہتی ہے۔آگے کی کہانی جاننے کے لیے باغ و بہار کا مطالع کرنے پر قاری مجبور ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

2.5 اصطلاحات،الفاظ ومعنی

ملک التجار	سب سے بڑا تاجر
خشکی کی راہ	زمینی راستہ
ہمشیرہ	بہن

فراغت	خالی ہونا، بے بوجھ ہونا
سوداگر	تاجر، تجارت کرنے والا
فراش	فرش، بساط، بستر
گماشتے	منیجر، کارندے

2.6 مزید مطالعہ کے لیے کتب

۱) باغ و بہار۔۔۔۔میر امن دہلوی
۲) تاریخ ادب اردو۔۔۔۔نورالحسن نقوی
۳) اردو کی نثری داستانیں۔۔۔گیان چند جین

فہرست

3.0 مقاصد

3.1 تمہید

3.2 موضوع کی وضاحت

3.2.1 مرزا فرحت اللہ بیگ

3.2.2 مردہ بدست زندہ است

3.3 مشقی سوالات

3.4 خلاصہ

3.5 اصطلاحات، الفاظ و معنی

3.6 مزید مطالعہ کے لیے کتب

3.0 مقاصد

اس باب کے مطالعہ کے بعد آپ............

☆ انشائیہ کے مفہوم، تعریف سے واقف ہو جائیں گے۔

☆ مرزا فرحت اللہ بیگ کی ادبی خدمات سے واقف ہوں گے۔

☆ انشائیہ کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگا سکیں گے۔

3.1 تمہید

انشائیہ اردو ادب کی پسندیدہ صنف ہے۔غیر افسانوی نثر میں جس طرح خاکہ نگاری کو اہمیت حاصل ہے اسی طرح انشائیہ کو بھی حاصل ہے۔ یہ اردو ادب کی جدید نثری اصناف میں بڑے دلچسپی سے پڑھی جانے والی صنف ہے۔اس میں کسی بھی موضوع پر لکھنے کی اجازت ہے۔ یہ ایک طرح کا مضمون ہی ہے لیکن عام مضمون سے ہٹ کر بھی ہے۔ انشائیہ کو اردو میں مزے دار صنف کے طور پر لکھا اور پڑھا جاتا ہے لیکن اس میں مزہ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔اس کا قاری لطف کے ساتھ ساتھ سبق بھی حاصل کرتا ہے۔یعنی زندگی بسر کرنے کے لیے اسے ایک نئی روشنی ملتی ہے۔انشائیہ نگاری کو سمجھنے کے لیے اس کے مفہوم اور تعریف کا ادراک بھی ضروری ہوتا ہے۔اس لیے یہاں اردو انشائیہ کے مفہوم اور تعریف پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

3.2 موضوع کی وضاحت:

3.2 انشائیہ کا مفہوم اور تعریف:

لفظ انشائیہ کے لغوی معنیٰ نثر کا فن، مضمون نگاری، کچھ بات دل سے نکالنا وغیرہ کے ہیں۔اردو میں غیر افسانوی ادب کی بے حد مشہور صنف ہے۔ادبی اصطلاح میں انشائیہ کے لغوی میعنی "عبارت" کے ہیں۔انشائیہ نثری ادب کی وہ صنف ہے جو مضمون کی مانند لگتی ہے مگر مضمون سے الگ انداز رکھتی ہے۔انشائیہ میں انشائیہ نگار آزادانہ طور پر اپنی تحریر پیش کرتا ہے، جس میں اس کی شخصیت کا پہلو نظر آتا ہے۔اور بغیر کسی خاص نتیجہ کے بات کو ختم کرتا ہے، یعنی نتیجہ کو قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔

3.2.1 مرزافرحت اللہ بیگ :

مرزا فرحت اللہ بیگ (پیدائش: ستمبر 1883ء وفات: 27 اپریل 1947ء) اردو کے ممتاز مزاح نگار تھے۔ مرزا فرحت اللہ 1883ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حشمت بیگ تھا۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول دہلی میں حاصل کی۔ بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد حیدرآباد دکن میں ملازمت اختیار کر لی۔ اور وہاں مختلف عدالتی عہدوں پر فائز رہے۔ آخر میں مددگار معتمد داخلہ (معاون ہوم سیکریٹری) ہو گئے اور اسی عہدہ سے وظیفہ یاب ہوئے۔ حیدرآباد کی ادبی صحبتوں نے مرزا میں ادبی ذوق کو جلا بخشی اور ان کا شوخ قلم مزاح نگاری میں جولانیاں دکھانے لگا۔ فرحت اللہ بیگ کا سب سے پہلا مضمون عصمت بیگ کے فرضی نام سے شائع ہونے والے رسالہ "افادہ" میں چھپا۔ اس کا عنوان ہم اور ہمارا امتحان تھا۔

1937ء سے باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ اگرچہ انہوں نے ہر موضوع تاریخ، تحقیق، سوانح وغیرہ پر لکھا۔ مگر مزاحیہ رنگ غالب رہا۔ ان کے مضامین کے مجموعے (مضامین فرحت) کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ ان کی کئی تخلیقیں مثلاً میری داستان، دہلی کا یادگار مشاعرہ، نذیر احمد کی کہانی، پھول والوں کی سیر، نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر اردو ادب میں یادگار رہیں گی۔ فرحت اللہ بیگ نے 1947ء میں وفات پائی۔

☆ مرزا فرحت اللہ بیگ

مردہ بدست زندہ است

زمانے نے خلوص دل سے مٹا دیا ہے۔ سچی محبت کی جگہ ظاہر داری نے لے لی ہے۔ نہ اب جینے میں کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دنیاداری ہی دنیاداری رہ گئی۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تو ایسا رنج ہوتا تھا گویا اپنا عزیز مرگیا ہو۔ اب کوئی اپنا بھی مر جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مرگیا۔ جنازے کے ساتھ جانا اب رسماً رہ گیا ہے۔ صرف اس لیے چلے جاتے ہیں کہ یہ نہ کہیں کہ ''واہ جیتے جی تو دوستی و محبت کا یہ دم بھرا جاتا تھا مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ دیکھا کہ کون مرگیا۔'' اب رہی دل کی حالت تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے۔ آیئے میرے ساتھ آیئے آج کل کی میتوں کا رنگ بھی دکھا دوں۔

یہ لیجیے سامنے ہی کے مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہوگیا ہے کوئی بڑے شخص ہیں۔ بڑے آدمی جمع ہیں۔ موٹریں بھی ہیں، گاڑیاں بھی ہیں۔ غریب بھی ہیں، امیر بھی۔ غریب تو اندر جا بیٹھے ہیں کچھ پڑھ بھی رہے ہیں، جتنے امیر ہیں یا تو اپنی اپنی سواریوں میں جا بیٹھے ہیں یا دروازے پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔ غریب سلام کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔ امیر باہر والوں ہی میں مل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہلا سوال یہ ہی ہوتا ہے۔ ''کیا مرگئے؟ بھئی ہمارے تو بڑے دوست تھے'' اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی۔ لیجیے تعزیت ختم ہوئی اور رنجِ دلی کا اظہار ہو چکا۔ اب دنیا بھر کے قہقہے چھڑے قصے چھڑے ایک دوسرے سے نہ ملنے کی شکایت ہوئی۔ دفتر کی کاروائیاں دریافت کی گئیں۔ ملک کی خبروں پر رائے زنی ہوئی۔ غرض اس بات چیت کا یہاں تک کا سلسلہ کھچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا۔ یہ دیکھتے ہی دروازے کی بھیڑ چھنٹ گئی۔ کچھ اِدھر ہو لئے کچھ اُدھر آگے آگے جنازہ ہے اس کے پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں۔ ابھی چند ہی قدم چلے

ہوں گے کہ ان کے ساتھ والوں میں تقسیم ہوئی اور چپ چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی کو بھی نہ معلوم ہوا کہ کب ہوئی اور کیوں کر ہوئی۔ جن کو پیچھے رہنا تھا انھوں نے چال آہستہ کر دی جسے ساتھ جانا تھا وہ تیز چلے، غرض ہوتے ہوتے یہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے آگے تو وہ رہے جو مرنے والے کے عزیز تھے یا جن کو جنازہ اٹھانے کے لیے اُجرت پر بلایا گیا تھا۔ اس کے پیچھے وہ لوگ رہے جن کے پاس یا تو سواریاں نہ تھیں یا شرما شرمی پیدل ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔ آخر میں وہ طبقہ ہوا جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا جاتا اور اگر پیدل چلنے والوں میں کوئی عہدہ دار ہیں تو غرض مندوں سے ان کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ایک آیا جھک کر سلام کیا گھر بھر کی مزاج پرسی کی۔ مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کیے۔ اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹری کی کچھ برائیاں بیان کیں۔ اگر حکیم کے علاج سے مرا ہے تو طبابت کی خرابیاں ظاہر کیں اور اسی سلسلہ میں اپنے واقعات بھی بیان کر گئے۔ ان سے پیچھا نہ چھٹتا تھا کہ دوسرے صاحب آ گئے اور انھوں نے بھی وہی دنیا بھر کے قصے شروع کیے غرض اسی طرح جوڑی بدلتے بدلتے مسجد تک پہنچ ہی گئے۔ یہاں ہمراہیوں کی پھر تقسیم ہوئی۔ ایک تو ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور اب بھی نماز پڑھیں گے اور دوسرے وہ ہیں جو نہا دھو کر کپڑے بدل اسی جنازے کے لیے آئے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو اپنی وضعداری پر قائم ہیں۔ یعنی نماز نہ کبھی پڑھی ہے اور نہ ہی اب پڑھیں گے دور سے مسجد کو دیکھا اور انھوں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جنازہ مسجد تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ ان کو کسی دیوار کسی موٹر یا گاڑی کی آڑ مل گئی۔ یہ وہیں کھڑے ہو گئے۔ اور سگریٹ پی کر اور پان کھا کر انھوں نے وقت گزار دیا۔ ہاں اس بات کا انتظام رکھا کہ نماز ختم ہونے کی اطلاع فوراً مل جائے۔ ادھر نماز ختم ہوئی ادھر یہ لوگ مسجد کے دروازے کی طرف بڑھے۔ ادھر جنازہ نکلا ادھر یہ پہنچے۔

بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہے ہیں۔ یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا۔ اب راستہ والوں کی سنئے۔ اگر میت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا۔ اگر جنازہ کے ساتھ بڑے لوگ ہوئے تو دوکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ آئے یا مرنے والے کا نام معلوم کیا۔ مرض دریافت کیا اور واپس ہو گئے۔ گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر حیات و ممات ان ہی کو تفویض کر دیا ہے اور یہ صرف اسی لیے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں سے

مرنے والے کا نام خارج کر دیں۔ موٹر نشینوں کی کچھ نہ پوچھو یہ تو سمجھتے ہیں کہ سڑکیں انھیں کے لیے بنی ہیں۔ کسی جنازہ کا سڑک پر سے گزرنا ان کو زہر معلوم ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو۔ موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑتی ہے اور ظاہر ہے رفتار کم ہونے سے پیٹرول کا خرچ زیادہ ہوتا ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ مرکر ان کے پیٹرول کا نقصان کرے۔ شوفر ہے کہ ہارن پر ہارن بجا رہا ہے۔ لوگ ہیں اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ جنازہ ہے کہ ٹیڑھا ترچھا ہو رہا ہے مگر موٹر والے صاحب کی موٹر جس رفتار سے آ رہی ہے اسی رفتار سے نکلے گی۔

یہ لوگ تو وہ ہیں کہ قیامت آئے گی تو اس کو بھی ہارن بجا بجا کر سامنے سے ہٹانے کی کوشش کریں گے۔ خیر کسی نہ کسی طرح یہ سب مصیبتیں اٹھا کر جنازہ قبرستان پہنچ ہی گیا۔

قبرستانوں کی حالت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ جائے عبرت کو جائے وحشت بنا دیا۔ قبرستان کیا ہے خاصا ایک جنگل ہے۔ ایک طرف ٹوٹی پھوٹی ایک جھونپڑی پڑی ہے اس میں ایک سقّے صاحب ان کی بیوی دس بارہ بچے، پانچ چھ بکریاں، ایک لنگڑا ٹٹو، سو دو سو مرغیاں، پانچ چھ بلیاں اور خدا معلوم کیا کیا بلّیات بھرے پڑے ہیں۔ جس حصے میں قبریں ہیں وہاں کی گھاس بڑھ کر کمر کمر ہو گئی ہے۔ دیواروں کو توڑ کر لوگوں نے راستے بنا لئے ہیں نیم پیپل اور خدا معلوم کس کس قسم کے درخت قبروں کے تعویز اور چبوترے توڑ کر نکل آئے ہیں۔ کوئی قبر دھنس کر کنواں بن گئی ہے۔ کسی کا تعویز ہی غائب ہے۔ کسی چبوترے کی اینٹیں نکل کر جھونپڑی میں خرچ ہو گئی ہیں۔ غرض کس مپرسی نے اس حصے کی عجیب حالت کر دی ہے۔ دوسرا حصہ جس میں قبریں نہیں ہیں وہ کسی قدر صاف ہے اور کیوں نہ ہو، پہلے حصہ کا مردوں سے تعلق ہے اور دوسرے کا زندوں سے۔ مردے تو اپنی قبر کی مرمت کرنے یا کرانے سے رہے۔ ان کے جو عزیز ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس فضول چیز پر کون کچھ خرچ کرے۔ جن کی زمین ہے وہ تو روپے کھرے کر چکے۔ اب اُن کو اس سے کیا تعلق۔ دوسرے حصے کا صاف رکھا جانا اصول تجارت پر مبنی ہے۔ جب گاہکوں کو گھیرنے کے لیے دوکاندار اپنی ایک ایک چیز جھاڑ پونچھ کر رکھتا ہے۔ یہ تو قبرستان والے اپنی پچاس روپیہ گز والی زمین کو کیوں نہ صاف رکھیں۔ خریدتے وقت اچھا مال دیکھ لو پھر تم جانو اور تمھارے مردے جانیں۔

میاں سقّہ رہتے تو قبرستان میں ہیں مگر پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں۔ اِدھر لوگ

قبر پر پھول چڑھا کر گئے اور ادھران کے بچے سب کے سب سمیٹ لائے۔رات بھر پھول بستر پر رہے۔صبح باسی پھول لے جا کر قبر پر چڑھا دیئے۔خیر کیا حرج ہے؟ زندوں کا کام بھی نکل گیا۔مردے بھی خوش ہو گئے۔ اس گھر میں سل بٹہ خریدنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔قبر کے اچھے سے اچھے پتھر پر مصالحہ پیس لیا۔اگر کچھ دنوں بعد کوئی دیکھنے بھالنے نہ آیا تو پتھرا کھاڑ جھونپڑی کے پاس لا رکھا۔بکریاں قبروں پر قلانچیں مارتی پھرتی ہیں۔ مرغیاں کچھ قبروں کو کریدرہی ہیں بچے یا تو چبوتروں پر لوٹ ماررہے ہیں۔یا تعویذوں کو گھوڑا بنائے بیٹھے ہیں ۔بچیاں قبروں پر بیٹھی اینٹیں اور ٹھیکریاں پیس رہی ہیں۔کسی بچارے کی قبر پر چادر پڑی ہے۔اس پر بی سقنی نے گیہوں سکھانے ڈال دیئے ہیں۔ٹٹوانی کو ایک اگلی اور ایک پچھلی ٹانگ باندھ کر چھوڑ دیا ہے۔وہ قبروں میں گھاس چرتی پھرتی ہے اس کے اِدھر اُدھر پھدکنے سے کسی قبر کی اینٹ گری کسی کا چونا گرا کسی کا پتھر گرا، اگر ایسے ہی چار پانچ گھوڑے چھوڑ دیئے جائیں تو تھوڑے ہی دنوں میں وہی منظر بن جائے جو زلزلہ کے بعد کانگڑے کا ہو گیا تھا۔

جنازہ قبرستان میں کیا گیا فوج میں ترم بج گیا۔سقے کا سارا خاندان اپنا اپنا کام چھوڑ کر جھونپڑی میں گھسا اور اناج لینے کو برتن لئے لائن باندھ کر آ بیٹھا کسی کے ہاتھ میں بے پیندے کا تام چینی کا کٹورہ ہے تو کسی کے پاس ٹوٹی رکابی کسی کے پاس مٹی کا پیالہ تو کسی کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا چھاج۔سچ ہے، خدا رزّاق ہے قبرستان والوں کو بھی گھر بیٹھے رزق پہنچاتا ہے

یہ تو قبرستان والوں کی حالت ہوئی۔اب ساتھ والوں کی کیفیت سنئے۔جنازہ لا کر لبِ گور رکھ دیا ایک آتا ہے قبر کو جھانکتا ہے۔دوسرا آتا ہے جھانک جاتا ہے۔ہر شخص کو زمین سخت ہونے کی شکایت ہے کوئی مزدوروں کو سست کہتا ہے کوئی پٹاؤ کا نقص بتاتا ہے۔کوئی قبرستان والے کو برا کہتا ہے۔جب اس ریویو سے بھی فراغت پائی تو دو دو تین تین آدمی ایک ایک قبر پر جا بیٹھے۔چبوترے کو تخت بنالیا اور تعویز کو گاؤ تکیہ اور لگے سگریٹ اور بیڑی کا دم لگانے کسی نے سقہ سے چلم بھرنے کی فرمائش کی۔اس نے حقہ تازہ کر سلفہ بھر حاضر کیا۔حقّے مزے لے لے کر پئے جارہے ہیں ایک دوسرے کی تواضع کی جارہی ہے۔سلفہ پر سلفہ بھروایا جاتا ہے اور یہ وقت کسی نہ کسی طرح کاٹا جاتا ہے۔یہ توفیق نہیں ہوئی کہ کچھ خدا کی یاد کریں۔یا ان

خفتگان خاک کی حالت کو دیکھ کر عبرت ہی حاصل کریں۔

بعض لوگ ہیں کہ گھانس سے بچتے بچاتے قبروں پر کودتے پھاندتے چلے جارہے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ وہ صاحب ہیں جن کے مرے ہوئے عزیزوں کے آج دن پھرے ہیں۔ یوں تو خدانخواستہ فاتحہ کو کیوں آنے لگے۔ آج شرماشرمی قبرستان میں آگئے ہیں۔ مفت کرم داشتین کی صورت ہے چلو فاتحہ بھی پڑھ لیتے ہیں اس کے بعد جب کوئی دوسرا عزیز یا دوست مرے گا تو پھر دیکھا جائے گا۔

ایک صاحب ہیں کہ قبروں کے کتبے ہی پڑھتے پھر رہے ہیں۔ کچھ نوٹ بھی کرتے جاتے ہیں۔ کوئی اچھا کتبہ مل گیا تو اپنے دوستوں کو آواز دے کر بلالیا۔ اور بجائے فاتحہ کے دادِ سخن گوئی دی گئی۔ کچھ اپنا کلام سنایا گیا۔ کچھ ان کا سنا، غرض کوئی نہ کوئی مشغلہ وقت گزارنے کا نکال ہی لیا۔

جو لوگ چبوتروں پر متمکن ہیں ان کی کچھ نہ پوچھو ہر چبوترے پر ایک پارلیمنٹ ہے اور ہر قبر ایک کانگریس کا اجلاس۔ دنیا بھر کی خبروں پر تنقیح وتنقید ہورہی ہے۔ دفتر کی کارروائیوں پر بحث ہورہی ہے۔ افواہوں کے ذرائع اور ان کی تصدیق وتردید کی جارہی ہے۔ سفارشیں ہورہی ہیں۔ وعدے لئے جارہے ہیں۔ غرض سب کچھ ہورہا ہے۔ نہیں ہورہا ہے تو وہ جو ہونا چاہیے اور جس غرض کے لیے ساتھ آئے ہیں۔

خیر خدا خدا کرکے خبر آئی کہ قبر تیار ہے۔ کچھ تو اٹھ کر قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے۔ کچھ وہیں بیٹھے رہ گئے۔ ایک صاحب نے قبر میں اتر کر گلاب اور عود چھڑکا۔ ایک نے میت کے اوپر کی چادر سمیٹی۔ چادر میں بل دیئے دو صاحب نے لٹھے کے سرے پکڑ کر میت کو اٹھایا۔ آٹھ دس نے غل مچایا ''سنبھال کے سنبھال کے'' میت بھاری ہے کمر کے نیچے چادر دو۔ ارے میاں اپنی طرف گھسیٹو، ہاں آہستہ سے آہستہ سے۔'' اب میت قبر کے منھ تک آگئی فقیروں یا یوں کہو کہ مفت خوروں کو اناج تقسیم ہونے لگا اور قبر کے گرد جو لوگ کھڑے تھے انھوں نے بے تحاشا غل مچانا شروع کیا۔ کوئی کہتا ہے ذرا کمر کی چادر کھینچو، ارے بھائی اتنا بھی دم نہیں ہے، دیکھنا کہیں قبر کا پا کھانہ گرے۔ ہاں ہاں ذرا اور جھکا کر۔ لا الہ الا اللہ۔ میت بھاری ہے ذرا سنبھال کے آہستہ آہستہ بس بھائی،'' کوئی چیخ رہا ہے'' مٹھے کے بندھن کھول دو۔ ارے میاں یہ ڈھیلا لو

سر کے نیچے رکھ کر منہ قبلہ کی طرف تو کر دو۔ واہ بھئی واہ اتنا بھی نہیں آتا۔ ابھی منہ پورا نہیں پھرا، بس بھائی بس۔''

یہ مختلف فقرے ایک ہی زبان سے نہیں نکلتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آ جائے ہر شخص ہے کہ غل مچا رہا ہے جو بیچارے قبر میں اترے ہیں وہ پریشان ہیں کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ بہر حال اس غل غپاڑے کے ساتھ دوست واحباب اس مرنے والے کو پہلی منزل تک پہنچا ہی دیتے ہیں۔ اب پٹاؤ کی نوبت آتی ہے۔ اس میں وہی گڑبڑ شروع ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے ''یہ کڑی نہیں وہ کڑی لا۔'' کوئی کہتا ہے ''لاحولا قوہ ،مفت میں سو روپئے مار لئے اور کڑیاں دیں تو ایسی۔'' غرض کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ، اسی گڑبڑ میں پٹاؤ ہو جاتا ہے اور مٹی دینے کی نوبت آتی ہے۔ مٹی تو ہر ایک دیتا ہے منہ سے بھی ہر ایک بڑبڑاتا ہے لیکن یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو کچھ پڑھنا چاہیے وہ پڑھتا بھی ہے یا نہیں۔ البتہ لفظ منہا بہت اونچی آواز میں کہا جاتا ہے اور باقی سب الفاظ منہ ہی منہ میں ختم کر دیئے جاتے ہیں۔

جب اس کام سے فراغت پائی اور قبر تیار ہوگئی تو فاتحہ کی نوبت آئی۔ ساتھ آنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس میں شریک نہ ہو۔ ہونٹ تو سب کے ہلتے ہیں مگر شاید سو میں بیس بھی نہ ہوں گے جو یہ جانتے ہوں کہ فاتحہ میں کیا کیا صورتیں پڑھتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہی سب کو اپنے اپنے گھر جانے کی سوجھی۔ یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ مرنے والے کے اعزّہ کون ہیں اور ان کی کیا حالت ہے۔ ہاں ان بچاروں کو گھیرتے ہیں تو جنازہ لانے والے مزدور گھر سے چکا کر لائے تھے۔ مگر یہاں آ کر وہ بھی پاؤں پھیلاتے ہیں۔ کبھی تو کہتے ہیں کہ ''فاصلہ بہت تھا'' کبھی کہتے ہیں کہ آپ کی وجہ سے دوسری میت چھوڑ کر آئے ہیں۔ وہاں آپ کے یہاں سے دوگنا مل رہا تھا۔'' بہر حال ان مصیبت زدوں کو دق کر کے یہ مزدور کچھ زیادہ ہی لے مرتے ہیں۔''

دیکھ لیا آپ نے اس زمانہ کی میت کا رنگ جو میں نے عرض کیا تھا وہ صحیح نکلا یا نہیں ؟ اب سوائے اس کے کیا ہو کہ خدا سے دعا کی جائے کہ اللہ اپنے بندوں کو نیک ہدایت دے ان کے دل میں درد پیدا کرے۔ یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں؟ اور ہم کیا کر رہے ہیں؟

☆☆☆

3.3 مشقی سوالات

۱) مرنے کے بعد انسان کیساتھ زندہ انسان کس طرح کا سلوک کرتے ہیں؟

۲) مصنف نے میت میں شامل ہونے والوں کی کس طرح تصویر کشی کی ہے؟

۳) اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے؟

۴) مرازا فرحت کے حالاتِ زندگی پر اظہار خیال کیجئے۔؟

3.4 خلاصہ:

مرزا فرحت اللہ بیگ کا شمار اردو انشائیہ نگاری میں صف اول کے مصنفین میں ہوتا ہے۔انہوں نے اردو ادب کو بہترین انشائیوں سے سرفراز کیا ہے۔اردو میں انشائیہ نگاری کو انہوں نے خوب فروغ دیا۔مردہ بدست زندہ است،اس انشائیہ میں انہوں نے انسان کی موت کے بعد اس کی میت میں شامل ہونے والوں کی مختلف کیفیات کو اجاگر کیا ہے۔میت میں کس کس طرح کے لوگ شامل ہوتے ہیں کن کن لوگوں کو جلدی ہوتی ہے کہ اس مردے کو جتنی جلد ہو سپرد خاک کیا جائے کون کون لوگ دراصل میت سے سچی محبت کرتے ہیں ۔میت کے نماز جنازہ میں کون شامل ہوتے ہیں اور کون مسجد سے باہر کھڑے ہو کر میت کے نماز جنازہ کے ختم ہونے اور میت کے باہر آنے کا انتظار کرتے ہیں ۔غرض کہ یہ انشائیہ حالات حاضرہ کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔اس انشائیہ میں مصنف نے طرح طرح سے ہمارے سماج کے بعض احباب کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔جو قابل قدر ہے۔

☆☆☆

3.5 اصطلاحات، الفاظ ومعنی

احکام	حکم کی جمع
تصدیق	صداقت، سچائی
تردید	رد کرنا، انکار کرنا
حیات و ممات	زندگی و موت
مصنف	لکھنے والا، تصنیف کرنے والا

3.6 مزید مطالعہ کے لیے کتب

١) مضامینِ فرحت ۔۔۔۔مرزا حت اللہ بیگ

٢) تاریخ ادب اردو۔۔۔۔نور الحسن نقوی

٣) تاریخ اردو ادب۔۔۔عظیم الحق جنیدی

فہرست

4.0 مقاصد

4.1 تمہید

4.2 موضوع کی وضاحت

4.2.1 پطرس بخاری

4.2.2 سنیما کا عشق

4.3 مشقی سوالات

4.4 خلاصہ

4.5 اصطلاحات، الفاظ و معنی

4.6 مزید مطالعہ کے لیے کتب

4.0 مقاصد

اس باب کے مطالعہ کے بعد آپ............

☆ انشائیہ کے مفہوم، تعریف سے واقف ہو جائیں گے۔

☆ پطرس بخاری کی ادبی خدمات سے واقف ہوں گے۔

☆ انشائیہ کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگا سکیں گے۔

4.1 تمہید

انشائیہ اردو ادب کی پسندیدہ صنف ہے۔غیر افسانوی نثر میں جس طرح خاکہ نگاری کو اہمیت حاصل ہے اسی طرح انشائیہ کو بھی حاصل ہے۔یہ اردو ادب کی جدید نثری اصناف میں بڑے دلچسپی سے پڑھی جانے والی صنف ہے۔اس میں کسی بھی موضوع پر لکھنے کی اجازت ہے۔ یہ ایک طرح کا مضمون ہی ہے لیکن عام مضمون سے ہٹ کر بھی ہے۔ انشائیہ کو اردو میں مزے دار صنف کے طور پر لکھا اور پڑھا جاتا ہے لیکن اس میں مزہ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔اس کا قاری لطف کے ساتھ ساتھ سبق بھی حاصل کرتا ہے۔یعنی زندگی بسر کرنے کے لیے اسے ایک نئی روشنی ملتی ہے۔انشائیہ نگاری کو سمجھنے کے لیے اس کے مفہوم اور تعریف کا ادراک بھی ضروری ہوتا ہے۔اس لیے یہاں اردو انشائیہ کے مفہوم اور تعریف پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

4.2 موضوع کی وضاحت:

4.2 انشائیہ کا مفہوم اور تعریف:

لفظ انشائیہ کے لغوی معنیٰ نثر کا فن، مضمون نگاری، کچھ بات دل سے نکالنا وغیرہ کے ہیں۔اردو میں غیر افسانوی ادب کی بے حد مشہور صنف ہے۔ادبی اصطلاح میں انشائیہ کے لغوی میعنی "عبارت" کے ہیں۔انشائیہ نثری ادب کی وہ صنف ہے جو مضمون کی مانند لگتی ہے مگر مضمون سے الگ انداز رکھتی ہے۔انشائیہ میں انشائیہ نگار آزادانہ طور پر اپنی تحریر پیش کرتا ہے، جس میں اس کی شخصیت کا پہلو نظر آتا ہے۔اور بغیر کسی خاص نتیجہ کے بات کو ختم کرتا ہے، یعنی نتیجہ کو قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔

4.2.1 پطرس بخاری :

سید احمد شاہ المعروف پطرس بخاری (انگریزی: Patras Bokhari؛ پیدائش: یکم اکتوبر 1898ء - وفات: 5 دسمبر 1958ء) پاکستان سے تعلق رکھنے والے اردو کے نامور مزاح نگار، افسانہ نگار، مترجم، شاعر، نقاد، معلم، برطانوی ہندوستان کے ماہر نشریات اور پاکستان کے سفارت کار تھے۔ پطرس کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مختصر مجموعہ پطرس کے مضامین پاکستان اور ہندوستان میں اسکولوں سے لے کر جامعات تک اردو نصاب کا حصہ ہے۔ ان کا شمار متحدہ ہندوستان میں نشریات کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ پطرس اقوام متحدہ میں پاکستان کے پہلے مستقل مندوب کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ پطرس انگریزی کے پروفیسر تھے اور انگریزی میں اتنی قابلیت تھی کہ انہوں نے امریکا کی جامعات میں انگریزی پڑھائی اور وہیں وفات پائی اور دفن ہوئے۔

پطرس بخاری کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی مزاح نگاری کو تمسخر اور طنز سے آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ ان کے مزاح میں شوخی اور لطافت کی پاکیزہ آمیزش ہے۔ اس میں اتنی تلخی نہیں کہ طنز بن جائے اور اتنی کھلی ظرافت بھی نہیں کہ متانت سے گر جائے۔ ان کا لطیف مزاح ان کے انوکھے زاوی؟ نظر سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ مزاح پطرس کی غیر معمولی ذہانت، عمیق مشاہدہ کی عادت اور شگفتہ طرز بیاں کی قوت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

ایک بڑا مزاح نگار ہونے کے لیے ایک بڑی شخصیت بھی درکار ہوتی ہے اور پطرس بلاشبہ ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بلحاظ منصب بڑے اور اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے اور ان عہدوں کی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے انھیں بہت کم فرصت ملتی کہ وہ ادبی مشاغل کی طرف توجہ دیتے۔ اگرچہ انہوں نے بہت کم لکھا ہے لیکن جو لکھا وہ خوب لکھا اور معیاری و بلند مرتبہ ہے۔ ان کی تحریریں بھی خالص ادبی مزاح کے بہترین نمونے ہیں۔ قاری کی حسِ مزاح کو بیدار کر کے چھوٹی چھوٹی باتوں سے ظرافت کی کلیاں کھلاتے چلے جاتے

ہیں، ان کے ہاں طنز کی گہرائی کہیں نظر نہیں آتی، وہ صرف گدگداتے، چٹکیاں لیتے اور ہنساتے ہیں۔ یہی ان کی مزاح نگاری کی خصوصیات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ

''اگر ہم ذہن میں کسی ایسی محفل کا نقشہ جمائیں، جہاں تمام ملکوں کے مشاہیر اپنے اپنے شعر و ادب کا تعارف کرانے کے لیے جمع ہوں تو اردو کی طرف سے بالاتفاق کس کو اپنا نمائندہ منتخب کریں گے؟ یقیناً بخاری کو۔ بخاری نے اس قسم کے انتخاب کے معیار کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ نمائندوں کا حلقہ مختصر ہوتے ہوتے معدوم ہونے لگا ہے۔ یہ بات کسی وثوق سے ایسے شخص کے بارے میں کہہ رہا ہوں، جس نے اردو میں سب سے کم سرمایہ چھوڑا ہے، لیکن کتنا اونچا مقام پایا۔''

جبکہ ایک دوسرے نقاد کا کہنا ہے کہ ''پطرس بخاری نے اپنی ظرافت کا مواد زندگی سے لیا ہے۔ زندوں سے مواد کوئی زندہ دل ہی لے سکتا ہے جس نے زندگی کو محسوس کیا ہے اور برتا ہے۔''

حقیقت یہ ہے جس نے انسانوں میں رہ کر ان کی ذہنی اور عملی حرکات کے ایک ایک پہلو کو ہمدردی سے دیکھا ہو، زندگی سے یہ لگاؤ غالب کے بعد پطرس کے یہاں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ایک نے ناکامیوں سے کام لیا بلکہ مشکلوں کو آسان کر لیا تھا اور دوسرے کے سر اتنا کام آپڑا کہ نمٹ نہ سکا۔ غالب اور پطرس کا نام اسی وجہ سے ساتھ ساتھ لیا گیا ہے کہ دونوں بلند پایہ مزاح نگار ہیں۔ غالب کو مرنے کی فرصت نہ تھی اور پطرس کو جینے کی فرصت نہ مل سکی۔ ایک کو اپنے مزاح نگار ہونے کا علم نہ ہوسکا اور دوسرے کو لوگوں نے احساس بھی کرا دیا تو کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک نے اپنی شخصیت کا اظہار شاعری میں کیا مگر اس کے دامن کو تنگ پا کر خطوط کا سہارا لیا لیکن دوسرے نے محض چند مضامین، خطوط، تراجم اور تقاریر پر اکتفا کیا۔ مختصراً یہ کہ پطرس کا مختصر سرمایہ مزاح، ظرافت کے بڑے بڑے کارناموں پر بھاری ہے۔ اتنا مختصر

رخت سفر لے کر بقائے دوام کی منزل تک پہنچنا بڑی اہمیت کی بات ہے۔

پطرس نے خوجی، حاجی بغلول اور چچا چھکن جیسے کوئی مزاحیہ کردار تخلیق نہیں کیے لیکن انسانی سیرت میں جہاں بھی انہوں نے کوئی کمزوری محسوس کی اس کی گرفت کی ہے اور مزاحیہ انداز میں اس کا خاکہ اڑایا ہے۔ وہ کسی کردار کی خامیوں کو مزاحیہ رنگ میں اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے لیے لطف کا سامان مہیا کر دیتے ہیں لیکن اس میں بھی ہمدردانہ انداز پایا جاتا ہے۔ مرید پور کا پیر میں جب لیڈر تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے اور پرچہ گم ہو جانے کی وجہ سے تقریر نہیں کر پاتا تو پطرس اس کا مضحکہ اڑانے کی بجائے اس سے ہمدردی کرنے لگتے ہیں۔

پطرس مذاق ہی مذاق میں کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ چاہے لاہور کا جغرافیہ ہو، مبیل اور میں ہر جگہ ان کا ذہن ایک ہی لفظ کے گرد گھومتا ہے۔ وہ ہے مقصدیت۔

پطرس کے مضامین بخاری صاحب کی مزاحیہ طبیعت کے آئینہ دار ہیں اور یہ مضامین ہمیشہ دلچسپی سے پڑھے جاتے رہیں گے۔ ان کے دوسرے مضامین میں بھی عام آدمی کے مشاہدے اور تجربات کی باتیں کی گئی ہیں۔ اسی طرح صاحب مذکور کے مضامین ہیں۔ وہ عمومیت ہے جو انھیں دوسرے مزاح نگاروں مثلاً رشید احمد صدیقی اور فرحت اللہ بیگ وغیرہ سے جدا کرتی ہے۔ رشید احمد صدیقی صاحب علی گڑھ کی فضا سے باہر نہیں نکلتے اور مرزا فرحت اللہ بیگ دلی اور حیدرآباد کے ماحول کے اسیر رہتے ہیں۔ اس لیے ان کا مزاح عام آدمی اور خاص آدمی سبھی کے لیے دلچسپی اور خوش دلی کی چیز ہے۔ القصہ مختصر یہ کہ پطرس بخاری دورِ جدید کے بہت بڑے شگفتہ اور مزاح نویس ہیں۔ اگرچہ انہوں نے بہت کم لکھا۔ تاہم جو کچھ بھی لکھا، خوب لکھا۔

☆ پطرس بخاری

سینما کا عشق

خدا کے فضل سے ہم سینما کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکے۔اس میں میری سستی کو ذرا دخل نہیں، یہ سب قصور ہمارے دوست مرزا صاحب کا ہے۔وہ کہنے کو تو دوست ہیں لیکن خدا شاہد ہے، کہ ان کی دوستی سے جو نقصان ہمیں پہنچے، کسی دشمن کے بھی قبضہ قدرت سے باہر ہوں گے۔

جب سینما جانے کا ارادہ ہوتا، تو ہفتہ بھر پہلے انھیں کہہ دیتا کہ بھئی مرزا جی! اگلی جمعرات کو سینما چلو گے نا؟ میری مراد یہ ہوتی کہ وہ پہلے سے تیار رہیں اور اپنی تمام مصروفیتیں کچھ اس ڈھب سے ترتیب دے لیں کہ جمعرات کے دن ان کے کام میں کچھ حرج واقع نہ ہو۔لیکن وہ جواب میں عجیب قدرشناسی فرماتے:

''ارے بھئی چلیں گے کیوں نہیں؟ کیا ہم انسان نہیں؟ ہمیں تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی اور پھر کبھی ہم نے ایسی بے مروتی آج تک برتی ہے کہ تم نے چلنے کو کہا ہو اور پھر ہم نے تمہارا ساتھ نہ دیا ہو۔''

ان کی تقریر سن کر میں کھسیانا سا ہو جاتا۔کچھ دیر چپ رہتا اور پھر دبی زبان سے کہتا'' بھئی اب کے ہو سکا تو وقت پر پہنچیں گے۔ٹھیک ہے نا؟''

میری یہ بات عام طور پر ٹال دی جاتی، کیونکہ اس سے ان کا ضمیر کچھ تھوڑا سا بیدار ہو جاتا۔خیر میں بہت زور نہیں دیتا، صرف ان کو بات سمجھانے کے لیے اتنا کہہ دیتا'' کیوں

بھئی! آج کل سینما چھے بجے شروع ہو جاتا ہے نا؟''

''مرزا صاحب عجیب معصومیت کے انداز میں ج؟ واب دیتے'' بھئی یہ ہم کو معلوم نہیں۔''

''میرا یہ خیال ہے چھے بجے ہی شروع ہوتا ہے۔''

''اب تمہارے خیال کی کوئی سند نہیں...''

''نہیں مجھے یقین ہے، چھے بجے شروع ہوتا ہے۔''

''تمھیں یقین ہے تو میرا دماغ کیوں مفت میں چاٹ رہے ہو؟''

اس کے بعد آپ ہی کہیے کہ کیا بولوں؟

خیر جناب! جمعرات کے دن چار بجے ان کے مکان پہنچتا ہوں' اس خیال سے کہ جلدی جلدی انھیں تیار کرا کے وقت پر پہنچ جائیں۔ مگر دولت خانے پر تو آدم نہ آدم زاد' سارے مردانے کمرے گھوم جاتا ہوں' ہر کھڑکی سے جھانکتا ہوں' ہر شگاف سے آواز دیتا ہوں' لیکن کہیں سے رسید نہیں ملتی۔ آخر تنگ آ کر ان کے کمرے میں بیٹھ جاتا اور دس پندرہ منٹ سیٹیاں بجاتا رہتا ہوں۔ دس پندرہ منٹ بلاٹنگ پیپر پر تصویریں بناتا ہوں۔ پھر سگریٹ سلگاتا اور باہر ڈیوڑھی میں نکل کر اِدھر اُدھر جھانکتا ہوں۔ وہاں بدستور ہُو کا عالم دیکھ کر کمرے میں واپس آتا اور اخبار پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔

ہر کام کے بعد مرزا صاحب کو آواز دے لیتا ہوں' اس اُمید پر کہ شاید ساتھ کے کمرے میں یا عین اوپر کے کمرے میں تشریف لے آئے ہوں۔ سو رہے تھے تو ممکن ہے جاگ اٹھے ہوں۔ نہا رہے تھے' تو شاید غسل خانے سے باہر نکل چکے ہوں لیکن میری آواز مکان کی وسعتوں سے گونج کر واپس آ جاتی۔ آخرکار ساڑھے پانچ بجے کے قریب زنانے سے تشریف لاتے ہیں۔ میں اپنا کھولتا خون قابو میں لا کر متانت اور اخلاق بڑی مشکل سے مدنظر رکھ کر پوچھتا ہوں:

''کیوں حضرت... آپ اندر ہی تھے؟ میری آواز آپ نے نہیں سنی؟''

''اچھا یہ تم تھے' میں سمجھا کوئی اور ہے۔''

آنکھیں بند کر کے سر پیچھے ڈال لیتا اور دانت پیس کر غصے کو پی جاتا ہوں۔ پھر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھتا ہوں ''تو اچھا آپ چلیں گے یا نہیں؟''

''کہاں...''

''ارے بندہ خدا' آج سینما نہیں جانا؟''

''ہاں ہاں' سینما سینما۔'' یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ جاتے اور کہتے ہیں ''میں بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے ایسی جو مجھے یاد نہیں آتی' اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا... ورنہ مجھے رات بھر الجھن ہی رہتی۔''

''تو پھر اب چلیں؟''

''ہاں وہ تو چلیں گے ہی، میں سوچ رہا تھا کہ آج ذرا کپڑے بدل لیتے، خدا جانے دھوبی کمبخت کپڑے بھی لایا ہے یا نہیں، یار اِن دھوبیوں کا تو کوئی انتظام کرو۔ اگر قتل انسانی ایک سنگین جرم نہ ہوتا تو ایسے موقع پر مجھ سے ضرور سرزد ہو جاتا۔ لیکن کیا کروں، اپنی جوانی پر رحم کھاتا ہوں، بے بس ہوں، صرف یہ ہی کہہ سکتا ہوں۔''

''بھئی مرزا، اللہ مجھ پر رحم کرو، میں سینما چلنے کو آیا ہوں، دھوبیوں کا انتظار کرنے نہیں۔ یار بڑے بدتمیز معلوم ہوتے ہو، پونے چھے بج چکے اور تم جوں کے توں بیٹھے ہو۔''

مرزا صاحب عجیب مربیانہ تبسم کے ساتھ کرسی سے اٹھتے ہیں۔ گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اچھا بھئی، تمھاری طفلانہ خواہش آخر پوری کر ہی دیں۔ چناں چہ پھر یہ کہہ کر تشریف لے جاتے ہیں کہ اچھا کپڑے پہن آؤں۔ مرزا صاحب کے کپڑے پہننے کا عمل اس قدر طویل ہے کہ اگر میرا اختیار چلے تو قانون کی رو سے انھیں کپڑے اتارنے ہی نہ دوں۔ آدھ گھنٹے بعد وہ کپڑے پہنے تشریف لاتے ہیں۔ ایک پان منہ میں اور دوسرا ہاتھ میں بھئی میں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ دروازے تک پہنچ کر مڑ کے دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب غائب، پھر اندر جاتا ہوں، مرزا صاحب کسی کونے میں کھڑے کچھ کرید کر رہے ہیں۔

''ارے بھائی چلو...''

''چل تو رہا ہوں یار، آخر اتنی بھی کیا آفت ہے؟''

''اور یہ تم کیا کر رہے ہو؟''

''پان کے لیے تمبا کو لے رہا تھا۔''

تمام راستے مرزا صاحب چہل قدمی فرماتے رہے۔ میں ہر دو تین لمحے کے بعد اپنے آپ کو ان سے چار پانچ قدم آگے پاتا۔ کچھ دیر ٹھہر جاتا تو پھر چلنا شروع کر دیتا... پھر آگے نکل جاتا... پھر ٹھہر جاتا... غرض چلتا دوگنی رفتار سے ہوں اور پہنچتا ان کے ساتھ۔

ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوئے تو اندھیرا گھپ، بہتیرا آنکھیں جھپکاتا، کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ادھر سے کوئی آواز لگاتا ''دروازہ بند کر دو جی۔'' یا اللہ اب جاؤں کہاں... رستہ، کرسی، دیوار، آدمی کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ ایک

قدم اور آگے بڑھاتا تو سران بالٹیوں سے جاٹکراتا جو آگ بجھانے کے لیے دیوار پر لٹکتی رہتی ہیں۔تھوڑی دیر بعد تاریکی میں کچھ دھندلے سے نقش دکھائی دینے لگتے۔ جہاں ذرا تاریک سا دھبا دکھائی دے جائے' وہاں سمجھتا خالی کرسی ہوگی۔خمیدہ کمر ہوکر اس کا رخ کرتا۔اس کے پاؤں کو پھاند'اس کے گھٹنوں سے ٹکرا' خواتین سے دامن بچا آخرکار کسی کی گود میں جا بیٹھتا تو وہاں سے نکال دیا جاتا۔

لوگوں کے دھکوں کی مدد سے آخر ایک کرسی تک جا پہنچا۔مرزا صاحب سے کہتا ''میں نہ بکتا تھا کہ جلدی چلو' خوامخواہ ہم کو رسوا کردیا نا!

''گدھا کہیں کا!''اس شگفتہ بیانی سے معلوم ہوتا کہ ساتھ کی کرسی پر جو بزرگ بیٹھے ہیں اور جن کو میں مخاطب کر رہا ہوں' وہ مرزا صاحب نہیں کوئی اور بزرگ ہیں۔

اب تماشے کی طرف متوجہ ہوتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا کہ فلم کون سی ہے؟ اب اس کی کہانی کیا ہے؟ اور کہاں تک پہنچ چکی؟ سمجھ میں صرف اس قدر آتا کہ ایک عورت ہے جو کسی مسئلے سے نمٹنا چاہتی ہے۔اتنے میں آگے کی کرسی پر بیٹھے حضرت ایک وسیع اور فراخ انگڑائی لیتے۔اس دوران کم از کم تین سوفٹ فلم گزر جاتی۔ جب انگڑائی لپیٹ لیتے تو سر کھجانا شروع کرتے۔اس عمل کے بعد ہاتھ کو سر سے نہیں ہٹاتے بلکہ بازو ویسے ہی خمیدہ رکھتے۔میں مجبوراً سر نیچا کرکے چائے دانی کے دستے کے بیچ میں سے اپنی نظر کے لیے رستہ نکال لیتا۔

بیٹھنے کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا جیسے ٹکٹ خریدے بغیر اندر گھس آیا اور چوروں کی طرح بیٹھا ہوں۔تھوڑی دیر بعد انھیں کرسی کی پشت پر کوئی مچھر یا پالتو پسو معلوم ہوتا۔ چناں چہ وہ دائیں طرف سے اونچے ہوکر بائیں طرف کو جھک جاتے۔ میں مصیبت کا مارا بھی دوسری طرف جھک جاتا۔ایک دو لمحے بعد ہی وہ مچھر دوسری طرف ہجرت کر جاتا۔ چناں چہ ہم دونوں بھی پینترا بدل لیتے۔غرض یہ دل لگی یوں ہی جاری رہتی۔وہ دائیں تو میں بائیں' میں بائیں تو وہ دائیں۔ان کو کیا معلوم کہ اندھیرے میں کیا کھیلا جا رہا ہے۔دل تو یہی چاہتا کہ اگلے درجے کا ٹکٹ لے کر ان کے آگے جا بیٹھوں اور کہوں ''لے بیٹا، دیکھو تو اب تو کیسے فلم دیکھتا ہے۔''

پیچھے سے مرزا صاحب کی آواز آتی ''یار تم سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا' اب جو ہمیں ساتھ لائے ہو تو فلم دیکھنے دو۔''

میں غصے میں آ کر آنکھیں بند کرتا اور قتلِ عمداً' خودکشی' زہر خورانی کے معاملات پر غور کرنے لگتا۔ دل میں کہتا'

ایسی کی تیسی اس فلم کی، سوسو قسمیں کھاتا کہ پھر کبھی نہ آؤں گا۔اور اگر آیا بھی تو اس کمبخت مرزا سے ذکر نہیں کروں گا۔ پانچ چھے گھنٹے پہلے آ جاؤں گا۔ اوپر کے درجے میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھوں گا۔ تمام وقت اپنی نشست پر اُچھلتا رہوں گا۔ بہت بڑے طرے والی پگڑی پہن کر آؤں گا۔ اپنے اوورکوٹ کو دو چھڑیوں پر لٹکا دوں گا۔ بہر حال مرزا کے پاس نہ پھٹکوں گا۔

لیکن اس کم بخت دل کو کیا کروں؟ اگلے ہفتے پھر کسی اچھی فلم کا اشتہار دیکھ پاتا تو سب سے پہلے مرزا کے پاس جاتا اور گفتگو پھر وہیں سے شروع ہو جاتی۔ ''کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات کو سینما چلو گے نا؟''

☆☆☆

4.3 مشقی سوالات

۱) مصنف نے اپنے سینما کے عشق کی کس طرح عکاسی کی؟

۲) مصنف نے اپنے دوست مرزا کے گھر کی کس طرح تصویر کشی کی ہے؟

۳) اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے؟

۴) پطرس بخاری کے حالاتِ زندگی پر اظہار خیال کیجئے۔؟

4.4 خلاصہ:

پطرس کا شمار اردو کے ممتاز انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کی نثر طنز ومزاح سے پُر ہوتی ہے۔انہوں نے متعدد انشایئے لکھے۔ان کے اکثر انشائیوں کو بڑی شہرت ملی۔انہی میں سے ایک انشائیہ سنیما کا عشق بھی ہے۔اس انشائیہ میں انہوں نے اپنے دوست کے عادات واطوار کی اور ان کی کمزوریوں کی طرف طنزاً اشارہ کیا ہے۔

☆☆☆

4.5 اصطلاحات، الفاظ و معنی

احکام	حکم کی جمع
تصدیق	صداقت، سچائی
تردید	رد کرنا، انکار کرنا
حیات و ممات	زندگی و موت
مصنف	لکھنے والا، تصنیف کرنے ولا

4.6 مزید مطالعہ کے لیے کتب

۱) مضامینِ فرحت ۔۔۔۔مرزا حت اللہ بیگ

۲) تاریخ ادب اردو۔۔۔۔نورالحسن نقوی

۳) تاریخ اردو ادب۔۔۔عظیم الحق جنیدی

فہرست

5.0 مقاصد
5.1 تمہید
5.2 موضوع کی وضاحت
5.2.1 ڈپٹی نذیر احمد
5.2.2 ایک ہندوستانی ڈپٹی کلکٹر کی اپنے افسر سے ملاقات
5.3 مشقی سوالات
5.4 خلاصہ
5.5 اصطلاحات،الفاظ ومعنی
5.6 مزید مطالعہ کے لیے کتب

5.0 مقاصد

اس باب کے مطالعہ کے بعد آپ............

☆ ناول کے مفہوم،تعریف سے واقف ہو جائیں گے۔

☆ ڈپٹی نذیر احمد کی ادبی خدمات سے واقف ہوں گے۔

☆ اردوناول کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگا سکیں گے۔

5.1 تمہید

ناول اردو ادب کی مقبول ترین صنف ہے۔ افسانوی نثر میں جس طرح افسانہ نگاری کو اہمیت حاصل ہے اسی طرح ناول کو بھی حاصل ہے۔ یہ اردو ادب کی جدید نثری اصناف میں بڑے دلچسپی سے پڑھی جانے والی صنف ہے۔ اس میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہے۔

5.2 موضوع کی وضاحت:

5.2 ناول کا مفہوم اور تعریف:

اول اطالوی زبان کے لفظ ناولا (Novella) سے نکلا ہے۔ ناولا کے معنیٰ ہے نیا۔ لغت کے اعتبار سے ناول کے معانی نادر اور نئی بات کے ہیں۔ لیکن صنفِ ادب میں اس کی تعریف بنیادی زندگی کے حقائق بیان کرنا ہے۔ ناول کی اگر جامع تعریف کی جائے تو وہ کچھ یوں ہوگی کہ ''ناول ایک نثری قصہ ہے جس میں پوری ایک زندگی بیان کی جاتی ہے''۔ ناول کے عناصرِ ترکیبی میں کہانی، پلاٹ، کردار، مکالمے، زماں و مکاں، اسلوب، نکتہ نظر اور موضوع وغیرہ شامل ہیں۔ افسانہ کسی فرد کے زندگی کو ظاہر کرتا ہے۔ "ناول کے اجزائے ترکیبی درج ذیل ہیں۔ کہانی، پلاٹ، کردار،، اندازنظر، زبان و بیاں، منظر نگاری

ناول مغربی اثر کے ساتھ اردو میں آیا۔ ناول سے پہلے اردو میں داستان اور قصے کہانیاں موجود تھیں۔ اردو میں نذیر احمد کی کہانیاں کو ناول کا پہلا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ ان کی پہلی کہانی مرات العروس 1869ء میں شائع ہوئی۔ نذیر احمد اپنی کہانیوں کے ذریعے عورتوں کی اصلاح چاہتے تھے۔ بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت وغیرہ نذیر احمد کی دوسری کتابیں ہیں۔ تاریخی اعتبار سے دوسرے اہم ناول نگار سرشار ہیں۔ ان کا ناول

فسان؟ آزاد اردو کا ایک شاہکار ہے۔ یہ 1879ء میں لکھا گیا۔ شرر نے اپنے ناولوں کے ذریعے سماج کی اصلاح کی۔ ان کا مشہور ناول فردوسِ بریں ہے۔ یہ 1999ء لکھا گیا ہے۔ سجاد حسین نے ناولوں میں مزاحیہ رنگ کا اضافہ کیا۔ حاجی بغلول، احمق الدین، میٹھی چھری وغیرہ ان کے مشہور ناول ہیں۔ مرزا رسوا کے ناولوں سے ایک نیا رنگ شروع ہوتا ہے۔ امراؤ جان ادا ان کا زند؟ جاوید ناول ہے۔ راشد الخیری نے اپنے ناولوں سے سماجی اصلاح کی کوشش کی۔ سمرنا کا چاند، شامِ زندگی، صبحِ زندگی وغیرہ ان کے مشہور ناول ہیں۔ سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں ایک ہیں۔ ان کا ناول لندن کی ایک رات بہت مشہور ہے۔ پریم چند کے اثر سے اردو میں ناول کو ترقی ہوئی۔ بازارِ حسن، چوگانِ ہستی، نرملا، گودان وغیرہ ان کے اہم ناول ہیں۔ کرشن چندر کا ناول شکست بہت مشہور ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے مسائل کو ناولوں کے ذریعے پیش کیا۔ عصمت چغتائی کا مشہور ناول ٹیڑھی لکیر ہے۔ اردو کے جدید ناول نگاروں میں قُرت العین حیدر کا نام اہم ہے۔ ان کے مشہور ناولوں میرے بھی صنم خانے، آگ کا دریا، آخرِ شب کے ہم سفر وغیرہ اہم ہیں۔

5.2.1 ڈپٹی نذیر احمد:

ڈپٹی نذیر احمد کا شمار اردو ناول کیبنیاد گزار کے طور پر ہوتا ہے۔ کیونکہ اردو میں سب سے پہلے انہوں نے ہی ناول لکھا۔ ان کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' اردو کا بھی پہلا ناول ہے۔ شمس العلماء خان بہادر حافظ ڈپٹی مولوی نذیر احمد (ریاست حیدرآباد سے انہیں غیور جنگ کا خطاب دیا گیا تھا جسے انہوں نے قبول نہیں کیا) (پیدائش: 1836ء یا 6 دسمبر 1831ء وفات: 3 مئی 1912ء) ضلع بجنور کی تحصیل نگینہ کے ایک گاؤں ریہر میں پیدا ہوئے۔ ایک مشہور بزرگ شاہ عبدالغفور اعظم پوری کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، لیکن آپ کے والد مولوی سعادت علی غریب آدمی تھے اور یو پی کے ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔

شروع کی تعلیم والد صاحب سے حاصل کی۔ چودہ برس کے ہوئے تو دلی آ گئے اور یہاں اورنگ آبادی مسجد کے مدرسے میں داخل ہو گئے۔ مولوی عبدالخالق ان کے استاد تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی حالت اچھی نہ تھی۔ دہلی کے آس پاس برائے نام مغل بادشاہت قائم تھی۔ دینی مدرسوں کے طالب علم محلوں کے گھروں سے روٹیاں لا کر پیٹ بھرتے تھے اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔ نذیر احمد کو بھی یہی کچھ کرنا پڑتا تھا، بلکہ ان کے لیے تو ایک پریشانی یہ تھی کہ وہ جس گھر سے روٹی لاتے تھے اس میں ایک ایسی لڑکی رہتی تھی جو پہلے ان سے ہانڈی کے لیے مصالحہ یعنی مرچیں، دھنیا اور پیاز تیاز وغیرہ پسواتی تھی اور پھر روٹی دیتی تھی اور اگر کام کرتے ہوئے سستی کرتے تھے تو ان کی انگلیوں پر سل کا بٹہ مارتی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس لڑکی سے ان کی شادی ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد دلی کالج میں داخل ہوئے جہاں انہوں نے عربی، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔

مولوی نذیر احمد نے اپنی زندگی کا آغاز ایک مدرس کی حیثیت سے کیا لیکن خداداد ذہانت اور انتھک کوششوں سے جلد ہی ترقی کر کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ مولوی صاحب نے انگریزی میں بھی خاصی استعداد پیدا کر لی اور انڈین پینل کوڈ کا ترجمہ (تعزیرات ہند) کے نام سے کیا جو سرکاری حلقوں میں بہت مقبول ہوا اور آج تک استعمال ہوتا ہے۔ اس کے صلے میں آپ کو تحصیلدار مقرر کیا گیا۔ پھر ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ نظام دکن نے ان کی شہرت سن کر ان کی خدمات ریاست میں منتقل کرا لیں جہاں انہیں آٹھ سو روپے ماہوار پر افسر بندوبست مقرر کیا گیا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد مولوی صاحب نے اپنی زندگی تصنیف و تالف میں گزاری۔ اس علمی و ادبی میدان میں بھی حکومت نے انہیں 1897ء شمس العلماء کا خطاب دیا اور 1902ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ 1910ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگری عطا کی۔ آپ کا انتقال 3 مئی 1912ء میں ہوا۔ آپ اردو کے پہلے ناول نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔

☆ ڈپٹی نذیر احمد

ایک ہندوستانی ڈپٹی کلکٹر کی اپنے افسر سے ملاقات

میں انگریزوں کی ملاقات کا ایسا چور ہوں کہ اب دیکھتا ہوں کہ اب بہت دن ہو گئے ہیں، تو ہفتوں پہلے سے ارادہ کرتا ہوں اور آخرز بردستی بیل کر دھکیل کر اپنے تئیں ڈھکیل کر لے جاتا ہوں۔تو کوٹھی پہ جا کر ہمیشہ دہی بےلطفی، بےعزتی، جاڑا ہو، پانی برستا ہو، کڑاکے کی دھوپ ہو، لوئیں چلتی ہوں۔ ہندوستان ڈپٹی نہیں ڈپٹی کا باوا کیوں نہ ہو اور چاہے' وہ اپنے مکان سے چار گھوڑوں کی بگھی پر سوار ہو کر کیوں نہ آیا ہو۔کلکٹر جنٹ، اسسٹنٹ کی تو بڑی بارگا ہیں۔اگر یوپین ڈپٹی کلکٹر سےبھی ملنے گیا ہے (اور نہ ملے تو رہے کہاں) تو احاطہ کے باہر اترنا اور احاطے بھی شیطان کی آنتڑی کہ ہم جیسے پرانے فیشن کے لوگ کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگتے ہیں اور اگر صاحب کہیں اس حال میں دیکھ پائیں تو سمجھو کہ ملاقات کو گئے۔نوکری نذر کر آئے۔اسی دن رپورٹ ہوئی دھری ہے کہ یہ شخص دس قدم پیدل نہیں چل سکتا۔گویا ڈپٹی کلکٹر کو ضروری ہے کہ کم سے کم ڈاک کے ہرکارے کی طرح ایک چوکی تک پوئیہ نہیں تو دکی پیشی کا بستہ لے کر بھاگ سکے۔ پس اس ڈر کے مارے کسی درخت کی آڑ میں یا کوئی ایسا گانٹ کا پورا ہے اور اس نے شاگرد پیشوں کو پہلے سے چکوتیاں کرا دی ہیں۔تو باورچی خانے یا اصطبل میں پاؤ گھنٹے، آدھ گھنٹے کھڑے دم لیا اور جب سانس اچھی طرح پیٹ میں سمانے لگا تو رومال سے ہاتھ پونچھا۔ ہاتھ سے داڑھی کو سنوارا۔ آہستہ سے عمامہ کو ذرا اور جما لیا۔ چغے کے دامن سمیٹے اور بڑے مودب، مقطع بن کے ہاتھ باندھے، نیچے نظریں کئے ڈرتے ڈرتے دبے پاوں کوٹھی کی طرف کو بڑے قدمت گار اور اردلی کے چپراسیوں نے تو احاطے کے باہر سے تاڑ لیا تھا کوٹی کے پاس آتے دیکھ قصداً ادھر ادھر کوٹل گئے۔تھوڑی دیر زینے کے نیچے ٹھٹکے کہ کوئی آدمی نظر آئے تو اوپر چڑھنے کا قصد کریں۔ چلنے کی اور چیزوں رکھنے اٹھانے کی آوازیں ہیں کہ برابر چلی آتی ہیں مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔آخر ناچار ستون کی آڑ میں جوتیاں اتارا ہمت کر کے، بے

بلائے اوپر پہنچے کرسی نہیں مونڈھا نہیں، فرش نہیں۔ کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں، لوٹ چلیں پھر خیال آتا ہے ایسا نہ ہو لوٹنے کو صاحب اندر سے آئینوں میں سے دیکھ لیں شرمندگی کے ٹالنے کو وہیں تھوڑی سی جگہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ اتنے میں باورچی خانے کی طرف سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ جی خوش ہوا کہ اس سے صاحب کی اردلی کے لوگوں کا حال معلوم ہوگا۔ وہ لپک کر ایک دوسرے دروازے کے اندر گھس گیا اور ادھر کو رخ بھی نہ کیا۔ کوئی آدھے گھنٹے اور اس انتظار میں تو ایسا معلوم ہوا کہ دو گھنٹے، اسی طرح کھڑے سوکھا کئے۔ بارے خدا خدا کر کے ایک چپراسی اندر سے چٹھی لیے ہوئے نمودار ہوا۔ کیا کریں اپنی غرض کے لئے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ حیا اور دولت بالائے طاق، آپ منھ پھوڑ کر کر کہ اس کو متوجہ کیا، کیوں جمعدار کچھ ملاقات کا بھی ڈھنگ نظر آتا ہے۔ اسے ڈپٹی کلکٹری کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ادب اور ڈر تو خاک بھی نہیں۔ صرف اتنی بات کا لحاظ کہ شہر کی فوجداری سپرد ہے۔ خدا جانے کب موقع آ پڑے۔ چارو ناچار اچٹتا ہوا سلام کر کے جیسے کوئی مکھی اڑاتا ہے۔ اس کو کہنا پڑا کہ آج ولایت کی ڈاک کا دن ہے ملاقات تو شاید ہی ہو۔ آپ بیٹھے۔ ابھی تو صاحب غسل کھانے میں ہیں، یہ کہہ کے پھر وہ اندر کو جانے لگا تو آخر نہ رہا گیا۔ زبان سے نکلا کہ کہاں بیٹھوں، اپنے سر پر تب اس نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی تکیہ اور ایک بازو ندارد۔ گویا بید کی تپائی لا کر ڈال دی۔ اس کے بعد جب جب کوئی چپراسی یا خدمتگار باہر آتا یہی معلوم ہوتا کہ صاحب ابھی غسل خانے سے نہیں نکلے۔ (الٰہی کیا غسل میت ہے) اب کپڑے بدل رہے ہیں، اب میم صاحب کے کمرے میں ہیں، اب چٹھی لکھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کو معلوم ہوا کہ کھانے کی میز پر ہیں۔ یہ سن کر جی ہی تو بیٹھ گیا کہ اب کیا خاک ملاقات ہوگی۔ ارادہ ہوا کہ گھر کی راہ لیں۔ پھر خیال آیا کہ کون وقتوں سے انتظار کر رہے ہیں۔ آنا ہی پڑے گا۔ دوسرے دن کا کیا بھروسہ، اتنی محنت کیوں ضائع کی ھ گھنٹ اور صبر کرو۔ بڑی دیر بعد چپراسی حکم لے کر نکلا کہ سررشتہ دار کو رپورٹ خوانی کے لئے بلایا ہے۔ اب رہی سہی امید اور بھی گئی گزری ہوئی۔ تب تو اپنا سا منہ لے کر چپراسی سے یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ خیر میں تو اب جاتا ہوں۔ صاحب سے میری اطلاع کی خبر کر دینا۔ تب خدا جانے چپراسی کے دل میں کیا آئی کہ کہنے لگا۔ دو بار آپ کی اطلاع کر چکا ہوں۔ کچھ بولے نہیں اب پھر کہہ

دیتا ہوں خفا ہونگے تو آپ میری آدھ سیر آٹے کی فکر رکھنا۔غرض بلائے گئے۔صاحب کو دیکھا تو پیپ منہ میں لے ٹہل رہے ہیں۔اب معلوم ہو گیا کہ مطمین ملاقات نہیں ہوسکتی سر جھکائے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے ہیں۔اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کیوں کر ان کو خبر کروں کہ میں آیا کھڑا ہوں اور کیا معلوم ہے شاید جان بوجھ کر کھڑا رکھا ہو بلکہ مجھ کو تو اس بات کا شبہ ہے کہ میرے آنے کی بہت دیر پہلے سے ان کو خبر تھی۔چپراسی نے شاید نہ بھی کہا ہو۔مگر چاروں طرف آئینے کے کواڑ ہیں۔عین سامنیسے دروازے کے آیا۔درختوں کے نیچے ٹہلتا رہا۔پھر بڑی دیر تک برآمدے میں بیٹھا رہا۔کیا اتنے عرصہ میں ایک بار بھی ان کی نظر نہ پڑی ہوگی۔ضرور پڑھی ہوگی۔خیر آپ ہی سر اٹھایا اور کہا ڈپٹی صاحب! حاکم بالا دست ہو کر جو اتنی آؤ بھگت کرے تو اس کا شکر گزار ہونا چاہئے۔صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہیں کی آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل میز کی دوسری طرف کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اپنے گھر یا آپس میں ایک دوسرے کے گھر کرسیوں پر بیٹھنا کون نہیں جانتا لیکن میں تو اپنے سے زیادہ تنخواہ کے ہندوستانی صدرالصدروں اور ڈپٹیوں کا انگریزوں کے روبرو کرسیوں پر بیٹھنا دیکھے ہوئے تھا۔کہنے کو تو کرسی پر بیٹھا مگر حقیقت میں بید پر چوتڑ ٹکے ہوں تو جیسی چاہو قسم لو تم خدا کے بندے ہو تو یقین ماننا۔بس ڈنڈے پر الگ تھلک جیسے اڈے پر گلدم پر بیٹھا ہی تھا کم بخت پیچھے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ خداوند سر رشتہ دار حاضر ہیں۔صاحب ہیں کہ میری طرف دیکھے جاتے ہیں۔اور چپراسی سے فرما رہے ہیں۔اچا آنے بولو، یعنی اچھا سر رشتہ دار سے کہو چلے آئیں۔سبحان اللہ، سات برس اسسٹنٹ رہے نو برس کے قریب جٹ اور اس سولہ برس میں صرف ایک بار ڈیڑھ برس کے لئے فرلو پر ولایت گئے تھے۔بارہ برس دلی میں رہے اور بھاڑ جھونکا۔چودہ برس میں حضرت نے اردو میں کیا کمال حاصل کیا ہے۔اچا آنے بولو۔اب میں منتظر ہوں کہ صاحب کچھ پوچھیں تو جواب دوں اور سر رشتہ دار مردود آگے آگے آپ پیچھے قلم دان لئے چپراسی آ ہی گھسا۔سر رشتہ دار مردود کے روبرو جھ سے پوچھتے ہیں۔تو کیا پوچھتے ہیں۔اول صاحب گرمی برت – میں گردن جھکا کے، ہاں حضور، گرمی کے تو دن ہی ہیں۔میرے علاقے میں تو پولیس کی رپورٹ سے ایسا معلوم ہوا کہ لو سے بھی کئی آدمی مرے۔صاحب کو تو جواب دے رہا ہوں اور دل میں یہ کہہ رہا ہوں کہ گرمی کا تو حال معلوم تھا

۔ارے ظالم! تجھ کو یہ بھی خدا کا ترس آیا کہ ایک بندۂ خدا جس کو کچہری میں سرکار سے ایک ٹٹی ملتی ہے۔ ناظر اپنی بدذاتی سے تین برس کے پرانے خس کی بندھوا دیتا ہے تو وہ جانے اور اس کا ایمان اور جس کو گھر پر بھی ٹٹی لگانے کا مقدور ہے اور جو واقع میں گرمی بھر اپنے گھرٹٹی میں رہتا ہے کتنی دیر سے برآمدہ میں پڑا بھن رہا ہے۔لاو سلام لے کے اس کو آزاد کردوں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آدمیوں کا لو سے مرنا سن کر چونک پڑے گا اور ضرور پوچھے گا کہ کس تھانے سے رپورٹ آئی۔ کتنے آدمی مرے کب مرے،لوکا ہندوستانی کیا علاج کرتے ہیں اور کوئی لاش ڈاکٹر صاحب کے ملاحظہ کو بھی آئی یا نہیں۔غرض آدمی کا دل بولنے اور بات کہنے کو چاہے تو بہتیرے حیلے ہیں۔ پر صاحب تو کچھ پی سے گئے۔نہیں معلوم دھیان سے نہیں سنا۔ یا مجھے نہیں یا کالے آدمیوں کے مرنے کی پرواہ نہیں کی۔اب سررشتہ دار ہے کہ بستہ کھول کاغذ پھیلا رہا ہے اور میری اور صاحب کی پُر تپاک کی ملاقات ہورہی ہے کہ دونوں چپ جب سررشتہ دار کاغذ پھیلا چکا۔لگا صاحب کا منہ دیکھنے تو صاحب مجھ سے فرماتے ہیں آپ کچ کچ یعنی آپ کو کچھ اور کہنا ہے۔ یہ سنتے ہی میں تو یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ نہیں میں تو صرف سلام کے لئے حاضر ہوا تھا۔ بہت دن ہو گئے تھے۔''جی ملنے کو چاہتا تھا۔'' پھر ماضر ہوں گا۔ میں اسے آخر کیا کہوں بلکہ دوسری بات میں''جی ملنے کو چاہتا تھا۔'' بالکل جھوٹ تھا۔کس مسخرے کا جی ملنے کو چاہتا تھا اور کس مسخرے کا جی اب ملنے کو چاہتا ہے۔ملاقات کے بامزہ اور بے مزہ ہونے کا معیار وقت ہے۔دیر تک ملاقات رہی تو جانو کہ خوب دل کھول کر باتیں ہوئیں۔ ہماری ملاقات کیا خاک بامزہ سمجھی جائے کہ جانا اور اٹھاو چولہے کی طرح بیٹھنا اور گفتگو اور رخصت،سب کچھ دو ہی منٹ میں ہوا۔اپنے حساب سے کون ایسا تیسا ملاقات کے ارادے سے گیا تھا۔خدا گواہ ہے صرف متھا پھٹول وہ بھی اپنے سر کا چھدا اُتارنے کے لئے صاحب مجھ سے چاہے ایک بات بھی نہ کرتے مگر سررشتہ دار اور چپراسیوں کو میرا الٹے پاؤں آنا نہ معلوم ہوتا تو مجھ کو کچھ بھی شکایت نہ تھی مگر میری تفضیح ان لوگوں کی نظر میں جو منصبی عزت میں میرے پاسنگ بھی نہ تھے ہوں۔ باہر نکلا تو چپراسیوں اور خدمت گاروں کا غول کا غول برآمدے میں موجود تھا مجھ کو دیکھتے ہی سب نے فرشی سلام کیا۔الٰہی کاہے کی ایسی لمبی چوڑی تعظیم ہورہی ہے گھنٹوں برآمدے میں سوکھا کیا۔ان میں سے کسی کی صورت بھی نظر نہیں پڑی۔اب

یہ حشرات الارض کہاں سے نکل پڑے۔ راہ میں اتنی جانفشانی کے بعد صاحب کو ایک سلام کر لینے کا گنہگار ہوں۔ یہ سرکاری پیادے اس کا جرمانہ وصول کرنے کے لئے مجھ پر تعینات ہوئے ہیں۔ ہر چند کہتا ہوں۔ مکان پر آنا تنخواہ پر دیکھا جائے گا عید قریب ہے۔ اس میں سمجھ لینا۔ بے حیا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ آخر میں نے ذرا ترش رو ہوکر کہا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ ہوتا تو دینے کا نام دینا کبھی کا دے چکا ہوتا۔ ایسی بے اعتباری ہے تو ایک آدمی میرے ساتھ چلو۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ایک آدمی تیار سا ہوا کہ مجھ سے پہلے آگے کوچ بکس پر بیٹھ لے، اتنے میں جمعدار نے پنسل اور پرچہ کا کاغذ میرے ہاتھ دیا کہ حضور ناظر کو رقعہ لکھ دیں۔ جب میں قلم اٹھاتا تھا بے ادب ہاتھ پکڑ لیتے تھے۔ پہلے فرما دیجئے کہ '' آپ کیا لکھتے ہیں'' اس کشمکش میں بڑھتے بڑھتے میں تو اپنی بگھی تک جا پہنچا۔ سائیس پٹ کھولے پڑا ہی تھا لپک کر پائیدان پر پاؤں رکھ غڑپ بگھی کے اندر۔ سائیس نے کھٹ سے پٹ بھیڑ دیا۔ اور گھوڑا تھا کہ آہٹ پاتے ہی چل نکلا۔ میں نے کوچ بان سے لے کر کاغذ کے پرزے میں ایک روپیہ رکھ پڑیا بنا اردلیوں کو دکھا کر نیچے پھینک دیا۔ پھر میں نے کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھا تو ایک چپراسی نے پڑیا اٹھائی بھی۔ ایک روپیہ دیکھ کر یقیناً بہت بگڑے ہوں گے مگر میں ان کی گالیوں کی زد سے باہر جا چکا تھا۔ بگھی کے اندر بیٹھ کر میں نے ایک ایسا لمبا سانس لیا جیسے کوئی مزدور سر پر سے بھاری بوجھ اتار کر تمام راستہ اسی ملاقات کی ادھیڑ بن میں طے ہوا۔ بار بار خیال آتا تھا کہ سررشتہ دارا اور چپراسیوں کی نظر میں میری کیا عزت رہی۔ اب یہ لوگ تمام شہر میں اس کا ڈھنڈورا پیٹیں گے۔ ایسی بے حرمتی سے روٹی کمانے پر لعنت ہے۔ پھر دل کو سمجھاتا کہ عزت ایک امر اضافی ہے۔ مجھے اپنے اقران و امثال پر نظر کرنی چاہئے۔ ان کے ساتھ بھی تو انیس بیس کے فرق سے ایسی ہی مدارات کی جاتی ہے۔ تو جس مجلس میں سب ننگے ہیں۔ وہاں لنگوٹی کی کیا شرم۔ ایسی حیض بیض میں گھر پہنچا۔ چند آدمی منتظر ملاقات بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر وہ نہ ڈپٹی تھے نہ میں کلکٹر کے برآمدے میں محتاج اطلاع بیٹھے ہوئے آئے تو میں موجود نہ تھا۔ مزے میں گاؤ تکیہ کے سہارے سے پھیل پھیل کر بیٹھے تھے۔ گھر میں سے پان آ گئے۔ آدمیوں نے حقے بھر دیئے۔ جوں مجھ کو دیکھا ایک صاحب بولے۔ اللہ اکبر، ڈپٹی صاحب! آج تو کلکٹر صاحب سے خوب گاڑھی چھنی کون

دقتوں سے میں آپ کا منتظر بیٹھا ہوں۔ دوسرے صاحب'' آج بندہ کا ارادہ بھی کلکٹر صاحب کے سلام کو جانے کا تھا۔ معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ بس آج کسی کی دال نہیں گلتی'' ، تیسرے صاحب مدت سے جدید تحصیلداری قائم ہونے کی خبر تھی۔ یہاں تک کہ بورڈ سے منظوری بھی آپ چکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اس انتظام کے صلاح ومشورے میں اتنی دیر لگ گئی۔'' لوگ آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں اور میں کپڑے اتارتا جاتا ہوں اور اندر ہی اندر دل میں خوش ہوں کہ بھلا ہے۔ خدا کرے لوگ ایسی ہی غلط فہمی میں مبتلا رہیں۔ ☆

☆☆☆

5.3 مشقی سوالات

۱) مصنف نے اپنے افسر سے اپنی پہلی ملاقات کی کس طرح عکاسی کی؟

۲) مصنف نے اپنے افسر کے گھر کے ملازمین کس طرح کردار نگاری کی ہے؟

۳) اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے؟

۴) ڈپٹی نذیر احمد کے حالاتِ زندگی پر اظہار خیال کیجئے۔؟

5.4 خلاصہ:

ناول ، لفظ کے معنی اطالوی زبان میں نیا کے ہیں ۔سب سے پہلے اطالوی زبان میں ناول نے جنم لیا۔پھر وہاں سے انگریزی زبان میں جا کر یہ صنف بہت مشہور ہوئی ۔اس کے بعد اردو میں ناول کا ظہور ہوا۔ڈپٹی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں ۔ان کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' کے نام سے شائع ہوا۔اس کے بعد انہوں نے بہت سے ناول لکھے ۔ان کا سب سے زیادہ مشہور ناول ''ابن الوقت'' ہے ۔اسی ناول سے یہ اقتباس ''ایک ہندوستانی ڈپٹی کلیٹر کی اپنے افسر سے ملاقات'' لیا گیا ہے۔

اس سبق میں مصنف نے انگریزوں کی ذہنیت کو اجاگر کیا ہے ۔اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ غلام ہندوستان میں جب ہمارے چند پڑے لکھے نو جوان انگریزی حکومت میں ملازمت کرتے تھے تو وہ یعنی انگریز ، ہمارے ہندوستانیوں کو کس طرح گری ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے اور کس طرح کو برتاو ہندوستانیوں سے کیا جاتا تھا۔ ہندوستانی چاہے وہ بڑے عہدے کا افسر ہی کیوں نہ ہو انگریزوں کے سامنے اس کی کوئی خاص قدر نہیں تھی ۔ بلکہ اسے معمولی انسان سمجھا جاتا تھا۔اس سبق کا ہیرو جب سول سروس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد خوش ہوکر اپنے بڑے افسر سے پہلی مرتبہ ملاقات کے لیے جاتا ہے تو اسی ملاقات میں اسے بڑی زلت ورسوائی اٹھانی پڑتی ہے۔

5.5 اصطلاحات،الفاظ ومعنی

احکام	حکم کی جمع
تصدیق	صداقت،سچائی
تردید	رد کرنا،انکار کرنا
حیات وممات	زندگی وموت

5.6 مزید مطالعہ کے لیے کتب

۱) نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی ۔۔۔مرزا فرحت

۲) ناول ابن الوقت ۔۔۔۔۔نذیر احمد دہلوی

۳) تاریخ اردو ادب ۔۔۔عظیم الحق جنیدی

۴) تاریخ ادب اردو ۔۔۔نور الحسن نقوی

☆☆☆

فہرست

6.0 مقاصد

6.1 تمہید

6.2 موضوع کی وضاحت

6.2.1 الطاف حسین حالؔی

6.2.2 غالب بہ حیثیت شاعر

6.3 مشقی سوالات

6.4 خلاصہ

6.5 اصطلاحات، الفاظ ومعنی

6.6 مزید مطالعہ کے لیے کتب

6.0 مقاصد

اس باب کے مطالعہ کے بعد آپ............

☆ غالبؔ اور حالؔی سے واقف ہو جائیں گے۔

☆ غالبؔ کی شخصیت اور شاعری سے واقف ہوں گے۔

☆ اردو میں غالب کی شاعری کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگاسکیں گے۔

6.1 تمہید

غالبؔ اردو کی نابغۂ روزگار شخصیت کا نام ہے۔ان کی شخصیت اور شاعری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کے ایک بڑے محقق نے غالبؔ کے تعلق سے یہ کہا تھا کہ مغلوں نے ہندوستان کو دو یادگاریں دیں ہیں۔ایک تاج محل اور دوسرے دیوان غالبؔ۔اس باب میں ہم غالبؔ کی شاعری کے امتیازات سے جان کاری حاصل کریں گے۔اس کے علاوہ حالؔی کی سوانح نگاری سے بھی واقف ہونگے۔

6.2 موضوع کی وضاحت:

6.2 غالبؔ کی شخصیت اور شاعری :

غالب کے بارے میں عبادت بریلوی لکھتے ہیں،''غالب زبان اور لہجے کے چابک دست فنکار ہیں۔اردو روزمرہ اور محاورے کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس کی سادگی دل میں اتر جاتی ہے۔''

عبدالرحمان بجنوری لکھتے ہیں کہ،''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں''وید مقدس''اور''دیوان غالب''۔''

اردو شاعری میں مرزا غالب کی حیثیت ایک درخشاں ستارے کی سی ہے۔انہوں نے اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونک دی۔اسے نئے نئے موضوعات بخشے اوراس میں ایک انقلابی لہر دوڑا دی۔ان کی شاعری میں فلسفیانہ خیالات جا بجا ملتے ہیں۔غالب ایک فلسفی ذہن کے مالک تھے۔انہوں نے زندگی کو اپنے طور پر سمجھنے کی بھرپور کوشش کی اوران کے تخیّل کی بلندی اور شوخی ؟ فکر کا راز اس میں ہے کہ وہ انسانی زندگی کے نشیب وفراز کو شِدّت سے محسوس کرتے ہیں۔

غالب انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔اس کے بنیادی معاملات و مسائل پرغور وفکر کرتے ہیں۔اس کی ان گنت گتھیوں کو سلجھا دیتے ہیں۔انسان کو اس کی عظمت کا

احساس دلاتے ہیں اس کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھاتے ہیں۔اور نظام کائنات میں اس کو نئے آسمانوں پر اڑاتے ہیں۔غالب کی شاعری اس اعتبار سے بہت بلند ہےاوراس میں شبہ نہیں کہ ان کی شاعری کے انہیں عناصر نے اُن کو عظمت سے ہمکنار کیا ہے۔لیکن جس طرح ان کی شاعری میں ان سب کا اظہار وابلاغ ہوا ہے۔وہ بھی اس کو عظیم بنانے میں برابر کے شریک ہیں۔

غالب کی شاعری کا اثر حواس پر شدت سے ہوتا ہے وہ ان میں غیر شعوری طور پر ایک ارتعاش کی سی کیفیت پیدا کرتی ہےاوراسی ارتعاش کی وجہ سے اس کے پڑھنے اور سننے والے کے ذہن پر اس قسم کی تصویریں ابھرتی ہیں۔ان کے موضوع میں جو وسعتیں اور گہرائیاں ہیں اس کا عکس ان کے اظہار وابلاغ میں بھی نظر آتا ہے۔ان گنت عناصر کے امتزاج سے اس کی تشکیل ہوتی ہے۔

6.2.1 الطاف حسین حاؔلی:

حاؔلی کا شمار اردو تنقید کے بنیادگزاروں میں ہوتا ہے۔اب تک کی تحقیق کے مطابق حاؔلی نے ہی سب سے پہلے اردو میں باقاعدہ تنقید نگاری کی ہے۔ان کی کتاب ’مقدمہ شعر و شاعری‘ اردو تنقید کی اولین کتاب ہے۔الطاف حسین حا ؟لی ، ہندوستان میں ’’اردو‘‘ کے نامور شاعر اور نقادگزرے ہیں۔حالی 1837ء ؁ میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام خواجہ ایز؟ وبخش تھا-ابھی 9 سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔بڑے بھائی امد؟ادحسین نے پرورش کی۔اسلامی دستور کے مطابق پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔بعدازاں عربی کی تعلیم شروع کی۔17 برس کی عمر میں ان کی مرضی کے خلاف شادی کردی گئی۔اب انہوں نے دلی کا قصد کیا اور 2 سال تک عربی صرف ونحو اور منطق وغیرہ پڑھتے رہے۔حال؟ی کے بچپن کا زمانہ ہندوستان میں تمدن اور معاشرت کے انتہائی زوال کا دور تھا۔سلطنتِ مغلیہ جو 300 سال سے اہلِ ہند خصوصاً مسلمانوں کی تمدنی زندگی کی مرکز بنی ہوئی تھی ، دم توڑ رہی تھی۔سیاسی انتشار

کی وجہ سے جماعت کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور انفرادیت کی ہوا چل رہی تھی۔

1856ء ؁ میں ہسار کے کلکٹر کے دفتر میں ملازم ہو گئے لیکن 1857ء ؁ میں پانی پت آ گئے۔3-4 سال بعد جہانگیر آباد کے رئیس مصطفٰی خان شیف ?تہ کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔نواب صاحب کی صحبت سے مولانا حال?ی کی شاعری چمک اٹھی۔تقریباً 8 سال مستفید ہوتے رہے۔ پھر دلی آ کر مرزا غا?لب کے شاگرد ہوئے۔ غا?لب کی وفات پر حال?ی لاہور چلے آئے اور گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت اختیار کی۔ لاہور میں محمد حسین آز?اد کے ساتھ مل کر انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی یوں شعر و شاعری کی خدمت کی اور جدید شاعری کی بنیاد ڈالی۔

4 سال لاہور میں رہنے کے بعد دلی چلے گئے اور اینگلو عربک کالج میں معلم ہو گئے۔ وہاں سرس ?ید احمد خان سے ملاقات ہوئی اور ان کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ اسی دوران 1879ء ؁ میں ''مسدس حال?ی'' سرسی?د کی فرمائش پر لکھی۔''مسدس'' کے بعد حال?ی نے اِسی طرز کی اور بہت سی نظمیں لکھیں جن کے سیدھے سادے الفاظ میں انہوں نے فلسفہ،تاریخ،معاشرت اور اخلاق کے ایسے پہلو بیان کیے جن کو نظر انداز کیا جا رہا تھا۔[6]

ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد پانی پت میں سکونت اختیار کی۔ 1904ء ؁ میں ''شمس اللعلماء ؁'' کا خطاب ملا 31 دسمبر 1914ء ؁ کو پانی پت میں وفات پائی۔

سرسید جس تحریک کے علمبردار تھے حالی اسی کے نقیب تھے۔سرس ?ید نے اردو نثر کو جو وقار اور اعلیٰ تنقید کے جوہر عطا کیے تھے۔حالی کے مرصع قلم نے انہیں چمکایا۔نہ صرف یہ کہ انہوں نے اردو ادب کو صحیح ادبی رنگ سے آشنا کیا بلکہ آنے والے ادیبوں کے لیے ادبی تنقید،سوانح نگاری، انشاپردازی اور وقتی مسائل پر بے تکان اظہار خیال کرنے کے بہترین نمونے یادگار چھوڑے۔

☆ الطاف حسین حالؔی

غالبؔ بہ حیثیت شاعر

میر وسودا اوران کے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاداس بات پر رکھی ہے کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اورقرنوں سے اولاً فارسی اوراس کے بعد اردوغزل میں بندھتے چلے آتے ہیں۔ وہی مضامین بہ تبدیل الفاظ اور بہ تغیر اسالیب بیان عامہ ءاہل زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ میں ادا کیے جائیں۔ چنانچہ میرؔ سے لے کر ذوقؔ تک جتنے مشہور غزل گو مرزا کے سوا اہل زبان میں گزرے ہیں، ان کی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں۔ ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضمون پہلے متعدد طور پر بندھ ہو چکا ہے وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جائے کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لے جائے۔ برخلاف اس کے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد و پر قائم کی ہے۔ ان کی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں۔ جن کو اردو شعرا کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کئے گئے ہیں جو سب سے نرالا ہیں اور ان میں ایسی نزاکتیں رکھی گئیں ہیں جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اور لوگوں نے اول سے آخر تک قوم کی شاہراہ سے سرموانحراف نہیں کیا اور جس چال سے کہ اگلوں نے راہ طے کی تھی اسی چال سے تمام راستہ طے کیا ہے۔ مرزا نے اول شاہراہ کا رخ چھوڑ کر دوسرے رخ چلنا اختیار کیا اور جب راہ کی مشکلات نے مجبور کیا تو اُن کو بھی آخر اسی رُخ پر چلنا پڑا۔ مگر جس لیک پر قافلہ جارہا تھا۔ اس کے سوا ایک اور لیک اس کے متوازی اپنے لئے نکالی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے' اس چال کو چھوڑ کر دوسری چال اختیار کی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میرؔ وسوداؔ اور انکے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے۔ اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں یا

ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر، ایک نئی اور نرالی کیفیت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔ یہاں اول ہم چند شعر مرزا کے دیوان سے ایسے نقل کرتے ہیں جن سے ان کے خیالات کا اچھوتا پن ثابت ہوتا ہے۔

بس کہ مشکل ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو میسر نہیں انساں ہونا

بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔ داعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشتوار ہے اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو عین انسان ہے اس کا کبھی انسان بنا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے بلکہ شاعرانہ استدلال ہے۔ جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا ہے۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نشاط کے معنی امنگ کے ہیں 'نشاط کار' یعنی کام کرنے کی امنگ یہ بھی جہاں تک کہ معلوم ہے ایک نیا خیال ہے اور نرالا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے۔ کیوں کہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ صرف اس یقیں کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ

جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے اسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے اسی قدر کام میں تاخیر اور سہل نگاری زیادہ کرتا ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بالکل نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے۔ پہلے مصرعے کے معنی ظاہر ہیں' دوسرے مصرع سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا

تو کیا برائی ہوتی مگر قائل کیا مقصود یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہئے کہ میں کیا چیز ہوتا، مطلب یہ کہ خدا ہوتا۔ کیوں کا پہلے

مصرعے میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوتا تھا

بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اس کو ادا کیا گیا ہے۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کی فہم کا قصور ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے اس کے موافق اس کی تائید غیب سے ہوتی ہے اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ ملی ہے۔ اگر اس کی ہمت جب کہ وہ در میں تھا موتی بننے پر قانع ہو جاتی تو اس کو جیسا کہ ظاہر ہے یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا علاوہ جدت مضامین اور طرفگیِ خیالات کے اور بھی چند خصوصیتیں مرزا صاحب کے کلام میں ایسی ہیں جو اور ریختہ گویوں کے کلام میں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں۔ اولاً عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً ریختہ گویوں کے کلام میں متداول ہیں، مرزا جہاں تک ہوتا سکتا ہے ان تشبیہوں کو استعمال نہیں کرتے بلکہ تقریباً ہمیشہ نئی نئی تشبیہیں ابداع کرتے ہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے بلکہ خیالات کی جدت ان کو جدید تشبیہیں پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ان کے ابتدائی ریختہ میں جو تشبیہیں دیکھی جاتی ہیں وہ اکثر غربت سے خالی نہیں ہیں۔ مثلاً سانس کو موج سے، بیخودی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوالہ سے، مغزِ سر کو پنبۂ بالش سے، دانۂ انگور کو عقدِ وصال سے، استخوان کو خشت اور بدن کو قالبِ خشت سے، اور اس قسم کی بہت سی عجیب و غریب تشبیہیں ان کے ابدائی ریختہ میں اپائی جاتی ہیں۔ لیکن جس قدر خیالات کی اصلاح ہوتی گئی اسی قدر تشبیہوں میں باوجود ندرت اور طرفگی کے سنجیدگی اور لطافت بڑھتی گئی مثلاً وہ کہتے ہیں۔ ے

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

یہاں سورج کو اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے اور تمام اجزائے عالم آمادۂ زوال وفنا ہیں۔ چراغ رہگذر باد سے تشبیہ دی ہے جو بالکل نئی تشبیہ ہے۔ دوسری جگہ سورج کو اس لحاظ سے حسنِ معشوق کے مقابلے میں ان کو ناقص الخلقت قرار دیا ہے۔ ماہ نخشب کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

ایک جگہ انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی اس کو غم سے نجات نہیں ہوتی شمع سے تشبیہ دی ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی وہ برابر جلتی رہتی ہے جیسا کہ کہتے ہیں۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اس قسم کی بدیع ونادر تشبیہات سے مرزا کے دونوں دیوان اردو اور فارسی بھرے ہوئے ہیں۔ قطع نظر تشبیہات کے، مرزا ہر ایک بات میں جیسا کہ پہلے حصے میں بیان ہو چکا ہے۔ ابتذال سے بہت بچے تھے۔ متبذل مضامین، متبذل تشبیہیں، متبذل محاورے، متبذل ترکیبیں، جس ودران کے کلام میں کم ملیں گی، ظاہرا کسی ریختہ گوشاعر کے کلام میں نہیں مل سکتے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مرزا نے استعارہ وکنایہ وتمثیل کو جو کہ لٹریچر کی جان اور شاعری کا ایمان ہے، اوجس کی طرف ریختہ گوشعراء نے بہت کم توجہ کی ہے۔ ریختہ میں بھی نسبتا اپنے فارسی کلام سے کم استعمال نہیں کیا۔ اور شعرا نے استعارے کو صرف محاورات اردو میں بلاشبہ استعمال کیا ہے، لیکن استعارے کے قصد سے نہیں۔ بلکہ محاورہ بندی کے شوق میں استعارے بلا قصد ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ یہاں چند مثالیں مرزا کے کلام سے نقل کی جاتی ہیں۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز

پھر ترا وقت سفر یاد آیا

دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اور اس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے۔ اس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہے اس کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا۔ ایسے بلیغ شعر اردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں۔ جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گزرتی ہے۔ ان دو مصرعوں میں اس کی تصویر کھینچ دی ہے۔ جس سے بہتر کسی اسلوب بیان میں مضمون ادا نہیں ہو سکتا۔

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجہ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تیسری خصوصیت کیا ریختہ اور کیا فارسی میں، کیا نظم میں اور کیا نثر میں، باوجود سنجیدگی و متانت کے شوخی و ظرافت ہے، جیسا کہ مرزا کے انتخابی اشعار سے ظاہر ہوگا۔ مرزا سے پہلے ریختہ گو شعراء میں دو شخص شوخی و ظرافت میں بہت مشہور گزرے ہیں۔ ایک سوداؔ، دوسرے انشاؔء۔ مگر دونوں کی تمام شوقی و خوش طبعی، ہجو گوئی یا فحش و ہزل سے کبھی زبان قلم کو آلودہ نہیں کیا۔ مرزا کی طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی گئی ہے۔ جس کو مرزا اور دیگر ریختہ گویوں کے کلام میں ما بہ الامتیاز کہا جا سکتا ہے ان کے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلو دار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے اور اس میں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ لوگ جو بظاہر معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں، لطف نہیں اٹھا سکتے۔ یہاں ایسے اشعار کی چند مثالیں لکھی جاتی ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے

یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی۔مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق

ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مرگیا ہوں میں مردافگن عشق کا ساقی یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے یعنی لوگوں کو شراب عشق کی طرف بلاتا ہے مطلب یہ ہے کہ میرے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا۔اس لئے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی ہے مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے ہیں اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع یہی ساقی کی صلا کے الفاظ ہیں اور اس مصرع کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے۔ایک دفع بلانے کے لہجے میں پڑھتا ہے' کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگن عشق''یعنی کوئی ہے جو مردافگن عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرع کو مایوسی کے لہجے میں مکرر پڑھتا ہے۔''کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق''،یعنی کوئی نہیں ہوتا۔اس میں لہجہ اور طرز ادا کو بہت دخل ہے کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے جب اس طرح مصرعے مذکور کی تکرار کروگے فوراً یہ معنی ذہن نشیں ہو جائیں گئے۔☆

☆☆☆

6.3 مشقی سوالات

۱) مصنف نے اپنے افسر سے اپنی پہلی ملاقات کی کس طرح عکاسی کی؟

۲) مصنف نے اپنے افسر کے گھر کے ملازمین کس طرح کردار نگاری کی ہے؟

۳) اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے؟

۴) ڈپٹی نذیر احمد کے حالاتِ زندگی پر اظہار خیال کیجئے۔؟

6.4 خلاصہ:

مولانا حالی کا شمار اردو کے پہلے سوانح نگار اور پہلے تنقید نگار کی حیثیت سے ہوتا ہے۔انہوں نے غالب کو بڑے قریب سے دیکھا اور ان کی تمام کمزوریوں اور خوبیوں سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔انہوں نے غالبؔ کو جس طرح جس انداز میں دیکھا اور پرکھا ہے اس کی اچھی مثال ان کا لکھا ہے سبق ہے۔غالب بحیثیت شاعر اس اقتباس میں حالؔی نے مرزا غالبؔ کی عادات واطوار اور ان کے شاعرانہ کمالات کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔شاعر کی حیثیت سے جب ہم غالب کا مطالعہ کرتے ہیں تو حالؔی اس سبق کو پڑھنے کے بعد ہم بھی حالؔی کے ہمنوا ہو جاتے ہیں۔حالی نے اس سبق میں غالب کی غزل گوئی کے وہ امتیازات کو روشن کیا ہے جو ہمارے عام ناقدین کی نظروں سے اوجھل رہے تھے۔

اس سبق کے مطالعے کے بعد قاری کے دل و دماغ میں غالب کا قد بڑا ہو جاتا ہے۔کیونکہ جس انداز سے حالی نے غالب کی غزل گوئی کو اجاگر کیا ہے۔وہ بڑی حد تک غالب فہمی میں معاون ہے۔حالؔی کے مطابق غالب نے اپنے زمانے کی عام روش سے ہٹ کر شاعری کی ہے انہوں نے شاعری میں کسی قدیم شاعر کی پیروی نہیں کی۔نہ کوئی غالب کا استاد شاعر تھا۔ان میں شاعرانہ صلاحیتیں خداداد تھی۔وہ فطری شاعر تھے اور انہوں نے شاعری میں جس روش کو اپنایا تھا وہ اس زمانے کے چلن سے بالکل مختلف تھی پھر بھی آہستہ آہستہ انہوں نے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنایا اور آگے چل کر غالب کی پیروری کرنے والوں کا ایک طویل قافلہ ہم دیکھ رہے ہیں۔آج بھی غالب کی موت کے دوسوں سال بعد بھی ہم غالب کو پڑھتے ہیں تو ان کے کلام کی قدر کم نہیں ہوئی۔

6.5 اصطلاحات، الفاظ ومعنی

احکام	حکم کی جمع
تصدیق	صداقت، سچائی
تردید	رد کرنا، انکار کرنا
حیات وممات	زندگی وموت
مصنف	لکھنے والا، تصنیف کرنے ولا

6.6 مزید مطالعہ کے لیے کتب

۱) نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی ۔۔۔مرزا فرحت

۲) ناول ابن الوقت ۔۔۔۔۔نذیر احمد دہلوی

۳) تاریخ اردو ادب ۔۔۔عظیم الحق جنیدی

۴) تاریخ ادب اردو ۔۔۔نورالحسن نقوی

☆☆☆